دولت کے پجاری

اقبال کاظمی

1

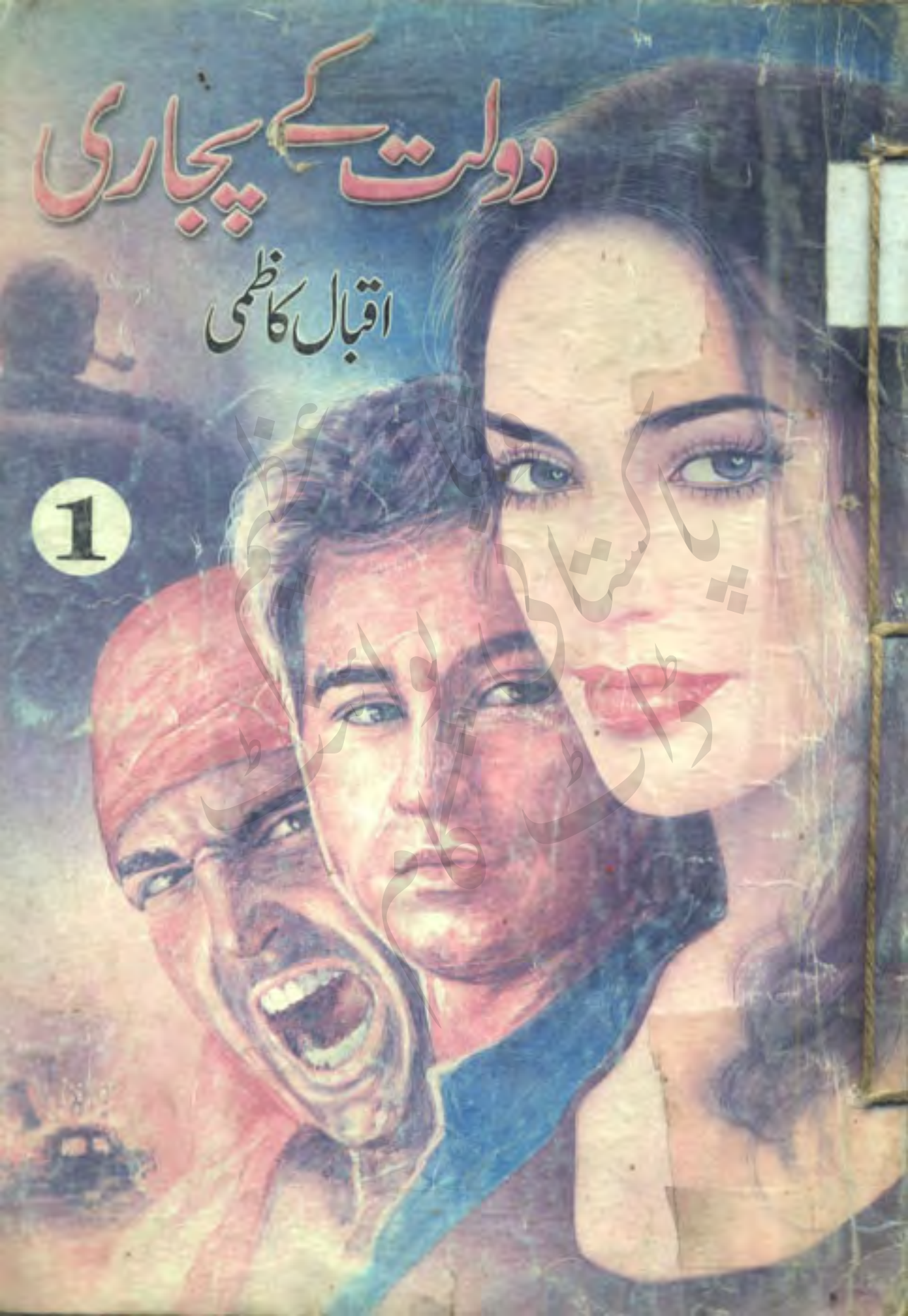

لاہور کے سرحدی قصبے بھینی سے تقریباً نصف میل دور اونچے ٹیلے پر واقع اس پرانی حویلی کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ حویلی کے چاروں طرف برگد' پیپل اور ناریل کے درختوں کی بہتات تھی اور یہ پرانی حویلی مکمل طور پر ان درختوں میں کیمو فلاج تھی۔ ٹیلے کے چاروں طرف دھان کی لہلہاتی ہوئی فصلیں تھیں۔ پوری فضا دھان کی مہک سے رچی ہوئی تھی۔ ایک کچا راستہ حویلی سے قصبے کی طرف چلا گیا تھا۔ کسی زمانے میں اس کچے راستے پر صرف بیل گاڑیاں یا حویلی کے مالک' اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار چوہدری برکت علی کا یکہ چلا کرتا تھا۔ یہ کشادہ کچا راستہ صرف حویلی تک آنے جانے والوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس سے آگے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اس لئے لوگ عام طور پر اس طرف آتے بھی نہیں تھے۔ حویلی کی عقبی سمت میں تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر وہ لکیر تھی جو پاکستان کو بھارت سے الگ کرتی تھی۔ سرحد کی نشاندہی کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان برجیوں کے ساتھ ساتھ سرحد کے دونوں طرف کچے راستے تھے۔ سرحد کے متوازی یہ راستے صرف اتنے چوڑے تھے کہ ان پر صرف جیپ ہی چل سکتی تھی۔ بھارت اور پاکستان کے رینجرز کے جوان ان جیپوں پر سرحد کے ساتھ ساتھ گشت کرتے رہتے تھے۔ سرحد کے دوسری طرف تقریباً ایک میل کے فاصلے پر سکھوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور شنید یہ تھی کہ سرحد پر رینجرز کے گشت کے باوجود دونوں طرف کے سرحدی دیہاتوں کے لوگ ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے تھے۔ 1947ء میں جب پاکستان معرض وجود میں آیا تھا تو سرحد کے اس طرف آباد سکھوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کے قافلوں کو خوب جی بھر کر لوٹا تھا۔ مسلمانوں پر اتنا ظلم شاید ہندوؤں نے بھی نہ کیا ہو جتنا ان سکھوں نے کیا تھا۔ یہ لوگ نہ صرف مسلمانوں کے قافلوں کو لوٹ لیتے تھے بلکہ قتل و غارت کی ایسی ایسی داستانیں رقم ہوئیں جنہیں آج بھی پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بوڑھوں' بچوں اور جوانوں کو اس طرح بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا کہ وہاں کے کھیت ان کے خون سے سیراب ہو جاتے۔ معصوم اور شیر خوار بچوں کو ماؤں کی چھاتیوں سے چھین کر انہیں ٹانگوں سے پکڑ کر اس طرح چیر دیا جاتا جیسے کوئی ناراض بچہ اپنی

گڑیا کو توڑ کر پھینک دیتا ہے۔ جوان اور حسین لڑکیوں کو ان کے ماں باپ اور بھائیوں کے سامنے ننگا کر کے انہیں بے آبرو کیا گیا۔ گینگ ریپ کے ایسے ایسے مناظر دیکھنے میں آئے کہ روح تک کانپ اٹھتی۔ معصوم جوانیوں کی چیخوں سے آسمان کانپ اٹھا تھا۔ زمین تھرا گئی تھی۔ مگر ان درندہ صفت سکھوں پر ان کی چیخ و پکار کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ معصوم اور بے گناہ جوان لڑکیوں کو بے آبرو کر کے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ ان کی لاشیں کھیتوں میں تڑپتی رہتیں اور ان کے زخموں سے بہنے والا خون کھیتوں کی زمین کو سیراب کرتا رہتا۔

ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے نہتے اور بے سروسامان مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے والے وہی سکھ آج مسلمانوں کی دوستی کا دم بھر رہے تھے۔ سرحد پر رینجرز کے گشت کے باوجود دونوں طرف سے اسمگلنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ بھارت کو اناج کی کمی کا مسئلہ تھا۔ پاکستان کے سرحدی علاقوں میں رہنے والے بے ضمیر لوگ دولت کے لالچ میں پاکستان سے بڑی مقدار میں اناج، گھی، تیل اور خورد و نوش کی اشیاء بھارت کو اسمگل کر رہے تھے۔

چوہدری برکت علی اس علاقے کا نامی گرامی زمیندار تھا۔ کئی مربع اراضی تھی جو ہندوستان کی سرحد پر پھیلی ہوئی تھی۔ صبح وہ سفید گھوڑی پر بیٹھ کر اپنی زمینوں کے معائنے کو نکلتا تو واپسی پر شام ہو جاتی۔ چوہدری برکت علی جتنا ظالم اور سنگ دل زمیندار تھا اتنا ہی وہ ایک نیک اور ہمدرد انسان بھی تھا۔ اس کے مزارعے اس کے سامنے آتے ہوئے تھر تھر کانپتے تھے تو اس سے خوش بھی تھے کیونکہ ضرورت کے وقت یہی ظالم و جابر زمیندار ان کے لئے رحمت کا فرشتہ بن جاتا تھا۔

چوہدری برکت علی کی ایک حویلی بھینی گاؤں میں بھی تھی۔ لیکن وہ زیادہ تر ٹبے والی اس حویلی ہی میں رہا کرتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا ان دنوں تعلیم کے سلسلے میں ولایت گیا ہوا تھا۔ ایک بیٹی تھی جو شہر سے میٹرک کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لے کر وہیں ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ گاؤں سے پکی سڑک تک کئی میل کا راستہ کچا تھا۔ جس پر صرف بیل گاڑیاں اور ٹریکٹر ٹرالیاں ہی چلتی تھیں۔ اس زمانے میں بہت کم زمینداروں کے پاس موٹریں تھیں۔ البتہ یکے سب کے پاس تھے جو خوب سجے سجائے ہوتے تھے۔ گاؤں سے شادی پور تک کچے راستے پر سفر کرنے کے دوران اتنی مٹی اڑتی کہ منزل پر پہنچ کر سفر کرنے والا اپنے آپ کو پہچاننے سے انکار کر دیتا۔

علاقے میں چوہدری برکت علی کے کچھ دوست تھے تو دشمنوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ بھینی کے ہی ایک زمیندار سے زمین کے ایک ٹکڑے پر اس کی مقدمے بازی چل رہی تھی۔ وہ دونوں زمین کی قیمت سے کئی گنا زیادہ مقدمے پر خرچ کر چکے تھے لیکن کوئی بھی اس سے دست

دوسرے زمیندار سراج کی حویلی بھی بھینی گاؤں ہی میں تھی۔ چوہدری برکت علی گاؤں کی حویلی چھوڑ کر ٹبے والی حویلی میں صرف اس لئے رہ رہا تھا کہ چوہدری سراج سے آمنا سامنا نہ ہو۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال تھا کہ چوہدری برکت علی اناج کی اسمگلنگ میں ملوث تھا اور اس لئے ٹبے والی حویلی میں رہ رہا تھا کیونکہ وہاں سے سرحد بالکل سامنے تھی اور ادھر کا مال آسانی سے ادھر پہنچایا جا سکتا تھا۔

یہ آج سے پندرہ سال پہلے کی بات تھی چوہدری برکت علی کی بیٹی بھی سردیوں کی دس دن کی چھٹیوں میں گاؤں آئی ہوئی تھی۔ فیصل آباد سے چوہدری برکت علی کا ایک دوست رشید بھی اپنی فیملی کے ساتھ حویلی کا مہمان بنا ہوا تھا۔ رشید کا فیصل آباد میں صابن کا کارخانہ تھا۔ اس کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی جس کی عمر بائیس تئیس سال رہی ہو گی۔ اس سے چھوٹا لڑکا تھا اور پھر دو لڑکیاں تھیں۔ رشید اپنی بیٹی کے رشتے کے لئے چوہدری برکت علی کے بیٹے کے چکر میں تھا، جو اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔

وہ دسمبر کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کسی بھی وقت بارش شروع ہو سکتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سردی پہلے ہی بڑھ گئی تھی اور بارش کے بعد تو سردی کے مزید بڑھ جانے کا امکان تھا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد چوہدری برکت علی اس کی بیوی اور رشید اور اس کی بیوی ایک کمرے میں بیٹھے اپنے بچوں کے رشتے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ رشید کا بیٹا اپنے کمرے میں سو چکا تھا۔ البتہ چوہدری کی بیٹی اور رشید کی بیٹیاں ایک ہی کمرے میں بانوں میں دبکی باتیں کر رہی تھیں۔

جب پرانے دوست مدت بعد ملتے ہیں تو عام طور پر راتیں گپ شپ میں جاگ کر گزرتی ہیں۔ یہی صورت حال کچھ اس حویلی میں تھی۔ بات سے بات نکل رہی تھی۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ پرانی یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔ وقت گزرنے کا کسی کو احساس نہیں رہا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ حویلی کے باہر بھی نوکروں کے لئے دو تین کچے مکان تھے، بعض نوکر حویلی کے اندر بھی رہتے تھے جو سو چکے تھے۔

غالباً دو بجے کا وقت تھا دفعتاً" حویلی کے باہر شور کی آواز سنائی دی۔ عورتوں اور بچوں کی چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ ان میں مردوں کی چیخیں بھی شامل تھیں۔ لگتا تھا جیسے کسی دشمن نے حملہ کر دیا ہو۔

65ء کی جنگ میں بھی آدھی رات کو کچھ ایسا ہی شور اٹھا تھا۔ جب بھارت کی فوجوں نے

اچانک ہی رات کی تاریکی میں پاکستان کی سرحد پر حملہ کر دیا تھا' لیکن یہ شور کچھ عجیب سا تھا۔ دونوں ملکوں کے تعلقات بڑی حد تک معمول پر آ چکے تھے اور کسی جنگ کا کوئی امکان نہیں تھا۔

"یہ شور کیسا ہے؟" رشید نے سوالیہ نگاہوں سے چوہدری برکت علی کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا خوف تھا۔

"دیکھتا ہوں کیا بات ہے۔ مویشی چوروں کے گروہ رات کو وارداتیں کرتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے مزارعوں نے کسی کو مویشی چوری کرتے دیکھ کر شور مچا دیا ہو۔"

چوہدری برکت علی کمرے سے باہر آ کر نوکر کو آوازیں دینے لگا۔ "نورے....اوئے نورے....کہاں ہو تم.....باہر شور کیسا ہے؟"

"چوہدری جی....ڈ....ڈاکوؤں نے حویلی پر حملہ کر دیا ہے۔" نورا حویلی کے ایک کونے سے دوڑتا ہوا آ گیا۔

اس سے پہلے کہ چوہدری برکت علی کچھ کہتا' دو تین آدمی حویلی کی دیوار پھاند کر اندر آ گئے۔ ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ دیواروں سے کودتے ہی انہوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ پہلی گولی نورے کو لگی جو چیختا ہوا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ چوہدری برکت علی نے بھاگ کر کمرے میں گھسنے کی کوشش کی مگر دو گولیوں نے اسے بھی دروازے کے باہر ہی ڈھیر کر دیا۔

رشید اس کی بیوی اور چوہدری کی بیوی شور مچانے لگے۔ دوسرے کمرے سے لڑکیوں کے چیخنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور پھر فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونجنے لگی۔ حملہ آور کمروں میں گھس گھس کر انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک گولیاں برساتے رہے۔ شیطان رقص کرتا رہا اور انسان خاک و خون میں لوٹتے رہے۔

حملہ آوروں میں سے دو تین آدمیوں نے حویلی میں مختلف جگہوں پر آگ لگا دی۔ آگ فوراً ہی پھیلنے لگی۔ حملہ آور کچھ دیر تک شیطانی انداز میں قہقہے لگاتے رہے پھر پھاٹک کھول کر باہر نکل گئے۔ ایک نقاب پوش نے لکڑی کے گیٹ کے پاس بھی جلتی ہوئی مشعل پھینک دی۔ ان تھیں۔ بعض لاشیں آگ میں جل کر راکھ ہو چکی تھیں اور بعض ادھ جلی تھیں۔ گوشت جلنے کی نقاب پوشوں کی تعداد آٹھ تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے ٹیلے کے دوسری طرف چلے گئے۔ جہاں ان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ حویلی کے دروازے اور کھڑکیاں مکمل طور پر جل چکی تھیں۔ اگر گھوڑے کھڑے تھے۔ ایک آدمی گھوڑوں کے پاس ہی موجود تھا۔ وہ سب لوگ گھوڑوں پر بیٹھ کر فرار ہو گئے۔

نصف میل دور بھینی کے لوگ فائرنگ اور شور کی آوازیں سن کر گھروں سے باہر آ گئے حویلی سے آگ کے شعلے اٹھتے دیکھ کر انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ چوہدری برکت علی کی حویلی پر حملہ ہوا ہے۔ حملہ آور چوہدری کی کوئی دشمن پارٹی بھی ہو سکتی تھی اور ڈاکوؤں کا کوئی گروہ بھی۔ کچھ لوگ بندوقیں' لاٹھیاں اور کلہاڑیاں اٹھا کر حویلی کی طرف دوڑ پڑے۔

حویلی تک پہنچنے میں چند منٹ لگ گئے۔ حویلی کے باہر والے مکانوں میں رہنے والے مزارعے ادھر ادھر بھاگتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ گاؤں سے آنے والے لوگ بھی حویلی سے دور ہی رک گئے۔ حویلی میں لگی ہوئی آگ نے انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ آگ بجھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بالٹیوں سے پانی ڈال کر یہ آگ نہیں بجھائی جا سکتی تھی۔ لیکن پھر اچانک بارش شروع ہو گئی۔

پہلے موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہوئیں اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ گاؤں سے آئے ہوئے لوگ برگد اور پیپل کے درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر بے بس نظروں سے جلتی ہوئی حویلی کو دیکھ رہے تھے۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ لیکن دس پندرہ منٹ بعد شعلوں کی بلندی کم ہونے لگی۔ تیز اور موسلا دھار بارش حویلی کی آگ بجھانے میں مددگار ثابت ہو رہی تھی۔

تقریباً دو گھنٹوں کی مسلسل بارش سے حویلی کی آگ بجھ گئی۔ البتہ کہیں کہیں سے دھواں اب بھی اٹھ رہا تھا۔ گاؤں سے آئے ہوئے لوگ اب بھی حویلی سے دور درختوں کے نیچے کھڑے تھے۔ حویلی کی طرف سے ڈھلان پر پانی سیلاب کی طرح بہہ رہا تھا۔

بارش تقریباً آدھا گھنٹہ اور اسی شد و مد کے ساتھ جاری رہی اور پھر اس کا زور ٹوٹنے لگا۔

گاؤں والوں نے یہ دیکھا تھا کہ بارش کے دوران یا اس سے پہلے کوئی ذی روح حویلی سے باہر نہیں آیا تھا اور اب جب کہ بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا چند آدمی درختوں کے نیچے سے نکل کر ٹارچوں کی روشنی میں حویلی کی طرف بڑھنے لگے۔

ٹارچوں کی روشنی میں انہوں نے جلی ہوئی حویلی میں جو کچھ دیکھا وہ انہیں حواس باختہ کر دینے کے لئے کافی تھا۔ حویلی کے صحن میں اور مختلف کمروں میں بارہ انسانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ لاشیں ادھ جلی تھیں۔ گوشت جلنے کی

وہ لوگ دوڑتے اور چیختے ہوئے حویلی سے باہر آ گئے اور چیخ چیخ کر درختوں کے نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کو بتانے لگے کہ انہوں نے حویلی میں کیا دیکھا تھا۔

حویلی کے باہر والے مکانوں میں رہنے والے چند مزارعے بھی درختوں کے نیچے جمع تھے اور

وہ رو رو کر بتا رہے تھے کہ آٹھ دس نقاب پوشوں نے اچانک ہی حویلی پر حملہ کر دیا تھا اور پھر وہ گھوڑوں پر بیٹھ کر فرار ہو گئے تھے۔

کچھ لوگ گاؤں کی طرف واپس دوڑ گئے۔ تھانہ تو بہت دور تھا۔ البتہ گاؤں میں ایک چھوٹی سی پولیس چوکی موجود تھی جس کا عملہ ایک اے ایس آئی' ایک ہیڈ کانسٹیبل اور نصف درجن کانسٹیبلوں پر مشتمل تھا۔ لیکن جب وہ لوگ پولیس چوکی پہنچے تو پتہ چلا کہ اے ایس آئی گھر پر خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل بھی چوکی سے ملحق کمرے میں سو رہا تھا اور ڈیوٹی پر موجود دو کانسٹیبل کرسیوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

"سنتری بادشاہ!" ایک آدمی نے ایک کانسٹیبل کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "ادھر چوہدری برکت علی کی حویلی میں قیامت آ گئی ہے اور تم لوگ آرام سے سو رہے ہو؟"

"اوئے' کیا ہوا ہے اوئے؟ کون آ گئی ہے؟ کہاں آ گئی ہے؟" کانسٹیبل گڑبڑا کر اٹھ گیا اور بدحواس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"قیامت صغریٰ آ گئی ہے چوہدری برکت علی کی حویلی میں۔" اس شخص نے کہا۔

"صغریٰ کو تو اس گاؤں سے نکال دیا گیا تھا وہ دوبارہ یہاں کیسے آ گئی؟" کانسٹیبل اٹھ کر اپنی بیلٹ درست کرنے لگا۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھی کو بھی جگا دیا تھا۔ "اوئے شیدے' اٹھ اوئے' صغریٰ دوبارہ یہاں آ گئی ہے۔ اس کی وجہ سے یہاں کئی لڑائیاں ہو چکی ہیں۔ اس لئے اسے گاؤں سے نکالا گیا تھا۔ وہ پھر آ گئی ہے۔"

"میں اس صغریٰ کی بات نہیں کر رہا سنتری بادشاہ۔" اس شخص نے کہا۔ "قیامت صغریٰ کی بات کر رہا ہوں۔ چوہدری برکت علی کی حویلی میں دس بارہ آدمیوں کو قتل کر کے آگ لگا دی گئی ہے۔"

"اوئے منہ اچھا نہ ہو تو بات اچھی کر لیا کرو۔" سنتری بولا۔ "چوہری برکت کی حویلی میں گھس کر قتل کون کر سکتا ہے؟"

"آپ چل کر تو دیکھو جی۔ تھانیدار کو جگاؤ' وہاں تو قیامت مچی ہوئی ہے۔" دوسرے شخص نے کہا۔

کانسٹیبل نے دروازے کے قریب آ کر باہر دیکھا۔ ہلکی بوندا باندی اب بھی ہو رہی تھی۔

"اوئے' باہر تو مینہ برس رہا ہے۔" وہ بولا۔

"آپ تھانیدار کو جگائیں جی۔" وہ شخص بولا۔

آدھے گھنٹے کی بحث و تکرار کے بعد تھانیدار کو گھر سے جگا کر لایا گیا۔ اس کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہی تھی۔ اس کی ساری زندگی پولیس میں گزری تھی۔ لیکن وہ اے ایس آئی کے عہدے سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے ان لوگوں کے ساتھ حویلی کی طرف جانے پر آمادہ ہو سکا تھا۔ چار کانسٹیبل اور ایک اے ایس آئی جب چوہدری برکت علی کی جلی ہوئی حویلی میں داخل ہوئے تو ٹارچوں کی روشنی میں صورت حال کا جائزہ لیتے ہی ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"تھانے سے انسپکٹر کو بلانا پڑے گا اور انسپکٹر صاحب کو صبح سے پہلے نہیں بلایا جا سکتا۔ اس دوران کوئی حویلی میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔" اے ایس آئی نے دو کانسٹیبلوں کو وہیں چھوڑ دیا اور حویلی کے باہر والے مکانوں میں رہنے والے تین چار مزارعوں کو پکڑ کر لے آیا۔

انسپکٹر صبح دس بجے سے پہلے نہیں آیا تھا۔ اس دوران بھینی اور آس پاس کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کے لوگ بھی وہاں جمع ہو چکے تھے۔

جلی اور نیم جلی لاشیں اٹھوا دی گئیں۔ چوہدری برکت علی کا کوئی رشتہ دار گاؤں میں نہیں تھا۔ لاہور شہر میں اس کے دوسرے رشتہ داروں کو اطلاع دی گئی۔ اور پھر اس کے بیٹے کو بھی لندن میں اطلاع بھجوا دی گئی۔

چوہدری برکت علی کے رشتے دار یوں تو بہت سے تھے مگر سب سے قریبی عزیز ایک چچا زاد بھائی تھا جس کا ٹرانسپورٹ کا بزنس تھا۔ لاہور سے فیصل آباد اس کی بسیں چلتی تھیں۔ وہ تو اطلاع ملتے ہی روتا پیٹتا گاؤں پہنچ گیا۔ دوسرے رشتے دار بھی آ گئے۔ مگر لندن میں زیر تعلیم بیٹا کئی روز بعد ہی پہنچ سکا تھا۔

چوہدری برکت علی کا بیٹا سجاد' ماں باپ اور بہن کے چہلم تک گاؤں میں رہا پھر تمام زمینیں اپنے باپ کے کزن چوہدری حمید کے حوالے کر کے دوبارہ حصول تعلیم کے لئے لندن واپس چلا گیا۔ تین سال بعد وہ لاہور واپس آ گیا۔ ٹبے والی حویلی جوں کی توں ادھ جلی پڑی تھی۔ لیکن اس نے حویلی کی مرمت نہیں کروائی۔ گاؤں والی حویلی میں بھی رہنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ سمن آباد میں ایک کوٹھی خرید لی اور وہیں رہنے لگا۔ زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے مینجر رکھ لیا اور گاؤں والی حویلی اسے رہائش کے لئے دے دی۔ خود کبھی کبھار گاؤں جا کر زمینوں کا چکر لگا آتا۔

ٹبے والی ادھ جلی حویلی پندرہ سال سے ویران پڑی تھی اور اس عرصہ میں خاصی بدنام ہو چکی تھی۔ چوہدری برکت علی' اس کے گھر والوں اور مہمانوں کے قاتل نہیں پکڑے گئے تھے۔ پولیس نے پہلے چوہدری سراج کو شبہ کی بناء پر حراست میں لیا تھا لیکن چند ہی روز بعد اسے چھوڑ دینا پڑا تھا کیونکہ جس رات حویلی میں بارہ افراد کے قتل کی یہ واردات ہوئی تھی اس رات چوہدری سراج سیالکوٹ میں تھا۔

لوگوں نے اس ادھ جلی حویلی کی طرف آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ رات کے وقت حویلی میں روشنیاں سی چمکتی نظر آتیں۔ کبھی کبھی چیخوں اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ اس حویلی میں چوہدری برکت علی' اس کے اہل خانہ اور مہمانوں کی روحیں بھٹکتی رہتی ہیں۔ اور بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اسمگلروں نے اس ادھ جلی حویلی پر قبضہ کر رکھا ہے اور جس رات وہ لوگ مال لے کر حویلی میں آتے ہیں اس رات حویلی میں روشنیاں سی چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

لیکن بعض سنجیدہ قسم کے لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ حویلی میں کوئی آسیب وغیرہ نہیں ہے بلکہ سارا چکر اسمگلروں کا چلایا ہوا ہے تاکہ لوگ اس طرف کا رخ نہ کریں۔ ان دنوں ایک نیا تھانیدار آیا ہوا تھا۔ وہ اکثر گاؤں کی چوکی کے چکر لگاتا رہا تھا۔ اور یہ اتفاق کی بات تھی کہ جس روز وہ گاؤں کا گشت کر کے جاتا تھا اس سے اگلے ہی روز حویلی میں پراسرار قسم کی سرگرمیاں دکھائی دیتیں۔

اس تھانیدار کے بارے میں بھی علاقے میں بہت قصے مشہور ہو چکے تھے۔ بعض لوگوں کو یقین تھا کہ وہ اسمگلروں سے ملا ہوا ہے۔ جس روز وہ گاؤں کا گشت کر کے جاتا تھا اس سے اگلے ہی روز رات کو حویلی میں پراسرار سرگرمیاں دکھائی دیتی تھیں۔ تھانیدار کی آمد و رفت گویا اسمگلروں کے لئے اشارہ ہوتا تھا کہ لائن کلیئر ہے۔

وہ بھی سردیوں ہی کی ایک رات تھی۔ غالباً دو بجے کا وقت ہو رہا ہو گا۔ ادھ جلی حویلی میں پراسرار سرگرمیاں دکھائی دی تھیں اور پھر بڑی خاموشی سے پولیس کی بھاری نفری نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ پولیس والوں کی تعداد چالیس پچاس سے کم کسی طرح بھی نہیں تھی۔ پولیس کی اس پارٹی کی قیادت ایک ڈی ایس پی کر رہا تھا۔ جب کہ دو انسپکٹر بھی تھے۔ پولیس والے درختوں کی آڑ لئے رائفلیں سنبھالے ہوشیار کھڑے تھے۔

ڈی ایس پی نے مختلف سمتوں میں کھڑے ہوئے دونوں انسپکٹروں کو مخصوص سگنل دیا۔ چاروں طرف سے پولیس کے جوان آگے بڑھنے لگے۔ وہ لوگ رائفلیں تانے بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور بالآخر وہ حویلی سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے۔

ڈی ایس پی برگد کے ایک درخت کی آڑ میں کھڑا تھا۔ درخت کا تنا اتنا موٹا تھا کہ اس کے پیچھے چار چھ آدمی آسانی سے چھپ سکتے تھے۔ لمبی لمبی جٹائیں شاخوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ڈی ایس پی کے ہاتھ میں میگافون تھا۔ وہ کچھ دیر تک حویلی کی طرف دیکھتا رہا پھر میگافون کا بٹن دبا کر اسے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

"یہ حویلی چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں ہے۔ اندر جو بھی لوگ موجود ہیں وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائیں۔ یہ پہلی اور آخری وارننگ ہے۔ میں پانچ تک گنوں گا۔ اگر تم لوگ باہر نہ نکلے تو حویلی پر دھاوا بول دیا جائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی گنتی شروع ہو گئی۔ پانچ کہنے کے بعد بھی خاموشی رہی۔ ڈی ایس پی نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر اپنے ماتحتوں کو سگنل دے دیا۔ پولیس والے اپنی اپنی کمین گاہوں سے نکل کر حویلی کی طرف دوڑ پڑے لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ پولیس والوں نے طاقتور ٹارچوں کی روشنی میں ادھ جلی حویلی کا کونا کونا چھان مارا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

"حیرت ہے۔" ڈی ایس پی نے اپنے قریب کھڑے ہوئے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اطلاع دینے والے نے حلفیہ طور پر کہا تھا کہ اسمگلر اس حویلی میں موجود ہیں لیکن یہاں تو کسی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔"

"ہو سکتا ہے یہ اطلاع ہمیں گمراہ کرنے کے لئے دی گئی ہو۔" انسپکٹر نے کہا۔

"کیا مطلب؟" ڈی ایس پی نے اسے گھورا۔

"مطلب یہ کہ ہمیں اس طرف الجھا دیا گیا اور اسمگلروں کی پارٹی کسی اور طرف سے نکل گئی ہو۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"یہ بات حلق سے نہیں اترتی۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "اسمگلنگ کی روک تھام ہمارا شعبہ ہے۔ اس کے لئے کسٹمز اور رینجرز موجود ہیں۔ اگر اسمگلروں کے کسی گروہ کو سرحد پار کرنا ہو تو رینجرز کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی۔ ہمارا کام تو علاقے میں امن و امان قائم رکھنا ہے۔ اطلاع دینے والے نے مجھے خاص طور پر اطلاع اس لئے دی تھی کہ یہ ہمارا علاقہ ہے لیکن....."

"لیکن اطلاع غلط ثابت ہوئی۔" انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یا ہو سکتا ہے وہ لوگ ہمارے آنے سے پہلے ہی یہاں سے نکل چکے ہوں۔"

"ہو سکتا ہے۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "بہرحال' جوانوں کو واپسی کا حکم دو۔"

پولیس کے جوان حکم ملتے ہی ٹیبے سے اتر کر کھیتوں کے درمیان اسی پگڈنڈی پر چلنے لگے جو سامنے دکھائی دیتی تھی۔ وہاں سے تقریباً نصف میل دور سڑک تک چلی گئی تھی۔ سڑک پر پولیس کے دو ٹرک اور دو جیپیں کھڑی تھیں۔ گاؤں وہاں سے دائیں طرف خاصے فاصلے پر تھا۔

دونوں جیپیں اور دونوں ٹرک مڑ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹرکوں میں بھرے ہوئے پولیس والے اس ناکام چھاپے پر تبصرے کر رہے تھے۔

"ہمارے ڈپٹی صاحب کو نمبر بنانے کا بڑا شوق ہے۔" ایک کانسٹیبل کہہ رہا تھا۔ "ہر اطلاع

ملتے ہی بھاگ اٹھتے ہیں۔"

"بلاوجہ رات ضائع کر دی۔" دوسرا کانسٹیبل بولا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ ان اسمگلروں کو بھی چھاپے کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ لوگ ہمارے آنے سے پہلے ہی بھاگ نکلے۔ ہو سکتا ہے وہ مال لے کر سرحد پار کر گئے ہوں۔" تیسرا پولیس والا اپنے قریب بیٹھے ہوئے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرا تو خیال ہے کہ علاقے کے تھانے ہی سے انہیں اطلاع ملی ہو گی۔"

"لعنت بھیجو ان سب پر۔ مجھے تو بڑے زور کی نیند آ رہی ہے۔" اس کانسٹیبل نے جواب دیا۔

پولیس کی جیپیں اور ٹرک تیز رفتاری سے شادی پور کی طرف جا رہے تھے۔ ادھر ادھ جلی ویران حویلی کی صورت حال بدل گئی تھی۔ پولیس کی موجودگی میں وہاں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نظر نہیں آیا تھا لیکن اب وہاں زندگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

حویلی کا ایک کمرہ، جس کی تقریباً آدھی چھت گر چکی تھی، کسی کی موجودگی کا پتہ دے رہا تھا۔ اس کمرے کے ایک کونے میں فرش کا ایک حصہ اس طرح چاک ہونے لگا جیسے اسے نیچے سے کسی تیز دھار چھری سے کاٹا جا رہا ہو۔ وہ تقریباً چار مربع فٹ کا ٹکڑا تھا جس میں ایک تاریک خلا پیدا ہو گئی۔ اسی خلا سے پہلے ایک انسانی سر برآمد ہوا۔ اور پھر ایک آدمی باہر نکل آیا۔ اس شخص نے محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر دبے قدموں چلتا ہوا جلے ہوئے دروازے سے نکل کر باہر آ گیا۔ وہ کچھ دیر تک ایک جگہ رک کر کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا حویلی سے باہر آ گیا اور پیپل کے ایک درخت کے پیچھے چھپ کر نصف میل دور گاؤں اور سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ قرب و جوار میں کوئی موجود نہیں ہے، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس اسی کمرے میں آ گیا اور اسی خلا میں سیڑھیاں اترتا ہوا تہہ خانے میں آ گیا۔

اس تہہ خانے کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اس کا راز صرف چوہدری برکت علی معلوم تھا یا اس کے ایک بہت قریبی دوست ماجھا گجر کو..... جو اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔

تہہ خانہ خاصا وسیع و عریض تھا۔ اس وقت تہہ خانے میں پانچ آدمی موجود تھے۔ ان میں ایک پینٹ شرٹ میں تھا اور اوپر سے سرمئی رنگ کا سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ ایک صحت مند آدمی تھا۔ باریک مونچھوں نے اس کے چہرے کو خاصا وجیہ بنا دیا تھا۔ وہ شارق تھا۔

باقی چاروں آدمی چہروں ہی سے دیہاتی، اجڈ اور چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔ ان میں

تین نے شلوار قمیض پہن رکھی تھیں جبکہ چوتھا آدمی دھوتی باندھے ہوئے تھا اور کھدر کا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ ان چاروں کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں جن سے ان کے چہرے کچھ اور بھی خوفناک ہو گئے تھے۔

"چلے گئے وہ لوگ۔" باہر سے آنے والے نے کہا۔

"لیکن انہیں اطلاع کیسے ملی؟" دوسرے نے پوچھا اور مشکوک نگاہوں سے باری باری سب کی طرف دیکھنے لگا۔

"اس کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔" دھوتی والے نے شارق کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا نام مقصود تھا۔

"کیوں اوئے باؤ۔" پہلے شخص نے شارق کو گھورا۔ "ہمیں یہ دھندہ کرتے ہوئے پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ کسی نے اس طرح کی غداری نہیں کی۔ اور جس پر ہمیں شبہ ہوتا ہے اسے ہم اس دنیا میں نہیں رہنے دیتے۔ سچ سچ بتا دو۔ اگر تم بے گناہ ثابت ہوئے تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"ماجھے گجر۔" شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھے مخبری کرنی ہوتی تو میں خود یہاں نہ آتا۔"

"ہم نے دنیا دیکھی ہے۔" ماجھے گجر نے اسے گھورا۔ "مجھے پندرہ سال ہو گئے ہیں یہ کاروبار کرتے ہوئے۔ کسی کو آج تک بھنک نہیں مل سکی کہ میں یہاں کیوں آتا ہوں اور کیا کاروبار کرتا ہوں۔ چوہدری برکت اس کاروبار میں میرا پارٹنر تھا لیکن وہ بھی آخر میں کچھ ڈنڈی مارنے لگا تھا۔ میں ان پڑھ اور جاہل ضرور ہوں لیکن کاروبار میں بددیانتی کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ پچھتر لاکھ روپے کی ڈنڈی مار رہا تھا۔ میں نے اس کا پتہ ہی صاف کر دیا۔ پولیس آج تک یہ پتہ نہیں چلا سکی کہ چوہدری برکت، اس کے گھر والوں اور مہمانوں کو موت کی نیند کس نے سلایا تھا اور حویلی کو آگ کس نے لگائی تھی۔ وہ تو ہماری شراکت شروع کا زمانہ تھا اور چوہدری برکت نے بے ایمانی شروع کر دی تھی۔ اس تہہ خانے کی تیاری میں نے بھی بڑا پیسہ لگایا تھا۔ آگ لگنے سے اس کے میکنزم کو بڑا نقصان پہنچا تھا۔ بعد میں میں نے چوری چھپے اسے ٹھیک کروایا اور چوہدری برکت کے بیٹے کو یہ پٹی پڑھائی کہ اب اسے اس منحوس حویلی میں نہیں رہنا چاہئے۔ اب یہ حویلی مکمل طور پر میرے استعمال میں ہے۔ آس پاس کی بستیوں کے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ حویلی آسیب زدہ ہے اس لئے کوئی اس طرف آنے کی جرات نہیں کرتا اور ہمارا کاروبار بڑے اطمینان سے چل رہا تھا۔ لیکن آج پہلی بار پولیس کو اس حویلی پر

شبہ ہوا ہی اور یہ شبہ بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔ یقیناً اس کی مخبری کی گئی ہے اور میرے ساتھیوں کا بھی یہی خیال ہے کہ مخبری کرنے والا تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا ہے۔"

"دیکھو ماجھے گجر۔" شارق نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس بزنس میں میرا بھی کروڑوں روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ میں پولیس کو مخبری کر کے اپنے پیروں پر کلہاڑی نہیں مار سکتا۔"

"مال کہاں ہے؟" ماجھے نے اسے گھورا۔ "تم تو مال لے کر یہاں آنے والے تھے۔ لیکن تم خالی ہاتھ آئے اور تمہارے پیچھے ہی پیچھے پولیس بھی پہنچ گئی۔"

"تم جانتے ہو کہ میں نے احتیاط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔" شارق نے کہا۔ "تم نے مجھے مال لے کر یہاں پہنچنے کے لئے کہا تھا۔ یہ کوئی دھوکا بھی ہو سکتا تھا اس لئے مال میں یہاں سے دو فرلانگ دور پرانے کنویں کے پاس چھپا دیا تھا اور خالی ہاتھ یہاں اس لئے آیا تھا پہلے یہ اطمینان کر لوں کہ میرے ساتھ دھوکا تو نہیں ہو رہا۔"

"میں نے تمہیں یہاں بلا کر غلطی کی تھی شارق باؤ۔" ماجھے گجر نے کہا۔ "اور اسی غلطی کی وجہ سے یہ حویلی پولیس کی نظروں میں آ گئی لیکن تم اب یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکو گے تمہاری لاش اسی تہہ خانے میں گڑھا کھود کر دبا دی جائے گی اور کسی کو قیامت تک پتہ نہیں چل سکے گا کہ تم کہاں غائب ہو گئے۔"

"ماجھے گجر! تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے۔" شارق نے کہا اور اچانک ہی دائیں طرف کھڑے ہوئے آدمی پر جھپٹا۔ دوسرے ہی لمحہ اس آدمی کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی کلاشنکوف شارق کے ہاتھوں میں تھی۔ "خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔" وہ غرایا۔ "تمہارا درست ہے کہ پولیس کو مخبری میں نے ہی کی تھی لیکن مجھے اس تہہ خانے کا پتہ نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تو تم سب لوگ اس وقت آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہوتے۔"

"اوئے مقصود.... تاج.... پکڑو اس کو۔" ماجھا گجر چیخا۔

ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی کلاشنکوف رائفلیں سیدھی کرنے کی کوشش لیکن شارق نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے پیروں کے قریب برسٹ مار دیا۔ تہہ گولیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ "یہ گولیاں تمہارے جسم بھی چھلنی کر سکتی تھیں۔ اپنی رائفلیں پھینک دو۔" شارق غرایا۔

انہوں نے رائفلیں پھینک دیں۔

"تم ہمارے ہاتھوں سے بچ نہیں سکو گے باؤ شارق۔" ماجھا گجر نے خونخوار نگاہوں سے

کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس وقت تو تم لوگ میرے رحم و کرم پر ہو۔" شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں اس وقت تم لوگوں کو ماروں گا نہیں۔ زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں تاکہ پھر کبھی کھلے میدان میں تم سے مقابلہ ہو سکے۔ تم میں سے کوئی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے۔"

شارق الٹے قدموں تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کی رائفل کا رخ انہی کی طرف تھا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے کمرے میں چھلانگ لگا دی اور دروازے کی طرف دوڑا۔ اس کے ساتھ ہی اسے سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

شارق جلے ہوئے دروازے سے نکل کر حویلی کی ٹوٹی ہوئی دیوار کی طرف دوڑا۔ حویلی کی وہ دیوار جب تعمیر کی گئی تھی تو اس کی بلندی دس فٹ کے لگ بھگ تھی۔ لیکن پندرہ سال کی مدت میں کئی جگہوں سے دیوار کی بلندی صرف چار فٹ رہ گئی تھی۔ لوگ دیواروں کی اینٹیں اکھاڑ کر لے گئے تھے۔

شارق دوڑتا ہوا دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسری طرف کودنا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"وہ رہا اس طرف.... گولی مار دو اسے۔"

اس کے ساتھ ہی فضا کلاشنکوف کی آواز سے گونج اٹھی۔ کئی گولیاں شارق کے قریب سے گزر گئیں۔ ایک گولی اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل پر لگی تھی۔ اس کے ہاتھ کو ایک زور کا جھٹکا لگا اور رائفل چھوٹ گئی۔ رائفل دیوار کے اندر کی طرف گری تھی اور شارق دوسری طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ واپس جا کر رائفل اٹھانے کا موقع نہیں تھا۔ اس نے سنبھل کر درختوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کے عقب میں فائرنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں مگر درختوں کی وجہ سے وہ گولیوں سے بچتا ہوا دوڑتا رہا۔

ٹیلے سے اتر کر وہ کھیتوں میں پگڈنڈی پر دوڑنے لگا۔ ٹیلے پر درختوں میں شور سنائی دے رہا تھا۔ شارق نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بے تحاشہ دوڑتا رہا۔ فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی لیکن شارق فائرنگ کی رینج سے بہت دور نکل چکا تھا۔

وہ دوڑتا ہوا نصف میل دور کچی سڑک پر پہنچ گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ تاریکی میں بہت دور سائے دوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ شارق اگر سڑک کے ساتھ ساتھ دوڑتا رہتا تو شادی پور پہنچ سکتا تھا۔ لیکن اس طرف جانے سے تاریکی ہونے کے باوجود وہ نظروں میں آ جائے گا۔ اس نے اپنے لئے کھیتوں کا راستہ منتخب کیا۔ دھان کی جوان فصلوں میں وہ اپنے آپ کو موت کے ان

فرشتوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھ سکتا تھا۔

اگر وہ اسی طرح کھیتوں میں دوڑتا رہے تو لکھو ڈہر سے ذرا آگے محمود بوٹی کے قریب شادی پور والی سڑک کے لنک راوی روڈ پر نکل سکتا تھا۔

وہ بے تحاشہ دوڑتا رہا۔ اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن وہ رکنا نہیں چاہتا تھا۔ رکنے کا مطلب اذیت ناک موت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ وہ کئی میل تک دوڑتا رہا اور بالآخر ایک نہر نے اس کا راستہ روک لیا۔ نہر تقریباً دس فٹ چوڑی تھی اور پانی خاصا گہرا تھا۔ وہ نہر کے کنارے پر رک کر ہانپتے ہوئے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ دونوں طرف دور دور تک نہ پر کوئی پل نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بہت دور تاریکی میں دو سائے دوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

شارق اپنے تنفس پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر دس فٹ چوڑی نہر کو عبور نہیں کر سکتا تھا۔ موت کے فرشتے سر پر پہنچ رہے تھے۔ اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا۔ وہ نہر میں اتر گیا۔ ویسے بھی سردی اچھی خاصی تھی اور نہر کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ وہ کانپ کر رہ گیا لیکن ان موت کے فرشتوں کے مقابلے میں یہ ٹھنڈا پانی قابل برداشت تھا۔

پانی اس کے سینے تک تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دوسرے کنارے کی طرف بڑھتا رہا۔ پانی کا بہاؤ اسے آگے دھکیل رہا تھا۔ وہ پاؤں جمانے کی کوشش کرتا ہوا دوسرے کنارے کی طرف بڑھتا رہا۔ دوسرا کنارہ اس سے صرف تین فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا اور پھر دفعتاً" اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ موت کے وہ دونوں فرشتے قریب پہنچ رہے تھے۔

شارق تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ نہر کے دوسرے کنارے پر جھاڑیاں تھیں۔ وہ جھاڑیوں کو پکڑ کر باہر نکلنا چاہتا تھا لیکن دفعتاً" اسے خیال آیا کہ وہ پانی سے نکل کر جیسے ہی کنارے پر پہنچے موت کے فرشتے اسے گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دائیں طرف نہر میں ایک کٹاؤ سا نظر آیا۔ وہ کنارے کی جھاڑیوں کو تھامتا ہوا اس کٹاؤ کی طرف بڑھنے لگا۔

یہ کٹاؤ تقریباً چھ فٹ خشکی کی طرف نکلا ہوا تھا۔ اس کے دونوں کناروں پر سرکنڈے کی گنجھ جھاڑیاں تھیں۔ وہ جھاڑیاں اس طرح اندر کی طرف جھکی ہوئی تھیں کہ کھاڑی تقریباً چھپ کر رہ گئی تھی۔ شارق نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دوسری طرف نہر کے کنارے کی ڈھلان ہونے کی وجہ سے وہ دونوں اگرچہ اسے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

شارق کھاڑی میں گھس گیا۔ یہاں پانی اس کی گردن تک تھا لیکن وہ کھاڑی کے اندر باقی

کنارے سے لگ کر جھاڑیوں میں اس طرح چھپ گیا تھا کہ بظاہر اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن وہ جھاڑیوں سے باہر دیکھ سکتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے دوسرے کنارے پر دو سائے نظر آئے۔ ان دونوں کے پاس رائفلیں تھیں اور وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔

"یہاں تک تو میں نے اسے دیکھا تھا۔ لیکن آگے کہاں جا سکتا ہے وہ؟" ایک آواز سنائی دی۔

"ہو سکتا ہے وہ نہر پار کر کے دوسری طرف چلا گیا ہو۔ لکھوڈہر زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر وہ وہاں تک پہنچ گیا تو پھر اسے پکڑنا مشکل ہو جائے گا۔" دوسرے نے کہا۔

"تو پھر نہر پار کر کے دوسری طرف چلیں۔" پہلی آواز نے کہا۔

"یہی کرنا پڑے گا۔" دوسری آواز نے کہا۔ "تم ماجھے گجر کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر شارق باؤ بچ کر نکل گیا تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"تو پھر چلو اتر دو نہر میں۔ سوچ کیا رہے ہو۔" پہلی آواز نے کہا۔

شارق پانی میں کھڑا جھاڑیوں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں نہر میں اتر گئے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں سر سے اوپر اٹھا رکھی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ دوسرے کنارے پر آ گئے۔

"یہاں تو ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے جن سے یہ اندازہ ہو کہ وہ اس جگہ نہر سے باہر نکلا ہو گا۔" ایک آدمی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے وہ اس جگہ نہر سے باہر نکلا ہوتا تو کنارے پر پانی وغیرہ ضرور پھیلا ہوا ہوتا۔"

"ممکن ہے وہ کچھ آگے جا کر نہر سے نکلا ہو۔" دوسرے نے کہا۔

شارق سانس روکے پانی میں دبکا رہا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس نے تیز سانس لی یا ذرا سی بھی حرکت کی تو جھاڑیوں کی سرسراہٹ سے وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور پھر اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکے گی۔

"میرا خیال ہے وہ لکھوڈہر کی طرف ہی گیا ہو گا۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"تو پھر جلدی کرو۔" دوسرے نے جواب دیا۔ "ہمیں ہر صورت میں اسے آبادی تک پہنچنے سے روکنا ہے۔"

شارق خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ موت اس کے سر پر کھڑی تھی۔ اس کی ذرا سی بے احتیاطی اس کی زندگی کا چراغ گل کر سکتی تھی۔ ٹھنڈے پانی میں کھڑے رہنے سے اس کا جسم سن ہو رہا تھا لیکن موت کے خوف سے وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

وہ دونوں نہر کے کنارے پر چلنے لگے۔ ان کے جوتوں میں پانی بھرا ہوا تھا اور چلنے سے ان کے جوتوں سے شڑاپ شڑاپ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ آوازیں بتدریج معدوم ہوتی چلی گئیں۔ تقریباً دس منٹ بعد شارق بڑی احتیاط سے جھاڑیوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا کھاڑی سے باہر نکل آیا۔ اس کے لباس سے پانی دھاروں کی صورت میں نچڑ رہا تھا۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بیٹھے ہی بیٹھے گردن گھما کر بائیں طرف دیکھنے لگا۔ بہت دور لکھو ڈہر قصبے کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے بیٹھے ہی بیٹھے جوتے اتار دیئے اور انہیں اوندھا کر کے رکھ دیا تاکہ ان میں بھرا ہوا پانی نچڑ جائے۔ وہ اتنی دیر تک ٹھنڈے پانی میں کھڑا رہا تھا اور اب سردی سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے قمیض اتار کر خوب اچھی طرح نچوڑی۔ پھر پتلون بھی اتار کر اسے نچوڑنے لگا۔ پانی نچڑ جانے سے یہ ہو سکتا تھا کہ ہوا سے کپڑے جلدی سوکھ سکتے تھے۔ لیکن کپڑے اتارنے سے اس کی کپکپاہٹ بڑھ گئی اور اس کے دانت بجنے لگے۔ اس نے نچوڑے ہوئے کپڑے دوبارہ پہن لئے اور پانی میں تر جوتے پہن کر تیز تیز قدموں سے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ جوتے بھیگ جانے سے خاصے وزنی ہو گئے تھے اور قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا لیکن وہ چلتا رہا۔ چلنے سے خون کی گردش بھی تیز ہونے لگی اور وہ اپنے آپ میں کچھ حرارت محسوس کرنے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ پکی سڑک پر پہنچ گیا۔ سڑک سنسان اور تاریک تھی۔ بائیں طرف سڑک شادی پور سے ہوتی ہوئی داردغہ والا کے مقام پر جی ٹی روڈ سے جا ملتی تھی اور دائیں طرف طویل فاصلہ طے کر کے دریائے راوی کے پل تک چلی گئی تھی۔ شارق سڑک پر آنے سے پہلے کھیتوں میں ٹاہلی کے ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر بائیں طرف دیکھنے لگا۔ بائیں طرف تھوڑے ہی فاصلے پر محمود بوٹی کی آبادی تھی۔

شارق ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ شادی پور کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ دونوں آدمی لکھو ڈہر کی طرف گئے تھے۔ اس طرف ان سے سامنا ہونے کا اندیشہ تھا۔ دائیں طرف راوی پل کے قریب سبزی منڈی تھی۔ اگر اسے وہاں تک پہنچنے کا موقع مل جائے تو وہاں سے کوئی سواری حاصل کر کے کسی بھی طرف جا سکتا تھا لیکن سبزی منڈی وہاں سے کئی میل دور تھی۔ اور اس میں ایک قدم چلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ پہلے ہی کئی میل کا فاصلہ طے کر آیا تھا۔ اس کے جوتے اور کپڑے کیچڑ میں لت پت تھے۔

وہ کچھ دیر تک ٹاہلی کے درخت کی آڑ میں کھڑا رہا پھر سڑک پر آنے کی بجائے کھیتوں میں دائیں طرف چلنے لگا۔ ابھی وہ چند ہی گز دور چلا تھا کہ سڑک پر دو آدمیوں کو دیکھ کر چونک

گیا۔ وہ دونوں سڑک کے دوسری طرف نشیب سے نکل کر اچانک ہی سامنے آئے تھے۔ تاریکی ہونے کے باوجود ان دونوں کے ہاتھوں میں کلاشنکوف رائفلیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہی دونوں تھے۔

شارق ایک دم پودوں میں دبک گیا۔ اس سے چند گز آگے کسی گاؤں کی طرف سے آنے والا کچا راستہ تھا جو پکی سڑک سے جا ملتا تھا۔ وہ دونوں اسی راستے پر آ کر رک گئے۔

"وہ لکھو ڈہر یا محمود بوٹی کی طرف بھی نہیں آیا۔ اس طرف بھی کہیں نظر نہیں آ رہا۔ کہاں غائب ہو گیا؟" ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ اس طرف آیا ہی نہ ہو۔ کسی اور طرف نکل گیا ہو۔" دوسرے نے کہا۔

"وہ دیکھو..... گاؤں کی طرف سے شاید کوئی ٹرالی آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اس میں ہو۔" ایک آدمی نے کھیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شارق نے بھی گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ وہ کوئی ٹریکٹر ٹرالی ہی تھی جو اس کچے راستے پر آ رہی تھی۔ ٹریکٹر کے انجن کی آواز اب صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں اچھلتی ہوئی سی نظر آ رہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ راستہ خاصا ناہموار تھا۔ شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس ٹرالی پر بچھے وغیرہ لدے ہوئے تھے یا سبزی وغیرہ جو منڈی لے جائی جا رہی تھیں۔

وہ دونوں آدمی کھیتوں میں راستے کے دائیں بائیں چھپ گئے اور ٹریکٹر جیسے ہی قریب پہنچا وہ دونوں کھیتوں سے نکل کر سڑک پر آ گئے اور رائفلیں اٹھا کر ٹریکٹر کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ٹریکٹر فوراً ہی رک گیا۔

"کیا بات ہے جوانو؟" ٹریکٹر ڈرائیور بولا۔ وہ کوئی کاشتکار تھا۔ "بھئی میرے پاس پچاس ساٹھ روپے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔"

"ہمیں تمہارے پچاس ساٹھ روپے کی ضرورت نہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "تمہارے ساتھ اور کون ہے؟"

"میرا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ ٹرالی پر لدے ہوئے پٹھوں پر سو رہا ہے۔" ٹریکٹر ڈرائیور نے جواب دیا۔

"مقصود! تم اوپر چڑھ کر دیکھو۔" دوسرے آدمی نے کہا۔

شارق پودوں میں دبکا رہا۔ ٹرالی کا فاصلہ اس سے دس پندرہ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ ان کی باتیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ سانس روکے پودوں میں دبکا رہا۔ ان میں سے ایک

آدمی ٹرالی پر لدے ہوئے پٹھوں کے گٹھوں پر چڑھتا ہوا نظر آیا۔ وہ مقصود تھا۔ گٹھوں کے اوپر سفید کھیس لپیٹے کوئی آدمی سو رہا تھا۔ مقصود نے رائفل کی نال سے اسے ٹھوکا دیا۔ وہ آدمی گڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اور پھر مقصود کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"کک.....کون ہو تم.....کیا بات ہے؟" وہ ہکلایا۔

"کچھ نہیں....سو جاؤ آرام سے ابھی دن نہیں چڑھا۔" مقصود کہتے ہوئے نیچے اتر آیا۔ وہ شخص لیٹنے کی بجائے کھیس لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں وہ آرام سے نہیں لیٹ سکتا تھا۔

"ٹرالی پر اس کے بھائی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔" مقصود نے نیچے اتر کر اپنے ساتھی کو بتایا۔ "میرا خیال ہے وہ نکل چکا ہو گا۔ کیوں نہ ہم لوگ بھی اسی ٹرالی پر سبزی منڈی کی طرف نکل چلیں۔ ہو سکتا ہے وہ اسی طرف ہو۔"

"چلو....بیٹھ جاؤ ٹریکٹر پر۔" دوسرے آدمی نے کہا۔ وہ ساجھا تھا۔

"کیا بات ہے بھئی' تم لوگ کون ہو اور تمہیں کس کی تلاش ہے؟" ٹریکٹر ڈرائیور نے پوچھا۔

"ایک آدمی ہمارے چوہدری کے گھر سے زیورات اور ایک بڑی رقم چوری کر کے بھاگا ہے۔ ہمیں اس کی تلاش ہے۔" مقصود نے کہا "تم ٹریکٹر چلاؤ۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"کون سے چوہدری کے گھر سے؟" ٹریکٹر والے نے پوچھا۔

"وہ بھینی کا رہنے والا ہے۔ تم اسے نہیں جانتے۔" مقصود نے کہا۔

"میں اسی علاقے کا رہنے والا ہوں۔ کس چوہدری کو نہیں جانتا۔" ٹریکٹر ڈرائیور بولا۔

"تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہئے۔ خاموشی سے ٹریکٹر چلاتے رہو۔" ساجھا غرایا۔

ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف رائفلیں تھیں اور کاشتکار نے مزید بحث کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ یہ لوگ خاصے خطرناک لگ رہے تھے۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اسے یا اس کے بھائی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا جائے۔ اس لئے وہ خاموشی سے ٹریکٹر چلاتا رہا۔

ٹریکٹر ٹرالی کھیتوں والے راستے سے نکل کر پکی سڑک پر پہنچ چکی تھی اور پھر اس کا رخ راوی کی طرف مڑ گیا۔ ٹرالی جب کافی دور نکل گئی تو شارق بھی کھیت سے نکل آیا اور ادھر ادھر بیٹھے دیکھتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ ٹرالی بہت دور جا چکی تھی اور سڑک ایک بار پھر ویران ہو چکی تھی۔

دفعتاً" کسی اور ٹریکٹر کے انجن کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ کھیتوں والے اسی میدان سے ٹریکٹر چلا رہا تھا۔ اس نے شارق سے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کچے راستے سے ایک اور ٹریکٹر آ رہا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔

وہ بھی ایک ٹریکٹر ٹرالی تھی اور اس پر بھی بیٹھے ہی لدے ہوئے تھے۔ وہ ٹرالی جیسے ہی کچے راستے میں بریک پر چڑھی شارق درخت کی آڑ سے نکل آیا۔ اس دوران اس نے اطمینان کر لیا تھا کہ ٹریکٹر پر ڈرائیور کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ شارق نے سڑک کے بیچ میں آ کر ٹریکٹر کو رکنے کا اشارہ کیا۔

"کیا بات ہے بھئی کون ہو تم؟" ڈرائیور نے اسے گھورا۔

"میں گاؤں سے آ رہا تھا کہ ڈاکو میری موٹر سائیکل چھین کر لے گئے۔ وہ مجھے بھی قتل کر دیتے مگر میں بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔ اگر تم مجھے سبزی منڈی تک پہنچا سکو تو بڑی مہربانی ہو گی۔" شارق نے کہا۔

"کون سے گاؤں سے آ رہے ہو۔ میں نے پہلے تو تمہیں اس علاقے میں کبھی نہیں دیکھا۔" ٹریکٹر ڈرائیور نے کہا۔

"میں دراصل سمن آباد میں رہتا ہوں۔ بھینی میں میری بہن رہتی ہے۔ شام کو ان سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ ابھی واپس جا رہا تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔" شارق نے جواب دیا۔

"اس وقت تمہیں گاؤں سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی؟" کسان نے پوچھا۔

"مجھے صبح دفتر بھی جانا ہے اس لئے گاؤں سے جلدی نکلا تھا۔" شارق نے کہا۔

"ابھی تو صبح ہونے میں بہت دیر ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں منڈی تک پہنچا دوں گا۔" ٹریکٹر ڈرائیور نے کہا۔

شارق اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹریکٹر پر سوار ہو گیا۔ ٹریکٹر پر دوسرے آدمی کے بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ شارق پائیدان پر کھڑا ہو گیا اور ٹریکٹر چل پڑا۔

سڑک خاصی ٹوٹی پھوٹی تھی۔ ٹریکٹر اور ٹرالی کو بری طرح جھٹکے لگ رہے تھے۔ شارق اپنے قدم پائیدان پر مضبوطی سے جمائے کھڑا تھا۔ سہارے کے لئے اس نے ٹریکٹر کے ایک حصے کو تھام رکھا تھا۔ اس کی نظریں سامنے سڑک پر لگی ہوئی تھیں۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں دور دور تک سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔ شارق اس روشنی میں دائیں بائیں بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں اس راستے سے پہلے ہی جا چکے تھے اور اس بات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ دونوں کہیں گھات لگائے ہوں۔

رات کی تاریکی اب دن کے ہلکے سے اجالے میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ ٹریکٹر ڈرائیور

تھی۔ چونگی ناکے پر پہنچ کر ڈرائیور نے ٹریکٹر روک لیا اور اتر کر چونگی محرر کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ شارق اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ پہلے اس نے سوچا کہ یہیں پر اتر جائے مگر پھر یہ ارادہ ترک کر دیا۔ منڈی یہاں سے کافی دور تھی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد کسان واپس آ گیا۔ اس نے ٹریکٹر پر سوار ہو کر اپنی سیٹ سنبھالی اور ٹریکٹر حرکت میں آ گیا۔

مزید دس منٹ بعد وہ لوگ منڈی پہنچ گئے۔ اس وقت دن کی روشنی واضح ہو رہی تھی۔ سڑک کے کنارے نشیب میں بہت بڑی منڈی تھی۔ اس کا ایک حصہ مویشیوں کے چارے وغیرہ کے لئے مخصوص تھا دوسرا سبزیوں کے لئے اور تیسرا پھلوں کے لئے۔ سبزیوں والا حصہ درمیان میں تھا اور گھاس منڈی اس سے آگے۔

منڈی میں خاصی چہل پہل تھی۔ اب کاروبار شروع ہو چکا تھا۔ شارق نے ٹرالی والے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹریکٹر سے چھلانگ لگا دی اور سڑک کی ڈھلان پر دوڑتا ہوا سبزی منڈی میں داخل ہو گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل رہا تھا۔ چاروں طرف سے مختلف قسم کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کہیں سبزیوں کی لاٹ کی بولی لگ رہی تھی اور کہیں بھاؤ تاؤ ہو رہا تھا۔

منڈی میں خاصا ہجوم تھا۔ شہر کے بیشتر سبزی اور پھل فروش اپنی دکانوں کے لئے مال اسی منڈی سے خریدتے تھے۔ شارق ہجوم میں راستہ بناتا ہوا اس طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا جہاں سے اسے کوئی سواری مل سکتی تھی۔ وہ ایک طرف مڑا ہی تھا کہ دو آدمیوں نے اچانک ہی اس کا راستہ روک لیا۔ ان دونوں نے اپنے جسموں پر چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ ان کی شکلیں دیکھ کر شارق کانپ اٹھا۔ وہ مقصود اور ساجھا تھے۔ موت کے وہی دو فرشتے جن سے بچنے کے لئے وہ رات بھر بھاگتا رہا تھا۔

○

"شارق باؤ۔" ساجھے نے خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑو۔ اب اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تمہارا جسم گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔"

شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان دونوں نے چادروں کے اندر کلاشنکوف رائفلیں چھپا رکھی تھیں۔ اسے حیرت اس بات پر بھی ہوئی تھی کہ انہوں نے چادریں کہاں سے لے لی تھیں۔ پھر دفعتاً اسے اس ٹریکٹر ٹرالی کا خیال ابھر آیا جس پر وہ دونوں سوار ہوئے تھے۔ اس ٹریکٹر ٹرالی کے ڈرائیور اور اس کے بھائی نے کھیس یا چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ انہوں نے یقیناً یہ چادریں اوڑھ کر ہی سے ہتھیا لی ہوں گی تاکہ اپنی رائفلوں کو چھپا سکیں۔

شارق نے ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس بیسیوں لوگ موجود تھے جو اپنے کام دھندوں میں مصروف تھے۔ ساجھا اس کے دائیں طرف کھڑا تھا اور مقصود بائیں طرف۔ مقصود کی رائفل کی نال اس کی پسلیوں میں چبھ رہی تھی۔

"ہمارے ساتھ چلو۔" اس مرتبہ مقصود نے کہا۔ "اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو ہم فائر کھول دیں گے۔ ہمیں اس بات کی پرواہ نہیں ہو گی کہ کتنے لوگ ہماری گولیوں کا نشانہ بنتے ہیں لیکن تم زندہ نہیں بچ سکو گے۔"

شارق کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس کے کندھے لٹک گئے۔ اس نے ایسا انداز اختیار کر لیا جیسے ان کے ساتھ جانے کو تیار ہو لیکن پھر اچانک ہی وہ کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس کے دونوں ہاتھ دونوں کی گردنوں اور دونوں پیر دونوں کے پہلوؤں پر لگے تھے۔ بڑی محنت اور ریاضت سے سیکھا ہوا مارشل آرٹس کا فن ایسے ہی موقعوں پر کام آنے کے لئے تھا۔

وہ دونوں کراہتے ہوئے گرے۔ شارق بھی گرا تھا مگر وہ ایسے کاموں میں ماہر تھا وہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر ایک طرف بھاگ نکلا۔

مقصود پہلے سنبھلا تھا۔ اس نے اٹھتے ہی فائرنگ شروع کر دی۔ شارق تو اس فائرنگ سے محفوظ رہا لیکن ایک مزدور، جس نے سر پر بوجھ اٹھا رکھا تھا گولی کا نشانہ بن گیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ دو آدمی گولیوں سی زخمی ہو کر گرے تھے۔

پوری منڈی میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لوگ بدحواس ہو کر ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ شارق بھی لوگوں کو دھکے دیتا ہوا ایک طرف بھاگتا رہا۔ وہ سبزیوں والے سیکشن سے نکل کر پھلوں والے سیکشن میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں بھی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ایک آدمی کیلوں سے بھرے ہوئے ایک ٹوکرے کے قریب کھڑا بدحواس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس نے دائیں طرف سے دوڑتے ہوئے ایک مزدور کو آواز دی۔

"اوئے پانڈی۔"

مگر وہ پانڈی رکے بغیر ایک طرف بھاگتا چلا گیا لیکن شارق اس شخص کے قریب رک گیا۔

"کیا ہے ملک جی، یہ سامان اٹھانا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، کیلوں کا یہ ٹوکرا اٹھاؤ۔ جلدی کرو۔" اس شخص نے کہا۔

شارق نے جھک کر کیلوں والا ٹوکرا اٹھا لیا جو خاصا وزنی تھا۔ وہ ٹوکرا سر پر اٹھائے اس شخص کے پیچھے دوڑتا رہا۔ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک سوزوکی پک اپ کھڑی تھی جس میں کچھ اور

بھی پھلوں کے ٹوکرے لدے ہوئے تھے۔ کچھ پھل ویسے ہی ڈھیر کئے ہوئے تھے۔ شارق نے کیلوں والا ٹوکرا سوزوکی میں پٹخ دیا۔ اور گردن سہلانے لگا۔ اس شخص نے پانچ کا ایک نوٹ نکال کر شارق کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے ملک جی؟" شارق نے نوٹ لینے کی بجائے پوچھا۔

"سمن آباد... کیوں؟" اس شخص نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ مجھے راستے میں چوبرجی پر اتار دیجئے یہاں تو بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔" شارق نے کہا۔

"چلو بیٹھو' جلدی کرو۔" وہ شخص کہتا ہوا اسٹیئرنگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ شارق بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ یہ سوزوکی اس شخص کی اپنی تھی ۔اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور سوزوکی ایک زور دار جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

سبزی منڈی میں اب بھی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ایک دو مرتبہ فائرنگ بھی ہوئی تھی۔ لوگ اپنا کام چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ سوزوکی ادھر ادھر لہراتی ہوئی تیزی سے منڈی کے علاقے سے نکل کر سڑک پر آ گئی اور تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگی۔

"تم کون ہو' پانڈی تو نہیں لگتے۔" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں شادی پور سے آیا تھا۔ فیصل آباد جانے کے لئے لیکن راستے میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ میں ۔نے کھیتوں میں چھپ کر جان بچائی۔ میرے کپڑوں کی یہ حالت اسی وجہ سے ہوئی ہے۔" شارق نے اسے بھی ایک فرضی کہانی سناتے ہوئے کہا۔

"منڈی میں کیا کر رہے تھے اور چوبرجی کیوں جانا چاہتے ہو؟" اس شخص نے پوچھا۔

"مزدوری کر کے کچھ پیسے جمع کرنا چاہتا تھا۔" شارق نے جواب دیا۔ "لیکن یہاں تو معاملہ ہی بگڑ گیا۔ چوبرجی میں میرا کزن رہتا ہے۔ اس کے پاس جا رہا ہوں۔ اسی سے کچھ رقم قرض لے کر آج فیصل آباد چلا جاؤں گا۔"

سوزوکی مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی چوبرجی پہنچ کر رک گئی۔ شارق اس شخص کا شکریہ ادا کر کے نیچے اتر آیا۔ اس وقت دن کی اچھی خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔ سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ زیادہ تر لوگ سائیکلوں پر اپنے اپنے کام دھندوں کے لئے جا رہے تھے۔ بسیں بھی چلنے لگی تھیں۔ شارق سوزوکی سے اتر کر پیدل چلتا ہوا اس طرف آ گیا جہاں ایک طرف مرغیوں کی فیڈز کی مارکیٹ تھی اور اس کے سامنے سڑک کے دوسری طرف شام نگر کا علاقہ تھا۔ اگرچہ آمد و

رفت کے لئے لوہے کا ایک اوورہیڈ پل بھی بنا دیا گیا تھا۔ نالے پر ایک چھوٹی پلیا بھی تھی اور لوگ اوورہیڈ برج استعمال کرنے کے بجائے آمد و رفت کے لئے یہی پلیا استعمال کر رہے تھے۔

شارق بھی پلیا پر سے ہوتا ہوا دوسری طرف آ گیا۔ یہاں ایک مختصر سا بازار تھا۔ اسکول جانے والے بچے گھروں سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے۔ شارق رات بھر بھاگ دوڑ سے بری طرح تھکن محسوس کر رہا تھا۔ بازار میں چائے کی ایک دکان کھل چکی تھی۔ دکان کے سامنے کچھ میزیں اور بنچ بچھے ہوئے تھے اور مزدور قسم کے لوگ ان بنچوں پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ شارق دکان کے اندر آ گیا۔ دکان کے باہر اگرچہ ناشتہ کے لئے حلوہ پوری بھی بن رہی تھی مگر شارق نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے ملازم کو چائے اور مکھن لگا بن لانے کو کہا اور پتلون کی پچھلی جیب سے بٹوہ نکال کر اس میں رکھے ہوئے نوٹوں کا جائزہ لینے لگا۔ ہزار' پانچ سو اور سو سو والے کئی نوٹ تھے جو نہر میں اترنے اور دیر تک پانی میں کھڑے رہنے کی وجہ سے بھیگ چکے تھے۔ اس کے بٹوے میں کچھ کاغذات بھی تھے اور وہ بھی بھیگ چکے تھے۔ شارق نے سو کا ایک نوٹ نکال کر بٹوہ پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ نوکر جب چائے اور پلاسٹک کی ایک میلی سی پلیٹ میں مکھن لگا بن لے کر آیا تو شارق نے سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"پیسے کاٹ لو۔"

"کھلے پیسے دو باؤ جی۔" نوکر بولا۔ "صبح صبح سو کا کھلا نہیں ہو گا۔"

"ایسا کرو۔ باہر کھوکھے سے گولڈ لیف کا ایک پیکٹ اور ماچس لے لو۔ دو روپے تمہارے اور باقی کے پیسے کاٹ کر باقی پیسے مجھے لا دو۔" شارق نے کہا۔

دو روپے کے لالچ میں وہ لڑکا سو کا نوٹ لے کر باہر چلا گیا اور شارق اطمینان سے ناشتہ کرنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد چائے کی دکان سے نکلا تو اس کے ہونٹوں میں سلگتا ہوا سگریٹ دبا ہوا تھا۔ وہ تمباکو نوشی کا عادی نہیں تھا۔ کبھی کبھار شوقیہ طور پر سگریٹ پی لیا کرتا تھا اور اس وقت تو کانوٹ کھلا کرانے کے لئے سگریٹ خریدے گئے تھے۔

شارق کو اطمینان تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ لیکن اسے افسوس اس کا تھا کہ ماجھا گجر اور اس کے ساتھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگے اور وہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا تھا۔

وہ کچھ دور تک بازار میں چلتا رہا اور پھر ایک گلی میں مڑ گیا۔ اس گلی میں بنگلہ نما رہائشی مکان تھے۔ وہ دو تین گلیوں میں گھومتا ہوا ایک کوٹھی نما مکان کے سامنے رک گیا۔ اس وقت سورج ہو چکا تھا اور دھوپ کی نرم سنہری کرنیں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔

گیٹ کو باہر سے تالا نہیں لگا تھا۔ اس نے گیٹ کی شیٹ کے ایک سوراخ میں ہاتھ ڈال کر اندر سے لگا ہوا کنڈہ ہٹایا اور گیٹ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی گیٹ بند کر دیا۔ کسی نے اسے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو اسے اس کی پرواہ نہ تھی۔ وہ یہیں رہتا تھا اور محلے کے لوگ اسے ایک شریف آدمی کی حیثیت سے جانتے تھے۔

وہ چند لمحے گیٹ کے قریب کھڑا رہا پھر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔ برآمدے کا بلب جل رہا تھا۔ وہ رات کو بلب جلا کر گیا تھا۔ اس نے دیوار پر لگا ہوا سوئچ آف کر دیا اور پتلون کی جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا اور اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ راہداری میں تین قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ دائیں طرف والے کمرے کا دروازہ بڑی آہستگی سے کھلا۔ ایک آدمی باہر نکلا اور اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال شارق کی گردن سے لگا دی۔

"تم سمجھتے تھے کہ ہمیں دھوکا دے کر ہم سے بچ نکلو گے۔" اس شخص کے حلق سے خوفناک غراہٹ نکلی۔ "ماجھا گجر جس شخص کے ساتھ کاروبار کرتا ہے اس کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہے۔ تمہارا یہ ٹھکانہ چند روز پہلے ہی ہماری نظروں میں آیا تھا اور ہمیں یقین تھا کہ تم سے بھاگ کر سیدھے یہیں آؤ گے۔"

"تم ماجھا گجر تو نہیں ہو۔" شارق بولا۔ "کون ہو تم؟"

"ماجھے گجر کا ایک ادنیٰ خادم۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "تم پاتال میں بھی چھپ جاتے ہم تمہیں ڈھونڈ نکالتے۔ میں ایک گھنٹے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تم سیدھے یہیں آؤ گے۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ مال ہمارے حوالے کر دو۔"

"مال۔" شارق کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ "ہاں' اب تو مال تم لوگوں کے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے' آگے بڑھو۔" اس شخص نے شارق کی گردن پر پستول ڈالا۔

شارق دو قدم آگے بڑھا لیکن پھر اچانک ہی بڑی پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ اس نے اس شخص کی پسلیوں میں دونوں کہنیوں سے ٹھوکر مار دی۔

وہ شخص کراہ اٹھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ شارق بڑی تیزی سے سنبھلنے گیا تھا۔ اس نے اپنے حریف کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

وہ الیاس تھا۔ ماجھا گجر کا ساتھی۔ رات کو یہ بھی سوختہ حویلی میں ہی تھا لیکن اس کے بعد حویلی سے نکل کر شاید یہیں آیا تھا۔ چند گھونسے اور ٹھوکریں کھانے کے بعد الیاس

گیا اور اب اس نے بھی جوابی حملے شروع کر دیئے تھے۔ وہ دونوں لڑتے ہوئے ہال نما کمرے میں آ گئے۔ یہاں ایک طرف صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ ایک دو کرسیاں تھیں اور سامنے ایک کونے میں ٹرالی پر ٹیلی ویژن سیٹ رکھا ہوا تھا۔

الیاس کا گھونسہ کھا کر شارق پشت کے بل صوفے پر گرا۔ الیاس نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ شارق بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ الیاس منہ کے بل صوفے پر گرا۔ شارق نے اسے قمیض کے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور سر پر زور دار گھونسہ رسید کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے زور دار دھکا دیا۔ الیاس ٹی وی ٹرالی سے جا ٹکرایا۔ ٹرالی الٹ گئی۔ ٹی وی کی پکچر ٹیوب چکنا چور ہو گئی۔ الیاس کو سنبھلنے میں صرف ایک سیکنڈ لگا تھا۔ اس نے اٹھ کر فوراً ہی شارق پر حملہ کر دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر فرش پر گرے اور ایک دوسری سے گتھم گتھا ہو گئے۔ کبھی شارق نیچے ہوتا اور کبھی الیاس۔ وہ دونوں دیوار سے جا لگے۔ الیاس دیوار کا سہارا لے کر اٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن شارق نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

شارق کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ الیاس کو دیوار کے ساتھ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کی برعکس الیاس نے اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ لیکن اس طرح شارق کو موقع مل گیا۔ اس نے سیدھا ہاتھ الیاس کے گلے پر لپیٹ دیا اور اسے پوری قوت سے دبانے لگا۔

الیاس پہلے تو اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کرتا رہا لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کر شارق کے سر کے بال پکڑنے کی کوشش کی مگر شارق نے ایک جھٹکے سے سر پیچھے ہٹا لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس کے گلے پر اپنے بازو کا دباؤ بڑھانے لگا۔

الیاس ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ شارق کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔ الیاس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں۔ شارق نے دوسرے ہاتھ سے اپنے اس بازو کو پکڑ رکھا تھا جو اس نے الیاس کی گردن پر لپیٹ رکھا تھا۔ اس طرح دونوں ہاتھوں کی قوت ایک ہی جگہ پر مرکوز ہو گئی تھی۔ ایک طرف الیاس کا گلا دب رہا تھا اور دوسری طرف اس کی گردن کی ہڈی پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اب اس کی زبان بھی منہ سے باہر نکلنے لگی تھی۔ وہ بری طرح پیر پٹخ رہا تھا۔

شارق پے در پے جھٹکے دے رہا تھا۔ الیاس کے حلق سے عجیب سی آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔ شارق نے ایک زور دار جھٹکا دیا۔ کڑک کی آواز ابھری۔ الیاس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا مگر شارق نے اب بھی گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی۔ الیاس کے منہ سے نکلنے والی خرخراہٹ کی آوازیں بتدریج کم ہوتی چلی گئیں۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور اس کی گردن شارق کی بانہوں میں ڈھلک گئی۔ شارق نے ایک اور ہلکا سا جھٹکا دیا

اور اس کی گردن چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ الیاس لڑھک کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔

شارق اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا دیر تک اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا' پھر اس نے شعلہ بار نگاہوں سے الیاس کی لاش کی طرف دیکھا اور اسے پیر سے ہلکی سی ٹھوکر مارتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔

وہ اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ الماری کھول کر ہینگر پر ٹنگے ہوئے کپڑوں کا ایک جوڑا نکالا اور پہنے ہوئے کپڑے اور جوتے اتار کر وہیں پھینک دیئے اور الماری سے نکالے ہوئے کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گیا۔ گرم پانی کے غسل سے اس کی تھکن بڑی حد تک دور ہو گئی۔ وہ لباس بدل کر باہر آ گیا۔

اس نے کچن میں جا کر چائے بنائی۔ خاصا کشادہ کچن تھا۔ چیزیں رکھنے کے لئے کیبنٹ بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف چھوٹا فریج بھی رکھا ہوا تھا جس میں دودھ اور ضرورت کی دیگر چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ چائے بنانے کے ساتھ ہی اس نے دوسرے چولہے پر دو انڈے ابالنے کو رکھ دیئے تھے۔

ابلے ہوئے انڈے چھیل کر اس نے پلیٹ میں رکھے انہیں دو دو ٹکڑوں میں کاٹا۔ ان پر نمک اور کالی مرچ چھڑکی۔ ایک کپ میں چائے انڈیلی اور دونوں چیزیں لے کر کچن کے سامنے ہی میز پر بیٹھ گیا اور بڑے اطمینان سے چائے کے ساتھ انڈے کے پیس کھانے لگا۔ جس جگہ وہ بیٹھا ہوا تھا وہاں سے الیاس کی لاش بھی نظر آ رہی تھی۔ مگر اس نے لاش کو اس طرح نظرانداز کر رکھا تھا جیسے اس مکان میں اس کا وجود ہی نہ ہو۔

انڈوں کی پلیٹ صاف کرنے اور چائے کا کپ خالی کرنے کے بعد وہ دوبارہ بیڈ روم میں گیا۔ کچھ دیر تک دیوار کے ساتھ ایستادہ لکڑی کی الماری کو دیکھتا رہا۔ جب اس نے کپڑے نکالے تھے تو اسی وقت اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ الماری کی تلاشی لی گئی تھی۔ اس نے الماری کو پکڑ کر آہستہ آہستہ اس کی جگہ سے تقریباً تین فٹ آگے کھسکا دیا۔ اس الماری کے پیچھے دیوار میں ایک اور ہضمی الماری تھی۔ اس الماری کا دروازہ آہنی چادر کا تھا۔ شارق چند لمحے بند آہنی دروازے کو دیکھتا رہا۔ اس میں تالوں کے دو سوراخ تھے۔ وہ الماری کے سامنے سے ہٹ کر بیڈ کے قریب گیا۔ پائنتی کی طرف سے بیڈ کو اٹھا کر اس کی جگہ سے تھوڑا سا ہٹا دیا۔ ایک پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا تھا جس میں چابیوں کا گچھا رکھا ہوا تھا۔ اس نے چابیوں کا گچھا اٹھا لیا اور دوبارہ آہنی دروازے کے قریب آ گیا۔ دروازے والی الماری کے قریب آ گیا۔ اس نے دو چابیاں استعمال کرتے ہوئے آہنی دروازے

دونوں ہضمی قفل کھول کر الماری کھول دی۔

اس الماری کے اندر تین خانے بنے ہوئے تھے۔ تینوں خانے بند تھے۔ اس نے ایک چابی منتخب کر کے اوپر والا دروازہ کھولا۔ اس میں کرنسی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ گڈیاں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ دوسرے خانے میں ایک پستول رکھا ہوا تھا۔ مگر یہ پستول نہیں تھا' گن تھی جو سائز میں پستول سے خاصی بڑی تھی۔ چھوٹی رائفل اور پستول کے درمیان کی کوئی چیز تھی۔ یہ گن شارق نے ایک غیر ملکی اسمگلر سے خریدی تھی اور اسے بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ تیسرے خانے میں پلاسٹک کی تھیلیاں سلیقے سے نیچے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔ ان تھیلیوں میں سفید رنگ کا پاؤڈر بھرا ہوا تھا۔ یہ ہیروئن تھی۔

شارق کچھ دیر تک ان تینوں خانوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بیڈ کے نیچے سے سیمسونائٹ کا براؤن رنگ کا سوٹ کیس نکالا۔ پہلے اس میں ہیروئن کی تھیلیاں رکھیں۔ وہ تعداد میں پچیس تھیں۔ ہر تھیلی میں ایک کلو ہیروئن تھی۔ بین الاقوامی منڈی میں اس ہیروئن کی قیمت کروڑوں روپے ہو سکتی تھی۔ ہیروئن کی تھیلیاں رکھنے کے بعد اس نے ایک سائیڈ میں پستول رکھا پھر نوٹوں کی گڈیاں جمائیں اور دوسری الماری سے کپڑے نکال کر ان کے اوپر رکھنے لگا۔ لوہے کے دروازے والی الماری بند کر دی اور لکڑی کی الماری کو سرکا کر دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

اس نے سوٹ کیس بند کر دیا اور گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لینے لگا۔ یہ مکان اس نے تقریباً چھ مہینے پہلے کرائے پر لیا تھا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو دیوار میں اس الماری کے صرف شیلف بنے ہوئے تھے آہنی دراز اور دروازے اس نے خود بنوائے تھے۔ یہ مکان بھی اس نے شعیب ہاشمی کے نام سے لیا تھا اور اپنے آپ کو ایک کاروباری آدمی ظاہر کیا تھا۔ ایک سال کا کرایہ اس نے ایڈوانس دے دیا تھا اور صرف ضرورت کی چیزیں ہی یہاں لا کر رکھی تھیں۔ وہ زیادہ تر گھر میں رہتا یا باہر۔ محلے والوں سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی اور وہ بھی اسے شعیب ہاشمی ہی کے نام سے جانتے تھے۔

اس نے مکان سے ہر وہ نشان مٹا دیا جس سے اسے شارق کی حیثیت سے شناخت کیا جا سکتا تھا۔ آخر میں اس نے الیاس کی لاش کی طرف دیکھا اور بیڈ روم سے سوٹ کیس اٹھا کر باہر آ گیا۔ دروازہ بند کر کے چابی اس نے برآمدے کی دیوار پر بجلی کے سوئچ پر ٹانگ دی اور سوٹ کیس اٹھا کر باہر آ گیا۔ گیٹ کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر اس نے اندر کا کنڈا لگا دیا باہر کا کنڈا یونہی کھلا رہنے دیا۔ گلی میں اس وقت تین چار چھوٹے بچے پتنگ اڑا رہے تھے۔ دو عورتیں ٹوکریاں ہاتھ میں اٹھائے غالباً سبزی گوشت لینے جا رہی تھیں۔

اور اس کی گردن چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ الیاس لڑھک کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔

شارق اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا دیر تک اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا' پھر اس نے شعلہ بار نگاہوں سے الیاس کی لاش کی طرف دیکھا اور اسے پیر سے ہلکی سی ٹھوکر مارتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔

وہ اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ الماری کھول کر ہینگر پر ٹنگے ہوئے کپڑوں کا ایک جوڑا نکالا اور پہنے ہوئے کپڑے اور جوتے اتار کر وہیں پھینک دیئے اور الماری سے نکالے ہوئے کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گیا۔ گرم پانی کے غسل سے اس کی تھکن بڑی حد تک دور ہو گئی۔ وہ لباس بدل کر باہر آ گیا۔

اس نے کچن میں جا کر چائے بنائی۔ خاصا کشادہ کچن تھا۔ چیزیں رکھنے کے لئے کیبنٹ بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف چھوٹا فریج بھی رکھا ہوا تھا جس میں دودھ اور ضرورت کی دیگر چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ چائے بنانے کے ساتھ ہی اس نے دوسرے چولہے پر دو انڈے ابالنے کو رکھ دیئے تھے۔

ابلے ہوئے انڈے چھیل کر اس نے پلیٹ میں رکھے انہیں دو دو ٹکڑوں میں کاٹا۔ ان پر نمک اور کالی مرچ چھڑکی۔ ایک کپ میں چائے انڈیلی اور دونوں چیزیں لے کر کچن کے سامنے ہی میز پر بیٹھ گیا اور بڑے اطمینان سے چائے کے ساتھ انڈے کے پیس کھانے لگا۔ جس جگہ وہ بیٹھا ہوا تھا وہاں سے الیاس کی لاش بھی نظر آ رہی تھی۔ مگر اس نے لاش کو اس طرح نظرانداز کر رکھا تھا جیسے اس مکان میں اس کا وجود ہی نہ ہو۔

انڈوں کی پلیٹ صاف کرنے اور چائے کا کپ خالی کرنے کے بعد وہ دوبارہ بیڈ روم میں گیا۔ کچھ دیر تک دیوار کے ساتھ استادہ لکڑی کی الماری کو دیکھتا رہا۔ جب اس نے کپڑے نکالے تھے تو اسی وقت اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ الماری کی تلاشی لی گئی تھی۔ اس نے الماری کو پکڑ کر آہستہ آہستہ اس کی جگہ سے تقریباً تین فٹ آگے کھسکا دیا۔ اس الماری کے پیچھے دیوار میں ایک اور ہضمی الماری تھی۔ اس الماری کا دروازہ آہنی چادر کا تھا۔ شارق چند لمحے بند آہنی دروازے کو دیکھتا رہا۔ اس میں تالوں کے دو سوراخ تھے۔ وہ الماری کے سامنے سے ہٹ کر بیڈ کے قریب گیا۔ پائنتی کی طرف سے بیڈ کو اٹھا کر اس کی جگہ سے تھوڑا سا ہٹا دیا۔ ایک پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا تھا جس میں چابیوں کا گچھا رکھا ہوا تھا۔ اس نے چابیوں کا گچھا اٹھا لیا اور دوبارہ آہنی دروازے والی الماری کے قریب آ گیا۔ اس نے دو چابیاں استعمال کرتے ہوئے آہنی دروازے کے

دونوں ہضمی قفل کھول کر الماری کھول دی۔

اس الماری کے اندر تین خانے بنے ہوئے تھے۔ تینوں خانے بند تھے۔ اس نے ایک چابی منتخب کر کے اوپر والا دروازہ کھولا۔ اس میں کرنسی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ گڈیاں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ دوسرے خانے میں ایک پستول رکھا ہوا تھا۔ مگر یہ پستول نہیں تھا' گن تھی جو سائز میں پستول سے خاصی بڑی تھی۔ چھوٹی رائفل اور پستول کے درمیان کی کوئی چیز تھی۔ یہ گن شارق نے ایک غیر ملکی اسمگلر سے خریدی تھی اور اسے بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ تیسرے خانے میں پلاسٹک کی تھیلیاں سلیقے سے نیچے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔ ان تھیلیوں میں سفید رنگ کا پاؤڈر بھرا ہوا تھا۔ یہ ہیروئن تھی۔

شارق کچھ دیر تک ان تینوں خانوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بیڈ کے نیچے سے سیمسونائٹ کا براؤن رنگ کا سوٹ کیس نکالا۔ پہلے اس میں ہیروئن کی تھیلیاں رکھیں۔ وہ تعداد میں پچیس تھیں۔ ہر تھیلی میں ایک کلو ہیروئن تھی۔ بین الاقوامی منڈی میں اس ہیروئن کی قیمت کروڑوں روپے ہو سکتی تھی۔ ہیروئن کی تھیلیاں رکھنے کے بعد اس نے ایک سائیڈ میں پستول رکھا پھر نوٹوں کی گڈیاں جمائیں اور دوسری الماری سے کپڑے نکال کر ان کے اوپر رکھنے لگا۔ لوہے کے دروازے والی الماری بند کر دی اور لکڑی کی الماری کو سرکا کر دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

اس نے سوٹ کیس بند کر دیا اور گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لینے لگا۔ یہ مکان اس نے تقریباً چھ مہینے پہلے کرائے پر لیا تھا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو دیوار میں اس الماری کے صرف شیلف بنے ہوئے تھے آہنی دراز اور دروازے اس نے خود بنوائے تھے۔ یہ مکان بھی اس نے شعیب ہاشمی کے نام سے لیا تھا اور اپنے آپ کو ایک کاروباری آدمی ظاہر کیا تھا۔ ایک سال کا کرایہ اس نے ایڈوانس دے دیا تھا اور صرف ضرورت کی چیزیں ہی یہاں لا کر رکھی تھیں۔ وہ زیادہ تر گھر میں رہتا یا باہر۔ محلے والوں سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی اور وہ بھی اسے شعیب ہاشمی ہی کے نام سے جانتے تھے۔

اس نے مکان سے ہر وہ نشان مٹا دیا جس سے اسے شارق کی حیثیت سے شناخت کیا جا سکتا تھا۔ آخر میں اس نے الیاس کی لاش کی طرف دیکھا اور بیڈ روم سے سوٹ کیس اٹھا کر باہر آ گیا۔ دروازہ بند کر کے چابی اس نے برآمدے کی دیوار پر بجلی کے سوئچ پر ٹانگ دی اور سوٹ کیس اٹھا کر باہر آ گیا۔ گیٹ کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر اس نے اندر کا کنڈا لگا دیا باہر کا کنڈا یونہی کھلا رہنے دیا۔ گلی میں اس وقت تین چار چھوٹے بچے پتنگ اڑا رہے تھے۔ دو عورتیں ٹوکریاں ہاتھ میں اٹھائے غالباً سبزی گوشت لینے جا رہی تھیں۔

شارق تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ اتفاق سے اسے فوراً ہی رکشہ مل گیا ور وہ رکشہ پر بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب رکشہ چھوڑ کر چند منٹ بعد شارق دوسرے رکشے پر بیٹھ گیا۔ اس مرتبہ وہ لوہاری چوک پر اترا تھا۔ رکشہ چھوڑ کر وہ سوٹ کیس اٹھائے پیدل ہی چلتا ہوا انارکلی میں داخل ہو گیا۔ تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک ذیلی گلی میں داخل ہو گیا۔ ایک ریسٹورنٹ کے سامنے وہ ایک لمحہ کو رکا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو آنکھ سے اشارہ کیا اور ریسٹورنٹ کے بالکل ساتھ ایک چھوٹے دروازے میں داخل ہو کر سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

سیڑھیوں کے اختتام پر دروازہ تھا جو اس وقت بند تھا۔ وہ دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا اس نے دستک دینے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ تقریباً دو منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ یہ وہی شخص تھا جو ریسٹورنٹ کے کاؤنٹر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور شارق نے سیڑھیوں والے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے اسے آنکھ کے گوشے سے مخصوص اشارہ کیا تھا۔ وہ شارق کا دوست سہیل تھا۔

"خیریت!" سہیل نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ شارق کا اشارہ پا ہوٹل کے اندرونی زینے سے اوپر آیا تھا۔ "لگتا ہے کسی لمبے سفر پر جانے کی تیاری کر کے آ ہو؟"

"نہیں۔" شارق اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ اس نے دروازہ بھی بند کر دیا۔ "پچھلی را میں بھینی میں تھا۔ ماجھا گجر کے ساتھ ایک چال چلنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام ہو گیا۔ مشکل سے جان بچا کر وہاں سے نکلا تھا۔ رات بھر بھاگتا رہا اور ماجھا گجر کے دو آدمی موت فرشتوں کی طرح میرا تعاقب کرتے رہے۔ میں ان سے بچ کر کسی طرح منڈی پہنچ گیا۔ لیکن انہ نے مجھے وہاں گھیر لیا۔ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ میں تو بچ گیا مگر ایک بے گناہ آدمی ان ہاتھوں مارا گیا اور میں وہاں سے بھاگ کر شام نگر والے مکان پر پہنچا تو ماجھے گجر کا ایک اور موت کے فرشتے کی طرح وہاں گھات لگائے بیٹھا ہوا تھا لیکن وہ میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کی وہیں پڑی ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اماں کے ہاں چلا جاؤں گا لیکن پھر یہاں آ گیا اور اب م از م دو تین روز یہاں رہنا ہو گا۔"

"اچھا کیا تم اماں کے ہاں نہیں گئے۔" سہیل نے کہا۔ "انہیں اس معاملے سے الگ ہی ہو گا۔ تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتے ہو۔ کسی کو یہاں تمہاری موجودگی کا پتہ نہیں چلے گا۔

"ناشتہ میں کر چکا ہوں۔ سونا چاہتا ہوں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔" شارق نے کہا۔

"ٹھیک ہے' تم سو جاؤ.... یہاں کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔" سہیل بولا۔

"اور یہ سوٹ کیس سنبھال کر رکھ لو۔" شارق نے سوٹ کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں ڈیڑھ کروڑ کی رقم' پچیس کلو ہیروئن اور آٹو گن ہے۔ میں یہاں آ تو گیا ہوں لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ میری وجہ سے تم کسی مصیبت میں نہ پڑ جاؤ۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" سہیل نے اسے گھورا۔ "جس روز میں نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا تو اس وقت میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ تمہاری دوستی میں فائدہ ہو گا یا نقصان۔ میں دوستی کا مفہوم اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اس لئے آئندہ تم اس قسم کی کوئی بات نہیں کرو گے۔ اب تم سو جاؤ.... میں نیچے ریسٹورنٹ میں جا رہا ہوں۔"

سہیل اندرونی دروازے سے نکل کر ریسٹورنٹ کے زینے کی طرف بڑھ گیا۔

شارق نے جوتے بھی نہیں اتارے اور بستر پر گر گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور ذہن ماضی کے پردے اٹھانے لگا۔

○

1965ء کی جنگ پاکستانی قوم کی پہلی آزمائش تھی۔ چھ ستمبر کی شب کبھی نہیں بھلائی جا سکے گی جب مکار بھارتیوں نے پاکستان کی سرحدوں پر شب خون مارا تھا۔ بھارتی حکمرانوں کا خیال تھا کہ اس کی سینا کے سورما راتوں رات آدھے پاکستان پر قبضہ کر لیں گے۔ یہی پلان بنا کر بھارتی فوج نے چاروں طرف سے پاکستانی سرحدوں پر نقب لگانے کی کوشش کی تھی۔ بھارتی فوج کے جرنیلوں نے تو یہ پروگرام بھی بنایا تھا کہ وہ دوسرے روز شام کو لاہور جم خانہ میں آزادی کا جشن منائیں گے۔ ان جرنیلوں نے بھارت کے وزیروں اور ہزاروں معززین کو لاہور جم خانہ میں شراب نوشی کے دعوت نامے بھی تقسیم کر دیئے تھے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ سوئے ہوئے شیر کو جب جھنجھوڑ کر جگایا جائے تو وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔

پاکستانی سرحدوں پر رات کے اندھیرے میں بھارتی فوجیوں کا حملہ ان سوئے ہوئے شیروں کو جھنجھوڑنے کے مترادف تھا۔ بھارتی جرنیلوں کا لاہور کے جم خانہ میں شراب پینے کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ رات کے اندھیرے میں وہ چند میل تک پاکستانی سرحدوں میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے ان کی پیش قدمی روک دی گئی۔

پاکستانی قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی۔ وہ ہر محاذ پر اس طرح ڈٹ گئے کہ بھارتی سینا کے سورماؤں کو اپنے جوتے اور دھوتیاں تک چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

ضلع سیالکوٹ میں چونڈہ نام کے اس قصبے کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے تھے لیکن ۶۵ کی جنگ نے اس قصبے کو وہ اعزاز بخشا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کا نام سنہری حروف میں رقم ہو گیا پہلے العالمین کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ اس کے ریگزاروں میں دنیا کی سب سے بڑی ٹینکوں کی جنگ لڑی گئی تھی لیکن چونڈہ نے العالمین کا یہ اعزاز چھین لیا۔ اس کے سرسبز و شاداب میدانوں میں ٹینکوں کی جو سب سے بڑی جنگ لڑی گئی اس کی مثال شاید آئندہ صدیوں کی تاریخ بھی پیش نہ کر سکے۔ اس جنگ کے دوران پاکستانی فوج کے جوانوں نے بہادری کے ایسے ایسے مظاہرے کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ دنیا بھر کے فوجی ماہرین نے پاکستانی فوج کو دنیا کی بہترین فوج تسلیم کر لیا۔

فضل الٰہی کا تعلق بھی چونڈہ ہی سے تھا۔ وہ چونڈہ کے نواح میں ایک چھوٹے سے گاؤں رہنے والا تھا۔ اس کی چند ایکڑ زمین تھی جو میدان جنگ بن گئی تھی۔ اس محاذ پر پاکستانی فوج جوانوں کے علاوہ دیہاتیوں نے بھی جرات و شجاعت کے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔

اس محاذ پر ٹینکوں کی لڑائی عروج پر تھی۔ ہزاروں ایکڑ اراضی پر کھڑی فصلیں ٹینکوں سے روندی جا چکی تھیں۔ کئی بستیاں تباہ ہو گئی تھیں۔ بھارتی فوج سول آبادیوں پر بھی بھرپور حملے کر رہی تھی۔ فضل الٰہی کے گاؤں کے کئی گھر تباہ ہو چکے تھے۔ اور بالآخر ایک گولہ اس کے مکان پر بھی آ کر لگا۔ فضل الٰہی کی بیوی' بیٹی اور سولہ سال کی عمر کا بیٹا شہید ہو گئے۔ اس کا بڑا بیٹا شفاعت علی زخمی ہو گیا۔ اس کی ٹانگ پر بم کا ٹکڑا لگا تھا۔ اس روز بستی کے تین اور مکانوں پر بھارتی توپوں کے بم گرے تھے جن سے کئی افراد شہید اور زخمی ہوئے تھے۔

پاکستانی فوج کے جوانوں نے زخمیوں اور زندہ بچ جانے والوں کو بستی سے نکال کر چونڈہ پہنچا دیا جہاں زخمیوں کو ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے کے بعد سیالکوٹ کے ہسپتالوں میں منتقل کر دیا۔

یہاں ایک نیا جذبہ دیکھنے میں آیا۔ ہزاروں شہری جنگ میں زخمی ہونے والے سویلین اور فوجیوں کی جانیں بچانے کے لئے خون کے عطیات دے رہے تھے۔ خون کے عطیات دینے کے لئے جو لوگ طویل قطاروں میں کھڑے تھے ان میں دس سال کے بچے سے لے کر اسی سال کے بوڑھے تک شامل تھے۔ اپنے وطن' وطن کے محافظوں اور ہم وطنوں سے محبت کا جذبہ انہیں یہاں لے آیا تھا۔

فضل الٰہی کا بیٹا شفاعت علی ہسپتال میں تھا اور وہ خود کسی کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ شخص اس کا رشتہ دار نہیں تھا۔ اگر کوئی رشتہ تھا تو اس سرزمین کی مٹی کا۔ دین کا.... سیالکوٹ کے باشندوں نے جنگ سے متاثرین کو کھلے ہاتھوں لیا تھا۔ انہیں اپنے گھروں میں پناہ دی تھی اور اپنوں کے ساتھ اپنوں جیسا سلوک کیا تھا۔ انہیں غیریت کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

سترہ روز کی اس جنگ میں پاکستانی قوم سرخرو ہو کر نکلی تھی اور پاکستانی افواج کے جوانوں نے اپنی بہادری کا سکہ منوا لیا تھا جبکہ بھارتی سورما اپنے زخم چاٹ رہے تھے۔

شفاعت علی ہسپتال ہی میں تھا۔ اس کی وجہ سے فضل الٰہی کو بھی شہر میں ہی رہنا پڑا۔ ایک روز جب وہ اپنے گاؤں گیا تو گاؤں کے بہت سے لوگ واپس آ چکے تھے اور ایک نئی ولولہ خیز زندگی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جو مکان بھارتی فوجوں کی گولہ باری سے منہدم ہو گئے تھے یا انہیں جزوی طور پر نقصان پہنچا تھا ان کی مرمت ہو رہی تھی اور ٹینکوں سے روندے ہوئے کھیتوں کو از سر نو تیار کیا جا رہا تھا۔

حکومت نے متاثرہ کاشتکاروں اور زمینداروں کو معقول معاوضہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ فضل الٰہی کا ایک بیٹے کے سوا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بیوی' بیٹی اور ایک بیٹے کو دفن کیا تھا۔ اس گاؤں سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

کچھ ہی عرصہ بعد اس نے اپنی زمین بیچ دی۔ چند روز سیالکوٹ میں رہا پھر بیٹے کو لے کر لاہور آ گیا۔ یہاں اسے اپنا پرانا دوست عبدالرحمٰن مل گیا۔ عبدالرحمٰن اسی گاؤں کے ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ ان دونوں کا بچپن اکٹھے ہی گزرا تھا۔ عبدالرحمٰن نے میٹرک چونڈہ ہی سے کیا تھا پھر وہ تعلیم کے سلسلے میں لاہور آ گیا جبکہ فضل الٰہی اپنے باپ کے ساتھ کھیتی باڑی میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔

عبدالرحمٰن نے اپنے باپ کے انتقال کے کچھ ہی عرصہ بعد اپنی اراضی بیچ دی اور لاہور ہی کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے شادی بھی یہیں کی تھی۔ فضل الٰہی جب بھی کسی کام کے سلسلے میں لاہور آتا اس سے ضرور ملتا تھا۔ عبدالرحمٰن ہمیشہ پیار اور خلوص سے ملا تھا اور اس مرتبہ تو اس نے زیادہ ہی جوش کا مظاہرہ کیا تھا۔

شفاعت کو میو ہسپتال لے جایا گیا۔ اسے ہسپتال میں داخلے کی ضرورت نہیں تھی۔ زخم بھر رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے احتیاط کے مشورے کے ساتھ استعمال کے لئے چند دوائیں بھی دے دی تھیں۔ ان کی رہائش عبدالرحمٰن ہی کے مکان پر تھی۔ تین مہینے گزر گئے۔ شفاعت بھی اب مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا۔ ٹانگ کی نسوں میں کھنچاؤ کی وجہ سے چال میں ذرا سی لنگڑاہٹ آ گئی تھی۔

ایک رات وہ سب لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ کھانے کے بعد حسب معمول حالات حاضرہ پر تبصرے ہو رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران موقع پا کر فضل الٰہی نے اپنے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"بھائی عبدالرحمٰن! تم جس طرح اس مشکل اور آڑے وقت میں ہمارے کام آئے ہو۔ جس طرح تم لوگوں نے ہمیں سہارا دیا ہے وہ احسان ہم زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔ لیکن اب یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم زندگی بھر تم پر بوجھ بنے رہیں۔ شفاعت بھی اب ماشاء اللہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ میرے بازوؤں میں بھی اتنی طاقت عود کر آئی ہے کہ ہم دونوں باپ بیٹے مل کر زندگی کی گاڑی کھینچ سکیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اب ہم لوگوں کو یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائے۔"

"سب سے پہلی بات تو یہ کہ تم لوگ ہم پر بوجھ نہیں ہو۔" عبدالرحمٰن نے کہا۔ "مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ ہم تمہاری خاطر خواہ خدمت نہیں کر سکے۔"

"نہیں بھئی۔" فضل الٰہی نے کہا۔ "خدمت تو تم لوگوں نے ہماری بہت کی۔ اللہ تم لوگوں کو اس کی جزا ضرور دے گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ "زمین کی فروخت سے مجھے جو رقم ملی تھی وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں موقع کی دکان تلاش کر کے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دوں۔"

"مناسب خیال ہے۔" عبدالرحمٰن نے کہا۔ "تو پھر تلاش کیجئے کوئی دکان۔ اگر مزید رقم کی ضرورت ہے تو میں حاضر ہوں۔"

"نہیں بھئی.... تم لوگوں کا یہ احسان پہلے ہی کیا کم ہے کہ...."

"رحمٰن ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی صاحب۔" عبدالرحمٰن کی بیوی نے فضل الٰہی کی بات کاٹ دی۔ "رقم کچھ کم پڑ جائے تو آپ بلا تکلف لے لیجئے۔ جب حالات بہتر ہو جائیں تو لوٹا دیجئے۔"

"میں کوشش کروں گا کہ میری جتنی چادر ہے اتنے ہی پیر پھیلاؤں' لیکن اگر ضرورت پڑی تو میں بتا دوں گا۔" فضل الٰہی نے کہا۔

دوسرے ہی روز دکان کی تلاش شروع ہو گئی۔ شہر کے مختلف علاقوں میں بہت سی دکانیں دیکھی گئیں لیکن بھاٹی چوک پر ایک دکان پسند آ گئی۔ یہ دکان چوک کے کارنر پر واقع عمارت کے کارنر پر تھی۔ خاصی بڑی دکان تھی اور کرایہ بھی معقول تھا۔ فضل الٰہی نے اس علاقے کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اگر یہاں پھلوں کی دکان کھولی جائے تو خوب چلے گی کیونکہ چوک کے آس پاس پھلوں کی کوئی دکان نہیں تھی۔ بعض لوگ فٹ پاتھ پر ٹوکروں میں پھل لئے بیٹھے تھے۔ ایسی جگہوں پر عام لوگ تو چیز خرید سکتے تھے لیکن معززین جھجکتے تھے۔ اس لئے فضل الٰہی نے اچھے انداز میں پھلوں کی دکان کھلوانے کا ہی فیصلہ کیا تھا۔

زمین کی فروخت سے اسے معقول رقم ملی تھی۔ دکان لینے کے بعد بھی خاصی رقم بچ گئی

تھی۔ دکان کے سامنے تھوڑی سی جگہ گھیر کر لکڑی کا اونچا تھڑا بنا لیا گیا تھا۔ جس پر تازہ پھلوں کے ٹوکرے اور پیٹیاں سجا دی گئیں جبکہ اندر کے حصے میں شیلف وغیرہ بنا کر شیشے کے خوبصورت مرتبانوں میں خشک میوے سجا دیئے گئے۔ دکان کی ڈیکوریشن ایسی تھی کہ گاہک خود بخود کھنچا چلا آتا تھا۔

دکان خوب چل نکلی تھی۔ چند روز تو وہ عبدالرحمٰن کے گھر پر رہے پھر اندرون لوہاری ایک مکان کرائے پر لے کر وہاں منتقل ہو گئے۔ یہاں سے انہیں دکان قریب پڑتی تھی۔ ان کی دکان خوب چل نکلی تھی۔ ان کے گاہکوں میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کا شمار علاقے کے معززین میں ہوتا تھا۔ فضل الٰہی صبح سویرے منڈی سے مال لے کر آتا اور دوکان سیٹ کر کے شفاعت کے حوالے کر کے خود داتا دربار چلا جاتا جو وہاں سے صرف چند گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کا زیادہ وقت داتا دربار ہی میں گزرتا تھا۔

لوہاری گیٹ کے اندر محلہ حویلیاں کے کوچہ لالہ ہرنام داس میں جو مکان انہوں نے کرائے پر لیا تھا وہ نان چھولے بیچنے والے ایک آدمی امیر علی کی ملکیت تھا۔ وہ بھاٹی چوک پر دکان لگایا کرتا تھا۔ فضل الٰہی سے دوستی ہو گئی تھی اس لئے مکان بہت کم کرائے پر مل گیا تھا۔ یوں بھی امیر علی کا کوئی نہیں تھا۔ وہ اس دنیا میں بالکل اکیلا تھا اور اسے پیسے کی ہوس بھی نہیں تھی۔ اس کا باپ قیام پاکستان کے وقت ہندوستان سے ہجرت کر کے آیا تھا اور یہ مکان اس نے کلیم میں حاصل کیا تھا۔

پرپیچ اور تنگ سی گلیوں میں اس مکان والی گلی تو اور بھی تنگ تھی۔ تین آدمی پہلو بہ پہلو نہیں چل سکتے تھے۔ اس مکان کے دروازے کے عین سامنے گلی کا موڑ تھا۔ مکان میں داخلے کے دروازے کے ساتھ ہی بیٹھک کا دروازہ تھا۔ مکان کے دروازے کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ مکان اندر سے بھی چھوٹا ہو گا لیکن اندر سے یہ مکان بے حد وسیع و عریض تھا۔ دروازے کے دوسری طرف سرخ اینٹوں کا کشادہ آنگن تھا جس میں بیس پچیس چارپائیاں بچھ سکتی تھیں صحن کے دوسری طرف طویل برآمدہ تھا۔ اس برآمدے میں چار کمروں کے دروازے تھے۔ بیچ میں ایک راہداری تھی۔ اس راہداری میں بھی کمرے تھے۔ کمروں کی تعداد مجموعی طور پر آٹھ تھی۔ بڑے کشادہ کمرے تھے۔ فضل الٰہی کو اتنے بڑے مکان کی ضرورت نہیں تھی لیکن کم کرائے پر مل گیا تھا اسلئے اس نے لے لیا۔

ان کے سامنے والے مکان میں ظہور نامی ایک صاحب رہتے تھے۔ ظہور بھی فضل الٰہی کا ہم عمر تھا۔ وہ برانڈرتھ روڈ پر مشینری کی ایک دکان پر مینجر تھا۔ اس کی ساری زندگی اسی دکان پر

ملازمت کرتے ہوئے گزر گئی تھی۔ وہ بہت خوش اخلاق اور ہنس مکھ آدمی تھا۔ ظہور کا مکان چھ
تھا۔ ایک بیٹھک دو کمرے۔ آنگن بھی مختصر تھا۔ اس کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹی بیاہی جا چ
تھی اور مصری شاہ میں رہائش پذیر تھی۔ بیٹا بھی شادی شدہ تھا وہ فضل الٰہی کے بیٹے شفاعت سے
عمر میں تین چار سال بڑا تھا اور ایک بچے کا باپ تھا۔

فضل الٰہی عشاء کی نماز داتا دربار میں پڑھنے کے بعد گھر آ جاتا جبکہ شفاعت دیر تک دکا
کھولے بیٹھا رہتا۔ بھائی....لاہور کا دل....یوں لگتا تھا جیسے اس علاقے میں کبھی رات ہوتی ہی
ہو۔ رات کو بھی دن کا سا سماں رہتا۔

محلے کے بعض لوگوں نے فضل الٰہی کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ ان میں زیادہ لوگ فضل
الٰہی کے ہم عمر تھے جو رات دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ ایک رات ظہور اور گلی کے تین لو
آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں شیر محمد نے شفاعت
شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"ارے بھائی! بیٹے کی شادی کب کرو گے۔ اب تو ماشاء اللہ تمہارا کاروبار بھی سیٹ ہو
ہے۔ میرا تو مشورہ ہے کہ اب شفاعت کی شادی کر ہی ڈالو۔ بہو گھر میں آئے گی تو تمہیں بھی کچھ
آرام مل جائے گا۔ ایک طرف بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے رہنا۔"

"بات تم نے چھیڑی ہے تو تم خود ہی اس کے لئے کوئی رشتہ بھی ڈھونڈ نکالو۔ شفاعت
بھتیجا کہتے ہو۔ تمہارا بھی تو کچھ فرض بنتا ہے۔" فضل الٰہی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چلو' ٹھیک ہے۔" شیر محمد نے جواب دیا۔ "ویسے ایک لڑکی ہے میری نظروں میں۔ یتیم لڑ
ہے' خوبصورت اور سلیقے والی ہے۔ میں اس کے باپ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ بہت شریف آد
تھا۔ اب دونوں ماں بیٹی اکیلی ہیں' آگے پیچھے کوئی بھی نہیں ہے ان کا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' تم ہی بات شروع کرو۔" فضل الٰہی نے کہا۔

اس طرح شفاعت علی کے رشتے کے لئے سلسلہ جنبانی شروع ہو گیا۔ وہ لوگ کاچھوپورہ میں
رہتے تھے۔ فضل الٰہی شیر محمد کے ساتھ جا کر لڑکی بھی دیکھ آیا۔ لڑکی اسے پسند آئی تھی۔ ایک
سال پہلے اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے دو مکان تھے' ایک میں ان ماں بیٹی کی اپنی
رہائش تھی اور دوسرا کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ اسی کے کرائے سے گھر کے اخراجات چل رہے تھے۔
لڑکی کی ماں سلائی کا کام بھی کرتی تھی جس سے کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔

بات پکی ہو گئی اور پھر چند ہی روز بعد شفاعت کی شادی ہو گئی۔ سکینہ بڑی بھاگوان ثابت
ہوئی۔ اس کے آنے کے تین مہینے بعد فضل الٰہی نے وہ دکان خرید لی جس میں کاروبار کر رہا تھا۔

اور پھر سکینہ نے جب ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا تو فضل الٰہی خوشی سے پھولا نہیں سمایا
اس نے پوتے کا نام شارق رکھا۔ شارق اپنی ماں سے بھی زیادہ بھاگوان ثابت ہوا۔ وہ ابھی تین
ہی کا تھا کہ مکان کا مالک امیر علی بیمار پڑ گیا۔ پہلے تو وہ چھوٹے چھوٹے ڈاکٹروں سے علاج کرواتا
لیکن بیماری بڑھتی گئی۔ اور بالآخر جب اس نے میو ہسپتال جا کر معائنہ کرایا تو انکشاف ہوا کہ
کے نہ صرف جگر میں زخم ہو گیا تھا بلکہ ایک گردہ بھی ناکارہ ہو رہا تھا۔

امیر علی اکیلا آدمی تھا۔ اسے پیسے کی ہوس نہیں تھی۔ قناعت پسند آدمی تھا۔ کبھی کچھ بچا کر
نہیں رکھا تھا۔ جو کچھ بچایا تھا وہ بیماری پر خرچ ہونے لگا اور بالآخر وہ اندوختہ بھی ختم ہو گیا تو
نے فضل الٰہی کے ہاتھ وہ مکان بیچ دیا۔

فضل الٰہی کو وہ مکان بہت سستا مل گیا تھا۔ فضل الٰہی نے وہ مکان شفاعت کے نام ٹرانسفر
دیا۔ اس کے چند ہفتوں بعد فضل الٰہی سڑک پار کرتے ہوئے ڈبل ڈیکر بس کی زد میں آ کر
بد زخمی ہو گیا۔ اسے فوراً میو ہسپتال پہنچا دیا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا اور تین دن بعد خالق
سے جا ملا۔

فضل الٰہی کے انتقال کے بعد شفاعت علی اداس رہنے لگا۔ اس کی بیوی سکینہ حوصلہ مند
ت تھی۔ وہ اس کی ڈھارس بندھاتی رہتی۔ شفاعت نے 65ء والی جنگ میں ہولناک مناظر
، تھے۔ سینکڑوں لوگوں کو خاک و خون میں لوٹتے دیکھا تھا۔ اپنی ماں' بہن اور بھائی کی خون میں
پت لاشیں دیکھی تھیں۔ وہ خود بھی زخمی ہوا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کا دل زخموں سے
تھا۔ وقت نے وہ زخم تو مندمل کر دیئے تھے لیکن اب باپ کی موت سے دل پر ایک اور زخم
۔ یہ تازہ زخم کچھ عرصہ تک تکلیف کا باعث رہا اور پھر آہستہ آہستہ یہ بھی مندمل ہونے لگا۔
سامنے والے پڑوسی ظہور سے اب بھی ان کی بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ لیکن ظہور کا پوتا
جو ان دنوں بی اے میں زیر تعلیم تھا' کچھ مختلف قسم کا انسان تھا۔ اخلاق تو جیسے اسے چھو کر
گزرا تھا۔ دوسروں سے ہمیشہ اکھڑ لہجے میں اور بدتمیزی سے بات کرتا۔ اس کے باپ نے
اسے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہونے نہیں دی لیکن دوسروں کے پاس کوئی اچھی چیز دیکھ کر
تا تھا۔ شکل میں بھی وہ بہت بدہیئت آدمی تھا۔ گینڈے جیسا بے ڈول جسم' تنگ سی پیشانی اور
چھوٹی آنکھیں جن میں مکاری جھلکتی تھی۔ طوطے جیسی خمیدہ ناک اور پیلے دانت' جیسے اس
بھی دانتوں کی صفائی نہ کی ہو۔

نجانے کیا بات تھی کہ شفاعت علی اور اس کے گھر والوں سے وہ جلنے لگا تھا۔ ان سے کبھی
نے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ کبھی سلام تک نہیں لیا تھا۔ محلے کے دوسرے لوگوں سے

بھی اس کا رویہ ایسا ہی تھا اور یہ اس کی فطرت کے عین مطابق تھا۔

فضل الٰہی نے جب یہ مکان خریدا تو سلمان کے باپ نے بڑے خلوص سے اسے مبارک دی تھی لیکن سلمان نے بڑی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ فضل الٰہی کے انتقال کے بعد تو وہ شفاعت علی کا جیسے دشمن ہو گیا تھا۔

سکینہ ایک سگھڑ اور سلیقہ مند لڑکی تھی۔ اس نے گھر سنبھال لیا۔ لیکن فضل الٰہی کے انتقال کے بعد وہ کچھ بیمار سی رہنے لگی تھی۔ شفاعت علی نے سکینہ اور شارق کی دیکھ بھال اور گھر کے کام کاج کے لئے ایک عورت رکھ لی۔ مریم نامی اس عورت کا گھر تیسری گلی میں تھا اس کا شوہر تانگہ چلاتا تھا اور وہ خود گھروں میں کام کرتی تھی۔ وہ عمر میں سکینہ سے دو تین سال بڑی تھی۔ اس کا بیٹا پیدائش کے چند ماہ بعد انتقال کر گیا تھا اور اب عرصہ سے اس کی گود خالی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ شارق پر زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ شارق بھی اس سے بہت زیادہ مانوس ہو گیا تھا۔

مریم کو اگرچہ جزوقتی طور پر ملازم رکھا گیا تھا مگر سکینہ اور شارق سے کچھ ایسا لگاؤ ہوا کہ اس نے دوسرے گھروں کا کام چھوڑ دیا اور زیادہ وقت اسی گھر میں گزارنے لگی۔ وہ رات کو بھی دیر تک رہتی اور کبھی تو رات بھی یہیں گزار دیتی۔

تقریباً دو سال بعد مریم نے بھی ایک بچی کو جنم دیا۔ اس کا نام رضیہ رکھا گیا۔ رضیہ کی پیدائش کے چند ہی روز بعد اس کا باپ لکشمی چوک پر ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ اس وقت اس کے تانگے میں سواریاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ تانگہ لے کر نسبت روڈ سے میکلوڈ روڈ کی طرف جانے کے لئے لکشمی چوک پر مڑا ہی تھا کہ ایک تیز رفتار اومنی بس نے تانگے کو کچل دیا۔ رضیہ کا باپ اور تانگے کی دو سواریاں تو فوراً ہی جاں بحق ہو گئی تھیں اور باقی چار مسافر، جن میں دو عورتیں بھی شامل تھیں، شدید زخمی ہوئے تھے جنہیں میو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

محلے والوں نے مریم سے صرف اتنی ہمدردی کی کہ اس کے شوہر کا جنازہ اٹھا کر لے گئے۔ چار روز تک محلے والوں کی طرف سے ہمدردانہ خیالات کا اظہار ہوتا رہا اور پھر لوگ اسے بھول گئے۔ مگر سکینہ اور شفاعت اسے نہیں بھولے تھے۔

سکینہ اور شفاعت نے مریم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا مکان چھوڑ کر ان کے گھر منتقل ہو جائے۔ لیکن وہ اپنا گھر چھوڑنے کو تیار نہیں تھی، لیکن بہرحال اس کے تمام اخراجات شفاعت ہی برداشت کر رہا تھا۔

شارق اور رضیہ کی پرورش ایک ساتھ ہو رہی تھی۔ شفاعت جو چیز اپنے بیٹے کے لئے لاتا وہی چیز رضیہ کے لئے بھی لے کر آتا۔ ان دونوں میاں بیوی نے مریم کو کبھی کسی چیز کی کمی

محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

ان کی زندگی بڑے اطمینان و سکون سے گزر رہی تھی لیکن یوں لگتا تھا جیسے وقت کو ان کی خوشیاں پسند نہ ہوں۔ ان کے سامنے والے گھر میں رہنے والے ظہور کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ سلمان وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد ضلع کچہری میں پریکٹس شروع کر چکا تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ ایک سینئر وکیل کے ساتھ اٹیچ رہا پھر اس نے انڈی پینڈنٹ ہو کر پریکٹس شروع کر دی۔ اس نے کچہری کے احاطے میں ایک بیٹھ بھی لے لیا تھا۔ جہاں ایک میز کرسی لگا دی گئی تھی۔

سلمان نہایت کمینہ فطرت آدمی تھا۔ کسی کے ساتھ بھلائی کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ البتہ اپنے فائدے کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچانے کے چکر میں رہتا تھا۔ ویسے تو اس کی پریکٹس برائے نام ہی چلتی تھی لیکن جعلی دستاویزات کی تیاری کی سلسلے میں وہ خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس کے پاس زیادہ تر ایسے ہی لوگ آتے تھے جو جعل سازی سے اپنا کام کروانا چاہتے تھے۔

سلمان کو شفاعت علی سے بھی بڑی پرخاش تھی۔ جب یہ مکان فضل الٰہی نے امیر علی سے خریدا تھا تو اس کی سینے پر سانپ لوٹ کر رہ گئے تھے۔ اسے تو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ اتنا بڑا مکان امیر علی کے باپ کو کلیم میں کیسے مل گیا تھا۔ اور اب سلمان کو ان کے خلاف کچھ کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ خود بھی وکیل بن کر جعلی دستاویزات کی تیاری میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔

سلمان نے متعلقہ محکمہ کو یہ درخواست دے دی کہ امیر علی کے باپ نے جھوٹا کلیم داخل کر کے یہ مکان حاصل کیا تھا جو بعد میں فضل الٰہی نے شفاعت علی کے نام اونے پونے خرید لیا تھا۔ اس درخواست میں اس نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ یہ مکان دراصل اس کے خاندان کی ملکیت ہے۔ اس کی درخواست کے مطابق عرصہ پہلے اس کا اپنا مکان اور شفاعت والا مکان دراصل ایک ہی مکان تھا لیکن اس طرف گلی نکالنے کے لئے اس مکان کو توڑ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ شفاعت والے مکان کا حصہ مختلف لوگوں کو کرائے پر دیا جاتا رہا۔ آخر میں ایک ہندو کرائے دار تھا جو 47ء کے فسادات کے دوران ہندوستان چلا گیا اور اس مکان پر امیر علی کے باپ نے قبضہ کر لیا اور جھوٹا کلیم داخل کر کے اسے اپنے نام الاٹ کروا لیا۔ سلمان نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کچھ دستاویزات بھی پیش کی تھیں جو ظاہر ہے جعلی تھیں۔

کیس طویل عرصہ تک عدالت میں چلتا رہا اور بالآخر فیصلہ شفاعت کے حق میں ہوا۔ عدالت کے اس فیصلے پر سلمان تلملا اٹھا۔ اس نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی اور اس طرح یہ کیس دوبارہ شروع ہو گیا۔ سلمان نے متعلقہ محکمہ کے بددیانت آدمیوں سے مل کر اس مکان کی ملکیت

کے بارے میں کچھ رد و بدل بھی کروا لیا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا سلمان کی حرامزدگی سے کیس میں پیچیدگی پیدا ہوتی چلی گئی اور اس طرح یہ سیدھا سادہ معاملہ الجھنوں کا شکار ہو کر برسوں پر محیط ہوتا چلا گیا۔

شفاعت علی کا بیٹا شارق بارہ سال کا ہو چکا تھا۔ وہ سرخ و سفید رنگ کا گول مٹول' پیارا سا بچہ تھا۔ وجاہت کے ساتھ خدا نے اسے ذہانت بھی خوب دی تھی۔ پڑھنے لکھنے میں اسے بڑی دلچسپی تھی۔ عمر کے لحاظ سے اسے چھٹی کلاس میں ہونا چاہئے تھا لیکن اس نے دو مرتبہ ڈبل پرموشن لی تھی اور اب آٹھویں کلاس میں تھا۔ پڑھائی کے علاوہ وہ باپ کے کاروبار میں بھی خاصا مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اسکول سے چھٹی کر کے آتا تو سب سے پہلے گھر میں بیٹھ کر اپنا ہوم ورک کرتا پھر دکان پر چلا جاتا۔ دکان سے واپس آنے کے بعد شارق کچھ دیر آرام کرتا اور پھر پڑھنے کے لئے بیٹھ جاتا۔ سکینہ بھی میٹرک پاس تھی۔ وہ بھی بیٹے کی پڑھائی میں دلچسپی لیتی اور فارغ وقت میں اسے پڑھاتی رہتی۔ مریم کی بیٹی رضیہ دس سال کی ہو چکی تھی۔ وہ پانچویں کلاس میں تھی۔ شام کو وہ بھی شارق کے ساتھ بیٹھ کر پڑھتی رہتی۔

وہ سردیوں کا موسم تھا۔ بارشیں شروع ہونے والی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے مکانوں کی چھتیں وغیرہ مرمت کروا رہے تھے تاکہ بارش میں مکان کو نقصان نہ پہنچ سکے۔

قدیم شہر کے مکانات صدیوں پرانے تھے۔ کچھ لوگوں نے تو پرانے مکان تڑوا کر ان کی جگہ نئے مکان بنوا لئے تھے۔ لیکن اسی فیصد مکان اب بھی ایسے ہی تھے جنہیں آثار قدیمہ میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ بعض مکان تو کھنڈروں کا منظر پیش کرتے تھے لیکن ان میں بھی لوگ رہائش پذیر تھے۔ ہر سال بارشوں کے موسم میں کئی مکان گرتے تھے اور کئی جانیں ضائع ہوتی تھیں۔

اس مرتبہ بارش بھی قیامت خیز ہوئی تھی۔ مسلسل تین دن سے جاری رہنے والی موسلا دھار بارش نے زندگی کا سارا نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ شہر کی سڑکیں کئی کئی فٹ پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور نہروں اور دریاؤں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ نشیبی علاقے تو مکمل طور پر پانی میں ڈوب گئے تھے پانی گھروں میں گھس آیا تھا۔ جن کے مکان دو منزلہ تھے وہ لوگ اوپر والی منزل پر منتقل ہو گئے تھے۔

اس طوفانی بارش سے زندگی کا تمام کاروبار معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ شفاعت بھی تین دن سے گھر میں بند تھا۔ مریم بھی ان دنوں اپنی بیٹی کے ساتھ انہی کے گھر میں تھی۔ ان تین دنوں کے دوران اسے گھر سے باہر نکلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور پھر تیسرے دن چار بجے کے قریب مریم کی گلی میں رہنے والے ایک آدمی نے آ کر اسے اطلاع دی کہ مریم کے مکان کے ایک کمرے کی

ر گئی ہے۔ مریم سر پیٹ کر رہ گئی۔

غاعت برستی بارش میں مریم کو ساتھ لے کر اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ تنگ گ سے گزرتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ کوئی مکان ان کے اوپر نہ آ رہے۔ وہ بڑی مشکل م کے گھر تک پہنچ سکے تھے۔

ریم کا مکان صرف دو کمروں پر مشتمل تھا اور سامنے مختصر سا صحن۔ مکان بہت قدیم تھا اس روں کی اینٹیں بھربھری ہو چکی تھیں۔ چھت اس کمرے کی گری تھی جس میں مریم اپنی بیٹی اتھ سویا کرتی تھی۔ یہ ان دونوں ماں بیٹی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ پچھلے تین دن سے کے گھر میں تھیں اگر وہ اپنے گھر میں ہوتیں تو چھت کے ملبے کے نیچے دب کر ختم ہو چکی

رش اگرچہ اب بھی تیز تھی لیکن محلے کے چند آدمی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ملبے ، بچا کھچا سامان نکال کر دوسرے کمرے میں پہنچا دیا۔ لیکن بارش کی وجہ سے بہت سا سامان چکا تھا۔

رش کا زور تیسرے روز آدھی رات کے بعد ہی ٹوٹا تھا۔ دو دن بعد جب بارش تھم گئی اور نے کے بعد آسمان پر سورج چمکنے لگا تو مریم بھی اپنے گھر آ گئی۔ گھر میں بھرا ہوا پانی نکالنے ں سنبھالنے میں اسے دو دن لگ گئے۔

ریباً دو مہینے بعد کمرے کی نئی چھت ڈالی گئی۔ اس دوران مریم دوسرے کمرے میں رہ رہی لینہ اور شفاعت نے بے حد اصرار کیا تھا کہ وہ ان کے گھر میں رہے لیکن اس نے اپنے ہی رہنے کو ترجیح دی تھی۔

کان کے مسئلے پر شفاعت کا مقدمہ ہائی کورٹ میں چل رہا تھا۔ ایک سال اور گزر گیا۔ جعل سازیوں اور چالاکیوں سے مقدمے کی کارروائی طول پکڑتی گئی۔

سردیوں کی ایک ٹھٹھری ہوئی شام تھی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ تیز ہوا سے یں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ موسم کے تیور بتا رہے تھے کہ بارش کسی بھی وقت شروع تھی۔ اور اس سے سردی کی شدت میں مزید اضافے کا امکان تھا۔ بازاروں کی رونق سر اجڑنے لگی تھی۔ بھاٹی چوک پر بھی اس شام روزانہ جیسی رونق نہیں تھی۔ پان کی دکانوں نے اور ایک دو ریستورانوں میں کچھ منچلے بیٹھے ہوئے تھے۔

غاعت بھی دکان کھولے بیٹھا تھا۔ وہ عام طور پر رات ساڑھے بارہ بجے تک دکان کھولے یکن اس رات دس بجے کے قریب ہلکی بوندا باندی شروع ہوئی تو اس نے دکان بند کر دی

اور گھر آ گیا۔ شارق اس وقت تک جاگ رہا تھا۔

شفاعت' سکینہ اور شارق نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے تھوڑی دیر بعد سکی چائے بنا لی۔ اس دوران بارش کسی حد تک تیز ہو چکی تھی۔ سکینہ نے کمرے کا دراوزہ بھیڑ وہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ شارق تو جلد ہی اپنے پلنگ پر جا کر سو گیا اور شفاعت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بارش کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ صحن میں چھت کے سے پانی گرنے کی آواز سے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی آبشار گر رہا ہو۔

بارہ بجے کے لگ بھگ وہ بھی سونے کے لئے لیٹ گئے۔ سکینہ باتیں کرتے کرتے سو شفاعت لیٹا سوچ رہا تھا کہ دو دن بعد اسے مکان کے مقدمے میں پیشی کے لئے ہائی کورٹ پچھلی پیشی سے اب تک اس نے بڑی بھاگ دوڑ کر کے یہ پتہ چلا لیا تھا کہ سلمان مقدمے کی کارروائی کے دوران کیا کیا حرامزدگیاں کی تھیں۔ مکان کے سلسلے میں اصل دستا کہاں غائب کر دی تھیں۔ متعلقہ محکمہ کے جس کلرک نے سلمان سے رشوت لے کر دستاویزات غائب کی تھیں اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ وہ حق دار کے ساتھ ناانصافی کر رہا اس نے شفاعت سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اصل دستاویزات لے کر اس پیشی پر خود عدالت میں دے گا بلکہ یہ بیان بھی دے گا کہ مقدمہ ہی جھوٹا ہے اور سلمان نے اس سلسلے میں جتنی دستاویزات عدالت میں پیش کی ہیں وہ جعلی اور جھوٹی ہیں۔ شفاعت کو یقین تھا کہ متعلقہ کے بیان اور اصل دستاویزات سامنے آ جانے سے کیس کا رخ بدل جائے گا اور زیادہ سے مزید ایک دو پیشیوں میں مقدمے کا فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے گا۔ وہ دعا مانگ رہا تھا کلرک اپنے وعدے سے نہ پھر جائے۔

کمرے میں ہلکے نیلے رنگ کا نائٹ بلب روشن تھا۔ اس نے دیوار گیر کلاک کی طرف دو بج رہے تھے۔ آج نجانے اسے نیند کیوں نہیں آ رہی تھی حالانکہ وہ دکان سے آنے کے جلد ہی سو جایا کرتا تھا۔ لیکن آج نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے ہی پلنگ پر سوئی ہوئی سکینہ کی طرف دیکھا۔ نیلگوں روشنی میں وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین رہی تھی۔ بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ شفاعت اس کے چہرے سے بال ہٹا۔ رخساروں پر اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کر کے سکینہ کی آنکھ کھل گئی۔

"ارے! آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ کیا وقت ہوا ہے؟" سکینہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"دو بج چکے ہیں۔ پتہ نہیں نیند کیوں نہیں آ رہی۔" شفاعت نے جواب دیا۔

سکینہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ باہر سے دھب کی آواز سنائی دی۔ تیز بارش کے باد

ان دونوں نے صاف طور پر سنی تھی۔

"شاید باہر کوئی ہے۔" سکینہ نے سرگوشی کی۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا خوف تھا۔

"اس موسلا دھار بارش میں کون ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے پڑوسی کے کسی مکان کی دیوار ہے۔ آواز اسی کی ہو سکتی ہے۔" شفاعت نے جواب دیا۔

اسی لمحہ دھب دھب کی دو اور آوازیں سنائی دیں۔

"باہر کوئی ہے شفاعت۔" سکینہ نے پھر سرگوشی کی۔ اس مرتبہ اس کے لہجے میں خوف پہلے زیادہ نمایاں تھا۔ "لگتا ہے جیسے کئی آدمی دیوار سے کودے ہیں۔"

"تمہارا وہم ہے' پھر بھی میں دیکھ لیتا ہوں۔" شفاعت کہتے ہوئے لحاف میں سے نکل آیا۔ دھب دھب کی آوازوں سے اسے بھی یہی شبہ ہوا تھا کہ جیسے دو تین آدمی دیوار سے ے ہوں' لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پڑوس کے کسی مکان کی دیوار تیز بارش کی وجہ سے گر ہو۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ باہر گہری تاریکی تھی اور تیز بارش ہو رہی تھی۔ شفاعت نے نکل کر کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا اور برآمدے میں کھڑا تیز بارش اور تاریکی میں ادھر ادھر دیکھنے دفعتاً" اسے یوں محسوس ہوا جیسے بیرونی دروازے کے قریب کوئی سایہ تیزی سے بیٹھک کی کی آڑ میں ہوا ہو۔

شفاعت بارش کی پرواہ کئے بغیر برآمدے سے نکل کر بیٹھک کی طرف بڑھنے لگا۔ آنگن میں بھرا ہوا تھا۔ چلنے سے شڑاپ شڑاپ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ بیٹھک کے قریب پہنچ کر وہ گیا۔

"کون ہے' اس طرف کون ہے؟" اس نے آواز میں رعب پیدا کرنے کی کوشش کرتے ئے کہا۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ عقب سے شڑاپ کی آواز سن کر زی سے پلٹا' لیکن اسے کچھ دیر ہو چکی تھی اس کے پیچھے دو قدم پر کھڑا ہوا ایک نقاب پوش نل کو نال کی طرف سے پکڑے لٹھ کی طرح اس پر وار کر چکا تھا۔ شفاعت اگر نہ مڑتا تو یہ وار کے سر پر پڑتا لیکن اب رائفل کا بٹ کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے دائیں کندھے پر لگا وہ چیختا ہوا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اسی لمحے ایک اور سایہ دیوار کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اس نے خنجر کا بھرپور وار کیا' خنجر دستے تک شفاعت کے شانے میں ت ہو گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی دوسری چیخ پہلی سے زیادہ خوفناک تھی۔ اسی لمحہ بادل جے' اس کی چیخ تیز بارش اور بادلوں کی گرج میں دب گئی۔ لیکن کمرے میں پلنگ پر لیٹی ہوئی

سکینہ نے شوہر کے چیخنے کی آواز سن لی تھی۔ وہ اٹھ کر ننگے پیر کمرے سے باہر آئی اور بیٹھک قریب دو سیاہ پوشوں کو اپنے شوہر پر حملہ کرتے دیکھ کر چیختی ہوئی اس طرف دوڑی۔ ابھی وہ پہنچی ہی تھی کہ ایک اور سیاہ پوش بیٹھک کی دیوار کی آڑ سے نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی تھا۔ اس نے سکینہ پر خنجر سے حملہ کر دیا۔ خنجر سکینہ کے پہلو میں لگا۔ اس کے منہ سے چیخ گئی لیکن زخمی ہونے کے باوجود وہ اپنے شوہر کو بچانے کے لئے آگے دوڑی۔

حملہ آور دوبارہ اس کی طرف لپکا۔ سکینہ اپنے شوہر کو دوسرے حملہ آور سے بچانے کوشش میں اس سے لپٹ گئی۔ دوسرے حملہ آور نے پھر اس پر خنجر سے حملہ کر دیا۔ اس م خنجر اس کے شانے پر لگا۔ تیسرا سیاہ پوش، جس کے پاس رائفل تھی، رائفل کو لٹھ کی طرح گھما کر ان پر حملے کر رہا تھا۔

وہ دونوں میاں بیوی چیختے رہے اور حملہ آور خنجروں سے ان پر پے در پے وار کرتے رہے وہ دونوں زخموں سے چور ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر اور مدد کے لئے چیختے رہے مگر ان کی چیخیں بادلوں کی گھن گرج، بجلی کی کڑک اور بارش کے ش میں دبتی رہیں۔

شارق چیخوں کی آوا سن کر اٹھ گیا تھا۔ اس نے دوسرے پلنگ کی طرف دیکھا۔ وہ خالی تھ باہر سے بارش کے شور اور بادلوں کی گرج کے ساتھ اسے اپنے ماں باپ کی چیخوں کی آوازیں سنا دے رہی تھیں۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر دوڑا۔

باہر کا منظر بہت ہی خوفناک تھا۔ لیکن وہ ڈرنے کی بجائے اپنے ماں باپ کی مدد کے لئے چیخ ہوا ان کی طرف دوڑا۔ اس نے جاتے ہی ایک حملہ آور کی ٹانگ پکڑ لی اور اس کی پنڈلی میں دانت گاڑ دیئے۔ حملہ آور چیختے ہوئے ٹانگ جھٹکنے لگا۔ شارق اچھل کر دور جا گرا۔

"شارق.....بھا.....گ جاؤ۔" اس کی ماں چیخی۔

شارق نے پھر لپک کر حملہ آور کی ٹانگ میں دانت گاڑنے چاہے مگر حملہ آور نے اسے اس قدر زور دار ٹھوکر رسید کر دی کہ شارق چیختا ہوا اچھل کر دور پانی میں جا گرا۔ حملہ آور خنجر سنبھالے اس کی طرف لپکا مگر شفاعت اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ حملہ آور منہ کے بل پانی میں گرا اور پھر پلٹ کر شفاعت پر خنجر کے پے در پے وار کرنے لگا۔

سکینہ مسلسل چیختے ہوئے شارق کو بھاگ جانے کو کہہ رہی تھی۔ شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ان سفاک انسانوں کے مقابلے میں اپنے ماں باپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس وہ درندے اسے بھی ختم کر دیں گے۔ وہ اٹھ کر چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔

بارش کچھ اور تیز ہو گئی تھی جیسے آسمان کے سارے بند ٹوٹ گئے ہوں۔ بجلی بھی اس طرح لڑک اور چمک رہی تھی جیسے آج کے بعد اسے پھر کبھی موقع نہیں ملے گا۔ سکینہ اور شفاعت کی یخیں بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج میں ڈوب رہی تھیں۔

"ارے، اس سپنولئے کو پکڑو، وہ بھاگ رہا ہے۔" سیاہ پوشوں میں سے ایک چیخا۔

ایک حملہ آور سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ شارق آخری سیڑھی پر پہنچ کر رک گیا اور سیاہ پوش طرف دیکھنے لگا جو ایک ہاتھ میں خنجر پکڑے تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ سیڑھی زیادہ ڑی نہیں تھی۔ اس کے دونوں طرف ریلنگ کی طرح اینٹوں کی دیواریں تھیں جن پر سیمنٹ کا ترکیا ہوا تھا۔ شارق اکثر کنکریٹ کی اس ریلنگ پر الٹا بیٹھ کر پھسل بنڈے کی طرح پھسلا کرتا تھا ر سکینہ اسے منع کیا کرتی تھی کہ اس طرح کے کھیل نہ کھیلا کرے، کسی دن گر جائے گا۔

شارق نے دونوں طرف کی ریلنگ پر ہاتھ جما لئے۔ اس کی نظریں حملہ آور پر جمی ہوئی تھیں خنجر بدست تیزی سے اوپر آ رہا تھا۔ ان کے درمیان چند سیڑھیوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ شارق دل ہاتھ پر زور دے کر اچھلا۔ اس کے دونوں پیر پوری قوت سے سیاہ پوش کے منہ اور سینے پر ے۔ اس کی یہ کارروائی سیاہ پوش حملہ آور کے لئے بالکل غیر متوقع تھی۔ اس کے منہ سے چیخ ا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے جا رہا۔

شارق سنبھل کر چھت کی طرف دوڑا۔ چھت پر اگرچہ دو کمرے تھے لیکن اسے یقین تھا کہ سفاک درندے اسے ان کمروں سے ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے ور پھر دوڑ کر پچھلی طرف سے ممٹی (سیڑھیوں پر چھوٹی سی چھت) پر چڑھ کر سینے کے بل لیٹ

سیڑھیوں پر لڑھکنے والا حملہ آور سنبھل کر دوبارہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ چھت پر آ کر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے دونوں کمرے بھی دیکھ لئے۔ وہ پھر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ممٹی کی طرف کا دھیان نہیں گیا۔ البتہ وہ دوسرے مکانوں کی چھتوں کی طرف دیکھنے لگا جو اس مکان کی چھت ملی ہوئی تھیں۔ شارق اسے کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ وہ دوڑتا ہوا دوبارہ نیچے پہنچ گیا۔

"وہ بھاگ گیا۔" اوپر سے آنے والے سیاہ پوش نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ "یہ دونوں ختم ے ہیں اب بھاگو یہاں سے۔ اگر اس لڑکے نے لوگوں کو جمع کر لیا تو یہاں سے نکلنا مشکل ہو ے گا۔"

دوسرے حملہ آور نے سکینہ کے سینے پر خنجر کا آخری وار کیا۔ خنجر دستے تک سکینہ کے سینے

میں پیوست ہو گیا۔ سکینہ کے منہ سے ایک آخری گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ وہ تڑپی اور پھر حرکت ہو گئی۔ حملہ آور نے خنجر اسکے سینے ہی میں چھوڑ دیا اور اٹھ کر اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ باہر کے دروازے کی طرف دوڑا۔

رائفل والے نقاب پوش نے دروازے کا کنڈا اتار کر بڑی آہستگی سے دراوزہ کھولا۔ جھانکا اور پھر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی باہر آ گئے تو اس پر کبھی ایسی کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی۔

آخر میں باہر آنے والے نے بڑی آہستگی سے دروازہ بھیڑ دیا۔ وہ تینوں برستی ہوئی بارش میں تاریک گلی میں نکل گئے۔

شارق ممٹی پر سینے کے بل لیٹا بارش میں بھیگتا اور سردی اور خوف کی شدت سے کانپتا نیچے پر گری ہو۔ اس نے سہم کر سوئی ہوئی رضیہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

اس نے تینوں حملہ آوروں کو مکان سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ لوگ دور جا چکے ہوں گے تو وہ ممٹی سے اتر کر دوڑتا ہوا سیڑھیوں سے اتر کر صحن میں آ گیا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹی چھت کو گھورتی رہی۔ اس کے ذہن میں عجیب و غریب خیالات آ رہے تھے۔ وہ باپ کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ شفاعت ختم ہو چکا تھا۔ اس کے جسم پر لاتعداد زخم تھے۔ وہ جاگتے میں ڈراؤنے خواب دیکھ رہی تھی۔ اسے ہر طرف خون ہی خون بکھرا ہوا نظر آ رہا جن سے بہنے والا خون صحن میں جمع پانی میں شامل ہو رہا تھا۔ وہ چیختا ہوا ماں کی طرف دوڑا۔ اس نے کئی مرتبہ سر جھٹک کر ان خوفناک اور انجانے خیالات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش

سکینہ کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔ اس نے خنجر کو دستے سے پکڑ کر پوری قوت سے باہر کھینچ لیا۔ خنجر باہر آتے ہی زخم سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ سکینہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس کا جسم باہر مسلسل بارش اور بادلوں کی گھن گرج کا شور سنائی دیتا رہا۔ چھ بجے کے قریب بارش بند زخموں سے چور تھا۔ شارق چیختا ہوا ماں سے لپٹ گیا۔

وہ کبھی ماں کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتا کبھی باپ کو پکارتا۔ مگر وہ دونوں اس سے بہت دور جا چکے تھے۔ شارق اٹھ کر مدد کے لئے چیخنے لگا۔ خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی چیخوں کی آواز بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک میں دب کر رہ گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔ نلکے سے نکل کر دراوزہ بند کر دیا اور غسل خانے میں آ گئی۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہ باورچی نے برآمدے کے ستون کے سہارے ٹیک لگا کر کھڑے ہونا چاہا مگر اس کی ٹانگیں بے جان ہونے میں چلی آئی۔ باورچی خانے کی چھت ایک جگہ سے ٹپک رہی تھی۔ فرش پر پانی جمع تھا لیکن تھیں۔ وہ کپکپاتا ہوا نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

شارق برآمدے کے بھیگے ہوئے فرش پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔ بارش کے چھینٹے اس پر پڑ رہا تھے۔ ماں کے سینے سے نکالا ہوا خون آلود خنجر اس کے ہاتھ میں تھا اور اسکے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی کی چادر پھیلنے لگی۔ اس کے منہ سے آخری سسکی نکلی اور پھر اس کا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب گیا۔

وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

○

صبح چھ بجے بارش بند ہو گئی۔

مریم لحاف میں دبکی دیر سے جاگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ لپٹی ہوئی رضیہ گہری نیند میں ساری چیزیں اٹھا کر اوپر تھڑے پر رکھ دی تھیں۔ اس نے چولہا جلا کر اپنے لئے چائے بنائی تقریباً دو گھنٹے پہلے مریم بھی گہری نیند سو رہی تھی کہ اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کیوں سمجھ سکی تھی کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی تھی لیکن دماغ میں سنسناہٹ تھی۔ ایک انجانا سا ف تھا جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ اس خوف کی وجہ بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک سنائی دے رہی تھی۔ ایک جبہ تو بجلی اس زور سے کڑکی کہ وہ کانپ کر رہ گئی۔ اسے یوں لگا تھا کہ جیسے بجلی اسی کے

اس نے کانپتا ہوا لحاف میں دبکی دیر سے جاگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ لپٹی ہوئی رضیہ گہری نیند میں تقریباً دو گھنٹے پہلے مریم بھی گہری نیند سو رہی تھی کہ اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کیوں سمجھ سکی تھی کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی تھی لیکن دماغ میں سنسناہٹ تھی۔ ایک انجانا سا

رائفل والے نقاب پوش نے دروازے کا کنڈا اتار کر بڑی آہستگی سے دراوزہ کھولا۔ جھانکا اور پھر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی باہر آ گئے تو اس پر کبھی ایسی کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی۔

آخر میں باہر آنے والے نے بڑی آہستگی سے دروازہ بھیڑ دیا۔ وہ تینوں برستی ہوئی بارش میں تاریک گلی میں نکل گئے۔

شارق ممٹی پر سینے کے بل لیٹا بارش میں بھیگتا اور سردی اور خوف کی شدت سے کانپتا نیچے پر گری ہو۔ اس نے سہم کر سوئی ہوئی رضیہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

اس نے تینوں حملہ آوروں کو مکان سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ لوگ دور جا چکے ہوں گے تو وہ ممٹی سے اتر کر دوڑتا ہوا سیڑھیوں سے اتر کر صحن میں آ گیا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹی چھت کو گھورتی رہی۔ اس کے ذہن میں عجیب و غریب خیالات آ رہے تھے۔ وہ باپ کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ شفاعت ختم ہو چکا تھا۔ اس کے جسم پر لاتعداد زخم تھے۔ وہ جاگتے میں ڈراؤنے خواب دیکھ رہی تھی۔ اسے ہر طرف خون ہی خون بکھرا ہوا نظر آ رہا جن سے بہنے والا خون صحن میں جمع پانی میں شامل ہو رہا تھا۔ وہ چیختا ہوا ماں کی طرف دوڑا۔ اس نے کئی مرتبہ سر جھٹک کر ان خوفناک اور انجانے خیالات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش

سکینہ کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔ اس نے خنجر کو دستے سے پکڑ کر پوری قوت سے باہر کھینچ لیا۔ خنجر باہر آتے ہی زخم سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ سکینہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس کا جسم باہر مسلسل بارش اور بادلوں کی گھن گرج کا شور سنائی دیتا رہا۔ چھ بجے کے قریب بارش بند زخموں سے چور تھا۔ شارق چیختا ہوا ماں سے لپٹ گیا۔

وہ کبھی ماں کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتا کبھی باپ کو پکارتا۔ مگر وہ دونوں اس سے بہت دور جا چکے تھے۔ شارق اٹھ کر مدد کے لئے چیخنے لگا۔ خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی چیخوں کی آواز بارش بند ہو چکی تھی لیکن گہرے بادلوں نے اب بھی آسمان پر قبضہ جما رکھا تھا۔ اس نے بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک میں دب کر رہ گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔ نلکے سے نکل کر دراوزہ بند کر دیا اور غسل خانے میں آ گئی۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہ باورچی نے برآمدے کے ستون کے سہارے ٹیک لگا کر کھڑے ہونا چاہا مگر اس کی ٹانگیں بے جان ہونے میں چلی آئی۔ باورچی خانے کی چھت ایک جگہ سے ٹپک رہی تھی۔ فرش پر پانی جمع تھا لیکن تھیں۔ وہ کپکپاتا ہوا نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

شارق برآمدے کے بھیگے ہوئے فرش پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔ بارش کے چھینٹے اس پر پڑ رہا تھے۔ ماں کے سینے سے نکالا ہوا خون آلود خنجر اس کے ہاتھ میں تھا اور اسکے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی کی چادر پھیلنے لگی۔ اس کے منہ سے آخری سسکی نکلی اور پھر اس کا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب گیا۔

وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

○

صبح چھ بجے بارش بند ہو گئی۔

مریم لحاف میں دبکی دیر سے جاگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ لپٹی ہوئی رضیہ گہری نیند میں تقریباً دو گھنٹے پہلے مریم بھی گہری نیند سو رہی تھی کہ اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کیوں سمجھ سکی تھی کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی تھی لیکن دماغ میں سنسناہٹ تھی۔ ایک انجانا سا ف تھا جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ اس خوف کی وجہ بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک سنائی دے رہی تھی۔ ایک جبہ تو بجلی اس زور سے کڑکی کہ وہ کانپ کر رہ گئی۔ اسے یوں لگا تھا کہ جیسے بجلی اسی کے

جا۔ میں بھی سکینہ کے ہاں چلی جاؤں گی۔ تو سیپارہ پڑھنے کے بعد بی بی جی کے ہاں رہنا
واپس آؤں گی تو تجھے لے لوں گی وہاں سے۔"

رضیہ سردی میں کپکپاتی ہوئی منہ ہاتھ دھونے غسل خانے میں چلی گئی اور مریم باورچی
میں آکر ناشتہ تیار کرنے لگی۔

سوا سات بجے رضیہ سیپارہ لے کر بی بی جی کے ہاں چلی گئی جس کا گھر اسی گلی میں تھ
نے مکان کو تالا لگایا اور چادروں کا گچھا اوڑھنی کے پلو سے باندھتی ہوئی سکینہ کے مکان کی
چل پڑی۔ وہ عام طور پر سات بجے ان کے ہاں پہنچ جایا کرتی تھی۔ اس وقت تک شفاعت
کی خرید کے لئے منڈی جا چکا ہوتا تھا۔ شارق پونے آٹھ بجے سکول جاتا تھا۔ اس کے لئے
وغیرہ مریم ہی تیار کرتی تھی۔ آج اسے دیر ہو گئی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ آج نہ تو شف
منڈی گیا ہو گا اور نہ ہی شارق اسکول جائے گا۔

مریم دس منٹ میں شفاعت کے مکان کے سامنے پہنچ گئی۔ دو تین آدمی کھیس او
چادروں کی بکلیں مارے گلی میں سے گزر رہے تھے۔ مریم نے دروازے کے ساتھ لگی
گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اس نے گھنٹی کی آواز سنی تھی' وہ بٹن سے ہاتھ ہٹا کر دروازہ کھلنے کا انتظار
لگی۔ دو تین منٹ گزر گئے۔ دروازہ نہیں کھلا۔ اس نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ اس مرتبہ بھی
دروازہ نہیں کھولا۔ تیسری مرتبہ گھنٹی بجانے پر بھی دروازہ نہیں کھلا تو اس نے دروازہ کھٹکھٹا
لئے زور سے ہاتھ مارا۔ ہاتھ پڑتے ہی دروازہ کھل گیا۔ مریم حیران سی رہ گئی۔ اسے سمجھنے
نہیں لگی کہ رات کو غلطی سے وہ کنڈا لگانا بھول گئے ہوں گے یا ممکن ہے صبح سات بجے شا
نے کنڈا کھول دیا ہو اور اب لحاف میں دبکا ہوا ہو۔ وہ دروازہ پوری طرح کھول کر اندر دا
گئی۔ لیکن دو تین قدم آگے بڑھتے ہی وہ اس طرح رک گئی جیسے زمین نے اس کے پیر پک
ہوں۔

سامنے ہی صحن میں شفاعت اور سکینہ کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور چاروں طرف خو
خون پھیلا ہوا تھا۔ صحن میں جمع پانی بھی خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے دماغ میں دھما
ہونے لگے۔ ایک مرتبہ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ پھر تو جاگتے میں ڈراؤنا خواب نہیں
رہی۔ اس نے اپنی انگلی کو دانتوں میں دبایا۔ اس کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔ وہ
نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک خوفناک حقیقت کا سامنا کر رہی تھی....دوسرے ہی لمحہ وہ چیختی
دراوزے سے باہر نکل گئی اور لوگوں کو مدد کے لئے پکارنے لگی۔

چند منٹ میں ہی لوگوں کا جم غفیر جمع ہو گیا۔ لوگوں کی وجہ سے گلی کا راستہ بند ہ

شفاعت کے پڑوسی اور کچھ اور لوگ آنگن میں گھس آئے تھے۔ ان میں وکیل سلمان بھی شامل تھا۔ لوگ شفاعت اور سکینہ کی لاشوں کے گرد جمع تھے اور سلمان ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً" وہ چیخا۔

"ارے....وہ دیکھو برآمدے میں...." اس نے برآمدے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں شارق بے ہوش پڑا تھا۔

سلمان کے ساتھ دو تین آدمی دوڑتے ہوئے اس طرف آ گئے۔ مریم بھی سر پیٹتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ شارق کے ایک ہاتھ میں اب بھی خنجر دبا ہوا تھا۔ مریم نے جھک کر اس کے چہرے کو ہاتھ لگایا۔ اس کا خون آلود لباس دیکھ کر مریم سمجھی تھی کہ وہ بھی ختم ہو چکا ہے مگر وہ زندہ تھا اور اس کا جسم تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس نے شارق کے ہاتھ سے خنجر پکڑنا چاہا تو سلمان چیخ اٹھا۔

"اسے ہاتھ مت لگانا مائی۔ مجھے اس لڑکے پر پہلے ہی شبہ تھا کہ بڑا ہو کر کچھ نہ کچھ کرے گا لیکن اس نے تو چھوٹی سی عمر میں ہی بہت بڑا کارنامہ کر دکھایا۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" مریم چیخی۔ "اس کے ماں باپ قتل ہو گئے۔ وہ خود پتہ نہیں کب سے یہاں بے ہوش پڑا بخار میں پھنک رہا ہے اور تم کہتے ہو...."

"خود ہی دیکھ لو بھائیو۔" سلمان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے قریب کھڑے ہوئے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ "اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر ہے۔ لباس خون سے تر ہو رہا ہے۔ میں تو بہت عرصہ سے اس کے لچھن دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے ماں باپ کو اسی نے قتل کیا ہے اور آلہ قتل یہی خنجر ہے۔ جو اس کے ہاتھ میں ہے۔"

"ارے وہ بخار میں پھنک رہا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اس نے اپنے ماں باپ کو قتل کیا ہے۔ شرم آنی چاہئے تمہیں۔" مریم دھاڑی۔

ایک اور آدمی نے جھک کر شارق کی پیشانی کو چھوا۔ وہ واقعی بخار میں پھنک رہا تھا۔

"لڑکے کو بہت تیز بخار ہے۔ سب سے پہلے اس کا بندوبست ہونا چاہئے۔ اگر کچھ ہو گیا تو اصل حقیقت کا پتہ نہیں چل سکے گا۔" اس آدمی نے کہا۔

"حقیقت وہی ہے جو اس وقت سب کے سامنے ہے۔" سلمان نے جواب دیا۔ "میں ایک وکیل ہوں اور قانون کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ جب تک پولیس نہیں آ جاتی کوئی اسے ہاتھ نہیں لگائے گا۔"

کسی نے جا کر پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد پولیس پہنچ گئی۔ صحن میں پڑی ہوئی لاشوں کا جائزہ لینے کے بعد انسپکٹر شارق کے قریب آ گیا۔ جو ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔

"یہ کون ہے؟" انسپکٹر نے سوالیہ نگاہوں سے سلمان کی طرف دیکھا جو اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ دوسری طرف مریم بھی کھڑی تھی۔

"یہ مقتولین کا بیٹا ہے۔" سلمان نے جواب دیا۔ "بڑا ضدی اور خود سر قسم کا لڑکا ہے۔ اکثر ماں باپ سے کسی نہ کسی بات پر جھگڑتا رہتا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں باپ کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا۔ اور یہ اپنے ماں باپ پر حاوی ہو گیا تھا۔ اس کے لچھن دیکھ کر مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ بڑا ہو کر کچھ نہ کچھ کرے گا۔ آپ کو تفتیش کے لئے زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑے گی۔ اس کا لباس دیکھئے' خون آلود ہے اور خون آلود خنجر بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر اور مسز شفاعت کو اسی خنجر سے قتل کیا گیا ہے۔ بعد میں شاید خوف کی زیادتی سے یہ لڑکا یہاں گر کر بے ہوش ہو گیا۔"

"یہ..... یہ جھوٹ بولتا ہے۔ بکتا ہے یہ۔" مریم چیخی۔ "یہ تو بڑا معصوم اور بھولا بھالا سا بچہ ہے۔ اس نے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا۔ کبھی ماں باپ سے کسی بات کے لئے ضد نہیں کی۔ یہ..... یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔"

"تم کون ہو؟" انسپکٹر نے اسے گھورا۔

"یہ اس گھر میں برتن کپڑے دھونے کا کام کرتی ہے۔" مریم سے پہلے سلمان بول پڑا۔

"میں صبح سے شام تک یہاں رہتی ہوں جی۔" مریم بولی۔ "یہ لڑکا میرے ہاتھوں میں پلا ہے۔ اس نے کبھی ماں باپ سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ یہ اپنے ہی ماں باپ کو کیسے قتل کر سکتا ہے۔ یہ جو وکیل ہے نا....." اس نے سلمان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بڑا کمینہ آدمی ہے۔ ان کے مکان پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ ہائی کورٹ میں مقدمہ بھی چل رہا ہے۔"

انسپکٹر مریم کی بات سن کر چونک گیا اور سلمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں ایڈووکیٹ سلمان ہوں۔ سامنے والے گھر میں رہتا ہوں۔" سلمان نے کہا۔ "یہ درست ہے کہ اس مکان کے سلسلے میں مرحوم شفاعت سے میرا کیس چل رہا تھا لیکن میں اتنا سفاک نہیں ہوں کہ....."

"تھانیدار جی۔" مریم روتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پہلے شارق کو ہسپتال پہنچا دیں۔ وہ بخار میں پھنک رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں اسے بھی....."

تھانیدار نے جھک کر شارق کی پیشانی کو چھوا۔ اس نے بڑی احتیاط سے اس کے ہاتھ سے خون آلود خنجر نکال کر رومال میں لپیٹ لیا اور ایک پولیس والے کو اشارہ کیا۔

"اس بچے کو ہسپتال لے جاؤ۔ کسی پڑوسی کو ساتھ لے جاؤ۔ تم ہسپتال ہی میں رہو گے اس

کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ سمجھ گئے۔"

"یس سر۔" کانسٹیبل نے سلیوٹ جھاڑ دیا۔ اس نے جھک کر بے ہوش شارق کو اٹھایا۔ مریم نے کمرے سے ایک کمبل لا کر شارق پر ڈال دیا۔ محلے کا ایک آدمی پولیس والے کے ساتھ ہو لیا تھا۔

شارق کو ہسپتال پہنچانے کے بعد انسپکٹر پڑوسیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"صورت حال سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں کو خنجر کے پے در پے وار کر کے اسی جگہ قتل کیا گیا ہے۔ یہ لوگ چیخے بھی ہوں گے۔ شور بھی مچایا ہو گا۔ لیکن آپ لوگوں میں سے کسی نے آواز نہیں سنی تھی؟"

"نہیں جی۔" ایک آدمی نے جواب دیا۔ "رات دس بجے سے صبح چھ بجے تک طوفانی بارش ہوتی رہی ہے۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج میں ہمیں کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔"

"اور آپ مسٹر سلمان؟" انسپکٹر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں سامنے والے مکان میں رہتا ہوں۔" سلمان نے جواب دیا۔ "میں رات کو تقریباً ایک بجے تک اپنے کمرے میں بیٹھا کیس کی اسٹڈی کرتا رہا۔ ویسے بھی میرا کمرہ مکان کے آخر میں ہے۔ میں نے بارش کے شور میں کوئی آواز نہیں سنی تھی۔"

"اور تم؟" تھانیدار مریم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تم کہاں رہتی ہو اور کب سے اس گھر میں کام کرتی ہو؟"

"میں یہاں سے تیسری گلی میں رہتی ہوں۔" مریم نے جواب دیا۔ "میں ان کی شادی کے وقت سے یہاں کام کر رہی ہوں۔ پہلے دوسرے گھروں میں بھی کام کرتی تھی لیکن شارق کی پیدائش کے بعد میں نے دوسرے گھروں میں کام چھوڑ دیا اور صرف اسی گھر کی ہو کر رہ گئی۔ بہت اچھے تھے جی یہ دونوں میاں بیوی۔ انسان نہیں فرشتے تھے یہ لوگ۔ کبھی کسی سے جھگڑا نہیں ہوا۔ کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ ہمیشہ دوسروں کے کام آتے تھے۔"

"کل رات تم کس وقت یہاں سے گئی تھیں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"میں کھانا وغیرہ پکا کر نو بجے کے قریب چلی گئی تھی جی! شفاعت اس وقت دکان سے نہیں آیا تھا اور پھر صبح سوا سات بجے یہاں آئی تو باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوئی تو یہاں....." وہ زار و قطار رونے لگی۔

انسپکٹر پڑوس میں رہنے والوں سے کچھ سوالات کرتا رہا پھر لاشیں اٹھوا کر ہسپتال بھجوا دی گئیں اور مکان کو تالا لگا کر چابی انسپکٹر نے اپنی جیب میں رکھ لی۔

"آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا مسٹر سلمان۔" انسپکٹر نے کہا۔

"ضرور۔" سلمان نے جواب دیا۔ "میں ایک قانون دان ہوں اور قانون کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

وہ لوگ تھانے آ گئے۔ ایف آئی آر درج کرنے سے پہلے انسپکٹر' سلمان سے تفصیل بات کرنا چاہتا تھا۔ ان کی گفتگو کا موضوع مکان کا مقدمہ ہی تھا۔ سلمان کی ہر بات کی تان شارق ہی ٹوٹتی رہی تھی۔ وہ اپنی باتوں سے انسپکٹر کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا شفاعت اور اس کی بیوی کا قتل اس کے بیٹے ہی نے کیا ہے۔

"لیکن آپ بھول رہے ہیں کہ سب سے زیادہ شبہ آپ پر ہی کیا جا سکتا ہے۔" انسپکٹر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "آج تک دنیا میں جتنے بھی فساد ہوئے ہیں ان کی جڑ مکان زن' زر اور زمین ہی ہوتی ہے۔ آپ پر شبے کی ٹھوس وجہ موجود ہے۔"

"نہیں انسپکٹر۔" سلمان نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "خنجر آپ نے خود شارق کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ اس کا لباس بھی خون آلود تھا۔ جب آپ تحقیقات کریں گے تو آپ کو خود ہی پتہ چل جائے گا کہ شفاعت اور اس کی بیوی کو قتل کون ہے۔ میں تحقیقات میں آپ سے ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہوں۔"

انسپکٹر چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر دیر تک ان میں مدھم لہجے میں باتیں ہوتی رہیں۔ انسپکٹر کے دفتر میں وہ دونوں اکیلے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد انسپکٹر نے محرر کو بلا کر دوہرے قتل کی ایف آئی آر درج کرنے کو کہا اور دیر تک اس سلسلے میں اسے ہدایات دیتا رہا۔

جب ایف آئی آر درج کی گئی تو شارق کا نام قاتل کی حیثیت سے اس میں شامل تھا۔

شارق کو ہسپتال میں حراست میں لے لیا گیا۔ اس کی نگرانی کے لئے دو مسلح پولیس والے مقرر کر دیئے گئے۔ ڈاکٹروں کی بھرپور توجہ کے باوجود تین دن سے پہلے اس کا بخار کم نہیں ہو سکا تھا۔ اور بالآخر بخار اترنے کے بعد اسکی حالت بتدریج سنبھلنے لگی لیکن اس کی زبان جیسے بند ہو گئی تھی۔ انسپکٹر کئی مرتبہ اس کا بیان قلمبند کرنے کے لئے ہسپتال پہنچا تھا لیکن شارق اس کے کسی سوال کا جواب دینے کے بجائے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

شارق تقریباً ایک مہینہ ہسپتال میں رہا۔ اس دوران مریم کئی مرتبہ اسے دیکھنے کے لئے آئی بھی آتے تھے۔ کبھی کبھار کسی بے گناہ کو بھی جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر جیل بھیج دیا جاتا تھی لیکن پولیس نے اسے شارق سے نہیں ملنے دیا تھا۔

کیس جب عدالت میں پیش ہوا تھا تو پولیس نے ایسے گواہ پیش کئے جنہوں نے شارق آوارہ' ضدی اور خود سر اور خطرناک ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان گواہوں میں ایڈووکیٹ سلمان بھی شامل تھا۔ عدالت میں وہ خنجر بھی پیش کیا گیا جو وقوعہ کے بعد بے ہوش شارق کے ہاتھ

میں تھا۔ شارق کے فنگر پرنٹس بھی عدالت میں پیش کئے گئے تھے۔ شارق نے عدالت میں بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ استغاثہ نے عدالت میں ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی پیش کیا جس میں شارق کی ذہنی حالت کو خطرناک قرار دیا گیا تھا۔

مقدمے کی کارروائی نے زیادہ طول نہیں کھینچا اور عدالت نے شارق کو اپنے ماں باپ کا قاتل قرار دیتے ہوئے اسے عمر قید کی سزا سنا دی اور شارق کو جیل بھیج دیا گیا۔ جس روز عدالت نے مقدمہ سنایا تھا اسی رات انسپکٹر' ایڈووکیٹ سلمان کے گھر میں بیٹھا چائے پی رہا تھا اور جب وہ وہاں سے رخصت ہوا تو اس کی جیبوں میں پچیس ہزار روپے کے نوٹ موجود تھے۔ پچیس ہزار اس نے اس روز بھی وصول کئے تھے جب شارق کے خلاف ایف آئی آر درج کی گئی تھی۔

جس روز عدالت نے شارق کو سزا سنا کر جیل بھیجا تھا اس کے چند ہی روز بعد ہائی کورٹ نے متعلقہ محکمہ کے کلرک نے اصل دستاویزات عدالت میں کر دی تھیں جس سے کیس کا رخ ہی بدل گیا۔ اس سے اگلی پیشی پر ہائی کورٹ نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس فیصلے کے مطابق ماتحت عدالت کا فیصلہ برقرار رکھتے ہوئے شفاعت کو مکان کا جائزہ وارث و قاتل قرار دیا گیا تھا۔ یہ حقیقت بھی ہائی کورٹ کے سامنے موجود تھی کہ شفاعت اور اس کی بیوی کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کے کم سن بیٹے کو ماں باپ کے قتل کے الزام میں عمر قید کی سزا سنا چکی ہے۔ یہ مقدمہ چونکہ شفاعت علی اور ایک تھرڈ پارٹی میں چل رہا تھا اس لئے عدالت نے شارق کو شفاعت کی جائیداد کا وارث قرار دیتے ہوئے مریم کو اس کا نگران مقرر کر دیا اور مکان اس کی تحویل میں دے دیئے گئے۔

مریم واحد عورت تھی جو مہینے میں ایک بار شارق سے ملاقات کے لئے سینٹرل جیل جاتی تھی۔ جیل میں آنے کے کئی روز بعد بھی شارق خاموش رہا' پھر آہستہ آہستہ اس کی زبان کھلنے لگی۔ جیل میں شارق کا رویہ' اس کے خلاف استغاثہ کے بیانات سے بالکل مختلف تھا۔ سخت گیر اور دل سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھی اس کی معصومیت پر ترس آ گیا تھا۔ اس کی زندگی جیل میں ل کے ساتھ گزری تھی۔ جیل میں معمولی چور اور جیب کتروں سے لے کر خطرناک ڈاکو اور سپرنٹنڈنٹ جیل قیدیوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ کس کے ساتھ کس قسم کا سلوک رکھنا چاہئے۔ اگرچہ جیل میں آنے والا ہر دوسرا قیدی اپنے آپ کو بے گناہ کہتا تھا لیکن سپرنٹنڈنٹ جیل ان کی شکل ہی سے اندازہ لگا لیتا تھا کہ کون جھوٹا اور کون

سچا ہے۔

شارق نے جیل میں آ کر کئی روز تک زبان نہیں کھولی تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے قیدیو کو دیکھتا رہا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کو اس سے نجانے کیوں ہمدردی ہو گئی تھی' اور جب شارق نے زبا کھولی تو اس نے اپنے بارے میں یا اپنے ماں باپ کے قتل کے بارے میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا تھا۔

سپرنٹنڈنٹ جیل نے شارق سے کوئی مشقت کا کام لینے کے بجائے اسے دفتر میں چپراسی کی حیثیت سے رکھ لیا اور جب شارق نے پڑھنے لکھنے میں دلچسپی کا اظہار کیا تو اسے فوری طور پر کتابیں بھی مہیا کر دی گئیں۔

شارق کے شریفانہ طرز عمل اور حصول تعلیم کی وجہ سے اسے جیل میں مزید رعایتیں مل گئیں۔ کچھ عرصہ بعد سپرنٹنڈنٹ جیل نے شارق کو اپنے گھر میں ڈیوٹی پر لگا دیا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کا بیٹا کالج میں زیر تعلیم تھا وہ پڑھائی میں شارق کی مدد کرنے لگا۔

جیل میں آنے کے بعد ڈھائی سال بعد جب شارق نے میٹرک کا امتحان دیا تو وہ بہت خوش تھا اور جب رزلٹ نکلا تو شارق سے زیادہ خوشی سپرنٹنڈنٹ جیل کو ہوئی تھی۔ شارق نے پورے صوبے میں ٹاپ کیا تھا۔ اس رزلٹ کے نتیجہ میں شارق کو جیل کے قوانین کے مطابق کچھ اور رعایتیں مل گئیں۔

مریم باقاعدگی سے شارق سے ملنے جیل آتی رہی۔ وہ جب بھی آتی شارق کے لئے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کی چیزیں بنا کر ضرور لے آتی۔ کبھی وہ رضیہ کو بھی ساتھ لے آتی اور کبھی اکیلی ہی آ جاتی۔

شارق پر بعض اوقات عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ گم صم سا بیٹھا رہتا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آتے۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے خون ہی خون پھیلا ہوا نظر آتا۔ ماں باپ کی خون میں لت پت لاشیں۔ زخموں سے چور لاشیں....دو تین سیاہ پوش ادھر ادھر بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے۔ ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ وہ کسی کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

شارق پر جب بھی ایسی کیفیت طاری ہوتی اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ وہ ٹکٹکی لگائے آسمان کو گھورتا رہتا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی ہوتی جن میں بالآخر آنسو بھر آتے۔

دن ہفتوں' ہفتے مہینوں اور مہینے برسوں میں بدلتے رہے۔ شارق نے جیل ہی میں بی۔اے کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ شارق کے ساتھ جیل میں سزا بھگتنے والے دو اور نوجوانوں نے بھی بی۔اے

کا امتحان دیا تھا۔ اور وہ تینوں اچھی پوزیشن میں پاس ہو گئے تھے۔

نیک چال چلن اور حصول تعلیم کی وجہ سے شارق کو نہ صرف جیل میں بہت سی سہولتیں مل گئی تھیں بلکہ اس کی سزا میں تخفیف ہو رہی تھی۔ اب وہ بائیس سال کا ایک بھرپور جوان تھا۔ جب وہ جیل میں آیا تو اس کی عمر بارہ سال تھی۔ اس نے جیل میں دس سال کاٹے تھے۔ کچھ عرصہ سے سپرنٹنڈنٹ جیل نے اسے اپنے بنگلے کی ڈیوٹی سے ہٹا کر دوبارہ جیل میں بلا لیا تھا۔ یہاں بھی اس سے ہلکے پھلکے کام ہی لئے جاتے تھے۔ اس روز وہ دفتر کے سامنے پودوں کی کیاریوں کو پانی دے رہا تھا کہ ایک وارڈن اس کے قریب آ کر رک گیا۔

"شارق' تمہیں سپرنٹنڈنٹ جیل صاحب بلا رہے ہیں اپنے دفتر میں۔" وارڈن نے کہا۔

"اچھا' میں آتا ہوں۔" شارق نے جواب دیا اور پانی والی بالٹی ایک طرف رکھ کر وارڈن کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

دفتر میں سپرنٹنڈنٹ جیل کے علاوہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل بھی موجود تھا۔ شارق نے دفتر میں داخل ہو کر سلام کیا اور سپرنٹنڈنٹ جیل کی میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"شارق!" سپرنٹنڈنٹ جیل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ اس جیل میں آئے ہوئے تمہیں کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟"

"دس سال' ایک مہینہ اور سترہ دن۔" شاق نے جواب دیا۔ "میں نے ایک ایک دن گن گن کر گزارہ ہے جناب۔"

"بہت خوب۔" سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا۔ "کیا تمہیں اپنے جرم کا احساس ہے؟"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔" شارق نے جواب دیا۔ "کون بے وقوف اپنے پیاروں کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔ میرے ماں باپ ہی میرا سب کچھ تھے۔ میں تو باپ کی انگلی پکڑ کر چلا کرتا تھا۔ راستوں کی اونچ نیچ کو بھی نہیں سمجھتا تھا۔ بھلا انہیں کیسے قتل کر سکتا تھا۔"

"یہ سب کچھ تم اب کہہ رہے ہو۔ اپنی زندگی کے دس سال ضائع کرنے کے بعد؟" سپرنٹنڈنٹ جیل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"میری نظروں کے سامنے تو اب بھی وہ نقاب پوش گھوم رہے ہیں جنہوں نے طوفانی بارش میں میرے ماں باپ کو خنجروں کے پے در پے وار کر کے قتل کیا تھا۔ وہ مدد کے لئے پکارتے رہے۔ میں بھی چیختا رہا مگر کسی نے ہماری چیخ و پکار نہیں سنی۔ جب میری آواز اس وقت کسی نے نہیں سنی تھی تو عدالت میں کون سنتا؟ چند مفاد پرستوں نے میرے خلاف اتنا مضبوط حصار قائم کر دیا تھا کہ مجھے اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی زبان بند رکھی

کے لئے کبھی تھوڑے بہت پیسے نکلوا لیتی تھی۔ باقی سارا حساب ان کاغذوں میں موجود ہے۔ ایک دو دن میں تم اپنے نام سے اکاؤنٹ کھول لو تو یہ ساری رقم تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی جائے گی۔"

شارق فائل کھول کر دیکھنے لگا۔ اس میں دس سال کا پورا حساب موجود تھا۔ بینک کی اسٹیٹ منٹس بھی فائل میں لگی ہوئی تھیں۔ آخری اسٹیٹ منٹ ایک ماہ پہلے کی تھی جس کے مطابق اس اکاؤنٹ میں دو لاکھ سے زائد رقم موجود تھی۔ شارق' مریم کی اس دیانت داری سے بے حد متاثر ہوا۔

"آپ نے اپنی ذات کے لئے اس میں سے کبھی کچھ خرچ نہیں کیا؟" شارق بولا۔

"میں نے تمہارے باپ کا نمک کھایا ہے بیٹا۔" مریم نے کہا۔ "یہ رقم تمہاری امانت تھی جسے میں سنبھال کر رکھتی رہی۔ اب تم آ گئے ہو تو یہ بوجھ بھی میرے سر سے اتر جائے گا۔ تم اگر چاہو تو دکان خالی کروا کر وہاں کوئی کاروبار شروع کر دو۔"

"ایک سزا یافتہ کو کہیں نوکری تو مل نہیں سکتی۔" شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اب تو کوئی کاروبار ہی کرنا پڑے گا۔"

اسی دوران رضیہ چائے لے آئی۔ اس نے پراٹھے بنا لئے تھے اور انڈے بھی تل لئے تھے۔ مریم نے ٹوٹی پھوٹی سی میز بیچ میں کھینچ لی۔ رضیہ نے ٹرے میز پر رکھ دی۔

"آپ کو میرے ہاتھ کا ناشتہ بھی کھانا پڑے گا۔" وہ شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کھا لیتے ہیں۔" شارق نے کہتے ہوئے کرسی آگے سرکا لی۔

وہ تینوں ناشتہ کرنے لگے۔ اسی دوران اسی گلی کی رہنے والی ایک عورت آ گئی۔ وہ دروازے میں کھڑی کچھ دیر تک شارق کو گھورتی رہی پھر سوالیہ نگاہوں سے مریم کی طرف دیکھنے لگی۔

"رحمت بی بی' یہ شارق ہے۔ سکینہ کا بیٹا۔ پہچانا نہیں تم نے؟" مریم نے کہا۔

"کون سی سکینہ کا بیٹا؟" رحمت بی بی نے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔ وہ پینتالیس سال کے لگ بھگ فربہ اندام عورت تھی۔ اس کے چہرے ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بات کا بتنگڑ اور لگائی بجھائی کرنے والی عورت ہے۔

"ارے وہی سکینہ جن کے ہاں میں کام کرتی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کو قتل کر دیا گیا تھا اور شارق کو...."

"اچھا سمجھ گئی۔" رحمت بی بی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "چھوٹ گیا ہے جیل سے' مگر یہ تمہارے گھر کیوں آیا ہے؟"

"بیٹا ہے میرا۔" مریم نے کہا۔ "میرے گھر میں نہیں آئے گا تو اور کہاں جائے گا۔ میں تو خود لے کر آئی ہوں اسے۔"

"گھر میں تیری جوان لڑکی ہے اور تو ایک غیر مرد کو لے آئی ہے۔" رحمت بی بی نے کہا۔ "اسے گھر لانے سے پہلے کچھ تو سوچا ہوتا مریم تم نے۔ لوگ باتیں بنائیں گے۔"

"بیٹا ہے میرا۔" مریم نے تنک کر جواب دیا۔ "مجھے نہیں پرواہ لوگوں کی باتوں کی۔"

"لوگ باتیں بنائیں یا نہ بنائیں۔ ماسی ضرور بنائے گی۔" رضیہ نے رحمت بی بی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "ماسی' تمہاری یہی باتیں تو کسی کو اچھی نہیں لگتیں۔ اسی لئے سمجھ دار لوگوں نے اپنے گھروں میں تمہارا آنا جانا بند کر دیا ہی۔"

"کسی کے گھر میں میری جاتی ہے جوتی۔" رحمت بی بی نے کہا۔ "یہ تو میری بہن کا گھر ہے میں آؤں گی اور سو بار آؤں گی۔ تو کون ہے مجھے روکنے والی؟"

"تمہیں کسی نے روکا نہیں ہے ماسی' لیکن...."

"بس بس رہنے دے۔" رحمت بی بی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے بھی چائے بنا کے دے۔ میں تیری ماں سے ایک ضروری بات کرنے آئی ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے ماسی تم نے اماں سے کیا ضروری بات کرنی ہے۔" رضیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لائی ہو گی کسی تانگے والے کے بیٹے کا رشتہ۔ اور اسکی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دو گی تم۔"

"ارے' تم کو اپنے گھر جانا ہے یا ساری عمر ماں کے گھٹنوں سے لگی بیٹھی رہو گی۔" رحمت بی بی نے اسے گھورا۔ "جب بھی کوئی رشتہ لے کر آتی ہوں انکار کر دیتی ہے کہ ابھی میں پڑھ رہی ہوں۔ ساری زندگی پڑھتی ہی رہے گی کیا؟"

"ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔" رضیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور چائے کا ایک کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔

شارق اس دوران خاموش بیٹھا رہا۔ رحمت بی بی چائے پی کر مریم سے ضروری بات کئے بغیر چلی گئی۔ اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد پورے محلے میں یہ خبر پھیل گئی کہ شفاعت کا بیٹا جیل سے رہا ہو کر آ گیا ہے۔ مریم کے گھر پر لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ اس وقت کسی نے شارق کو معصوم اور بے گناہ نہیں سمجھا تھا اور اب دس سال بعد اس سے اظہار ہمدردی کر رہے تھے۔ شارق خاموشی سے لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔

اسی شام شارق' مریم کے ساتھ بھاٹی چوک والی دکان پر پہنچ گیا۔ وہاں پان سگریٹ کی دکان

کھلی ہوئی تھی۔ حسب معمول بھائی کے منجلے سفید اجلے کپڑے پہنے منہ میں پان کی گلوری دبا
اور سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے ادھر ادھر کھڑے گپیں ہانک رہے تھے۔ بعض نوجوانوں نے گ
میں موتیا کے ہار بھی پہن رکھے تھے۔ ہار بیچنے والا بھی لکڑی کی ایک ڈنڈی میں لاتعداد ہار سجا
آوازیں لگاتا ہوا آس پاس گھوم رہا تھا۔

دکان کے سامنے بھی منجلے کھڑے تھے۔ مریم کو دیکھ کر وہ لوگ ایک طرف ہٹ گئے۔
اسے کوئی گاہک ہی سمجھے تھے جو ان کے خیال میں پان لینے آئی تھی۔ شارق گہری نظروں سے
کو دیکھ رہا تھا۔ دکان خاصی بڑی تھی لیکن آگے کے حصے میں ریکس بنا کر اسے مختصر کر لیا گیا
شیشے کے سلائیڈنگ ڈورز والے ریکس میں سگریٹوں کے پیکٹ سجے ہوئے تھے۔

دکان کے مالک کی عمر تیس بتیس سال رہی ہو گی۔ چھوٹی داڑھی اور سر پر دھاگے کی بنی
سفید ٹوپی تھی۔ چہرے سے وہ بڑا شریف اور مہذب لگتا تھا۔

"سلام ماسی۔ کیسے آنا ہوا' کرایہ تو میں پرسوں گھر پر دے آیا تھا۔" دکاندار نے مریم کو
کرتے ہوئے کہا۔

"جیتے رہو بیٹا۔" مریم نے کہا۔ "کرایہ مل گیا تھا۔ آج تو میں شارق کو تم سے ملانے کے
لائی ہوں۔ یہ دکان کا اصل مالک ہے۔ میں نے بتایا تھا نا تمہیں کہ....."

"سمجھ گیا ماسی۔" دکاندار نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیسے ہیں شارق باؤ۔" اس نے
گرمجوشی سے شارق سے ہاتھ ملایا۔

اسی دوران ایک مجہول سا آدمی وہاں آ گیا۔ میلے کچیلے کپڑے' گریبان چاک' الجھے ہوئی
آنکھوں میں سرخی اور دائیں رخسار پر زخم تھا جیسے گرنے سے رگڑ لگی ہو۔ اس شخص کو دیکھ
لگتا تھا جیسے مہینوں سے منہ ہاتھ نہ دھویا ہو۔ اس نے جیب سے پچاس کا ایک نوٹ نکال کر
والے کی طرف بڑھا دیا۔ دکاندار نے نوٹ لے کر کاؤنٹر کی دراز میں ڈال لیا۔ نیچے جھک کر
سے دو پلاسٹک کی چھوٹی تھیلیاں نکالیں۔ ان میں سفید سفوف بھرا ہوا تھا۔ نیچے بیٹھے ہی
اس نے دونوں تھیلیاں کاغذ کی ایک تھیلی میں ڈالیں اور اٹھ کر وہ تھیلی اس مجہول سے
طرف بڑھا دی۔ اس شخص نے تھیلی جیب میں ڈالی اور تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔

"شارق باؤ۔ کیا خدمت کروں آپ کی۔ ٹھنڈا چلے گا؟" دکاندار نے شارق سے پوچھا اور
جواب کا انتظار کئے بغیر دائیں طرف رکھے ہوئے ڈیپ فریزر میں سے کوک کی دو بوتلیں نکال
انہیں کھولا اور ان میں اسٹرا لگا کر ایک بوتل شارق کی طرف بڑھا دی اور ایک مریم کی طرف۔

"بیٹا لطیف۔" مریم نے کوک کی ایک چسکی لیتے ہوئے کہا۔ "شارق باؤ کوئی کاروبار کرنا ہوں۔" شارق نے کہا۔

میں نے جب تمہیں دکان دی تھی تو یہ وعدہ لیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر تم سے دکان خالی کرا
جائے گی۔"

"مجھے یہ وعدہ یاد ہے ماسی۔" لطیف نے کہا۔ "لیکن مجھے تھوڑا سا وقت دیں گے نا' تاکہ میں
ئی اور بندوبست کر لوں۔"

"کتنا وقت چاہئے ہو گا آپ کو؟" اس مرتبہ شارق نے پوچھا۔

"آج تین تاریخ ہے۔" لطیف بولا۔ "یہ پورا مہینہ آپ مجھے دے دیں۔ ویسے تو نسبت روڈ
ہاشمی چوک کے قریب میری اپنی دکان ہے جو عرصہ سے بند پڑی ہے۔ یہاں تو کاروبار جما ہوا
کوشش کروں گا کہ آس پاس ہی کوئی دکان مل جائے۔ اگر کوئی بندوبست نہ ہوا تو لکشمی
پر اپنی دکان میں چلا جاؤں گا۔ بہرحال' آپ کو تیس تاریخ کو دکان خالی مل جائے گی۔"

"اس سے آگے تو نہیں....؟"

"نہیں شارق باؤ۔" لطیف نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مریم ماسی تو مجھے بھی بیٹے کی طرح
تی رہی ہے۔ میں نے ان سے جو وعدہ کیا تھا۔ اس سے نہیں پھروں گا۔ آپ کو تیس تاریخ کو
ان خالی مل جائے گی۔"

"اچھی بات ہے۔" شارق نے کہا۔

جب وہ لطیف سے ہاتھ ملا کر رخصت ہونے لگا تو ایک اور گاہک ایسا آیا تھا جس نے لطیف کو
س کا نوٹ دیا تھا اور لطیف نے کاؤنٹر کے نیچے سے ویسی ہی پلاسٹک کی دو پڑیاں کاغذ کی تھیلی
ڈال کر اسے تھما دی تھیں۔

"مکان میں کون لوگ رہ رہے ہیں ماں جی؟" شارق نے راستے میں پوچھا۔

"کوئی سرکاری افسر ہے۔ بہت شریف لوگ ہیں وہ بھی۔ اس آدمی کا راولپنڈی تبادلہ ہو گیا
اس نے پہلے ہی مجھے کہہ دیا تھا کہ وہ لوگ اس مہینے کی بیس بائیس تاریخ تک مکان خالی کر
ہیں۔ وہ لوگ چلے جائیں تو مکان میں تھوڑی بہت مرمت کروانا ہو گی۔ اس کے بعد...."

"اس کے بعد وہ مکان فروخت کر دیا جائے گا۔" شارق نے اس کی بات مکمل نہیں ہونے
دی۔

"کیوں بیٹا؟" مریم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اب اس مکان میں نہیں رہ سکتا۔ وہاں میرے ماں باپ کا خون بکھرا ہوا ہے۔ اس مکان
کی وجہ سے میرے ماں باپ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میں وہاں کیسے رہ

مریم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں خاموشی سے راستہ چلتے رہے۔

"ماں جی' آپ گھر جائیں۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" شارق نے لوہاری سامنے پہنچ کر کہا۔

مریم چلی گئی اور شارق گہری نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھنے لگا جو ایک تھڑ نیوز اسٹینڈ کے سامنے کھڑا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید آنکھوں پر عینک لگی ہوئی تھی۔ لیکن شارق نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ ایڈووکیٹ سلمان کے چہرے پر پہلے سے زیادہ خباثت ٹپک رہی تھی۔ شارق اس کے قریب جا کر کھڑا ہو نے تھڑے پر سجے ہوئے اخبارات کی طرف دیکھا۔ شام کو شائع ہونے والے دو تین اخبا ہیڈ لائین تقریباً ایک ہی تھی۔

"دس سال پہلے ماں باپ کو قتل کرنے والے نوجوان کو رہا کر دیا گیا۔"

اس کے نیچے کئی ذیلی سرخیاں تھیں۔ ہر سرخی سنسنی خیز اور دہشت پھیلانے وا اخباروں کی یہ سرخیاں پڑھنے سے یوں لگتا تھا جیسے کوئی عفریت شہر میں گھس آیا ہو اور ہوشیار کیا جا رہا ہو۔ ہر اخبار نے اس کی تصویریں بھی شائع کی تھیں۔ یہ تصویر اخبار وا یقیناً جیل سے حاصل کی تھی۔

ایڈووکیٹ سلمان بھی اپنے سامنے اخبار پھیلائے یہی خبر پڑھ رہا تھا۔ اس کے قریب شخص بھی کھڑا تھا۔ سلمان نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹا لیا اور اسے تہہ کر کے کوٹ میں رکھتے ہوئے ساتھ والے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"دیکھ لیا احمد علی۔ شفاعت کا بیٹا جیل سے چھوٹ گیا ہے۔"

"ہاں... تصویر سے تو لگتا ہے کہ وہ جوان ہو گیا ہے۔" احمد علی نے کہا۔

"جوان نہیں ہو گا تو کیا بچہ ہی رہے گا۔" سلمان بولا۔ "جب وہ جیل گیا تھا تو اس تقریباً بارہ سال تھی۔ دس سال جیل میں رہا۔ اب تو..."

بات کرتے کرتے اس کی نظریں شارق کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ اس طرح چونک گیا انوکھی شے دیکھ لی ہو۔ اس نے تھڑے پر پڑے ہوئے ایک اخبار کے صفحہ اول پر شارق کی طرف دیکھا' پھر شارق کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کی رنگ تبدیل ہونے لگی۔

"تت.... تم..." وہ شارق کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے ہکلایا۔

"چلو اچھا ہوا۔ تم نے مجھے پہچان تو لیا۔" شارق کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی

جو تم نے جیب میں رکھی ہے اسے اپنے دل اور ذہن میں نقش کر لو۔ یہ تصویر تم سے اپنے پ کے قتل کا حساب لے گی۔"

"م... میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔" سلمان ہکلا رہا تھا۔ "تت... تم... تم..." وہ بات مکمل کئے کر تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔

سرا آدمی احمد علی بھی گہری نظروں سے شارق کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر وہ بھی وہاں سے گیا۔ شارق کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور پھر ٹہلتا ہوا نعمت کدہ ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے منگوائی اور چسکیاں لیتے ہوئے ہوٹل میں بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ بعض لوگوں نے ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔

شارق تقریباً ایک گھنٹے تک ہوٹل میں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر سڑک پار کر کے انارکلی کی طرف آ شام کا وقت تھا۔ یہاں زندگی کی رونق عروج پر تھی۔ وہ دس سال بعد زندگی کی یہ چہل پہل ا تھا۔ وہ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ اس کے سامنے تقریباً اسی کی عمر کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔

تم شارق ہو نا؟" اس شخص نے شارق کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

ں لیکن میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" شارق کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

ارے میں سہیل ہوں.... آٹھویں کلاس میں تمہارے ساتھ پڑھتا تھا۔ سہیل بلا' اب بھی میں؟" اس شخص نے کہا۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

او.... میرے ساتھ آؤ۔" سہیل اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ کھینچتا ہوا لے گیا۔

ایک سائیڈ اسٹریٹ میں آ گئے جہاں ایک چھوٹا سا صاف ستھرا ریسٹورنٹ تھا۔ وہ ریسٹورنٹ ہو گئے۔ سہیل نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے چائے بھجوانے کو کہا اور شارق کو یڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ شارق کا خیال تھا کہ اوپر اسپیشل گیلری ہو گی لیکن اس کا خیال غلط کے اختتام پر مختصر سی راہداری تھی جس کے اختتام پر دروازہ تھا۔ سہیل نے جیب سے دروازہ کھولا اور وہ دونوں اندر آ گئے۔ یہ دو کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ اس کا باہر سڑک کی طرف بھی تھا۔

و۔" سہیل نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ریسٹورنٹ میرا ہے اور میری رہائش بھی

ی دیر میں ویٹر چائے دے کر چلا گیا۔ چائے کے دوران وہ باتیں کرتے رہے۔ سہیل

کے والدین بھی انتقال کر چکے تھے اور وہ بھی شارق کی طرح اس دنیا میں اکیلا ہی رہ گیا تھا۔

شارق جب سہیل سے رخصت ہوا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ جب وہ گھر پہ
چلا کہ مریم اور رضیہ نے اس کے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔

یہ اس کے دوسرے دن کی بات ہے۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ شارق گھر پ
اچانک دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی دروازہ توڑ دینا چاہتا ہو۔
وقت باورچی خانے میں تھی۔ اس نے جا کر دراوزہ کھولا تو ایک پولیس والے کو دیکھ
گئی۔

"شارق گھر میں ہو تو اسے باہر بھیجو۔" پولیس والے نے بارعب لہجے میں کہا۔

رضیہ نے آ کر شارق کو بتایا۔ شارق باہر آ گیا۔

"تمہیں تھانیدار صاحب نے بلایا ہے میرے ساتھ چلو۔" پولیس والے نے کہا۔

"کیوں.... کیا بات ہے؟" شارق نے پوچھا۔

"یہ تو تمہیں تھانے جا کر ہی پتہ چلے گا۔ چلو میرے ساتھ۔" پولیس والا بولا۔

شارق اس کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں لوگ عجیب سی نظروں سے اس کی
رہے تھے۔ تھانیدار ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ کرختگی اور پھٹکار اس کے چہرے پر نمایاں تھی

"معلوم ہوتا ہے دس سال جیل میں رہ کر بھی تم نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ باہر نکلتے ہی
نے کل پرزے نکالنا شروع کر دیئے۔" تھانیدار اسے سر سے پیر تک گھورتے ہوئے بولا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟ مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟" شارق نے کہا۔ اس کے لہجے
خوف تھا۔

"کل شام تم نے وکیل صاحب کو دھمکی دی تھی۔" تھانیدار نے اسے گھورا۔

"کون سے وکیل صاحب؟" شارق نے پوچھا۔

"ایڈووکیٹ سلمان۔" تھانیدار نے کہا۔ "تم نے اسے دھمکی دی تھی کہ اپنے
قتل کا حساب لو گے۔ اس نے تمہارے خلاف تحریری شکایت کی ہے۔ اوئے برکت!"
قریب کھڑے ہوئے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ "اسے ذرا بتاؤ نا دھمکی کیسے دی جاتی ہے۔"

لمبے تڑنگے کانسٹیبل نے اچانک ہی شارق کو دبوچ لیا اور لاتوں اور گھونسوں سے
کرنے لگا۔ شارق کی ناک سے خون بہنے لگا۔

"بس چھوڑ دو۔" تھانیدار نے کہا۔ پھر شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں اپنے علاقے میں کسی کی بدمعاشی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اگر م

کے پیچھے بند کر سکتا ہوں۔ مگر مجھے تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے۔ آج تو میں تمہیں چھوڑ
آئندہ کوئی بدمعاشی کی تو وہیں پہنچا دوں گا جہاں دس سال کاٹ کر آئے ہو۔ جاؤ بھاگ

شارق گھر پہنچا تو مریم اور رضیہ اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ رضیہ تو باقاعدہ رونے
شارق کا جسم جگہ جگہ سے دکھ رہا تھا اور رضیہ دیر تک اس کی سینکائی کرتی رہی۔

شارق کئی روز تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اکیس تاریخ کو اس کا مکان خالی ہو گیا۔ اگلے روز
کے ساتھ مکان دیکھنے گیا۔ مکان میں داخل ہوتے ہی وہ کانپ اٹھا۔ وہ دیر تک صحن میں
کو دیکھتا رہا جہاں دس سال پہلے اس نے اپنے ماں باپ کو ان سیاہ پوشوں کے ہاتھوں زخمی
تڑپتے اور مرتے دیکھا تھا۔

وہ زیادہ دیر تک مکان میں نہیں رکا۔ مکان میں واقعی کچھ مرمت کی ضرورت تھی۔

"ہاں جی۔" وہ مریم کے ساتھ واپس آتے ہوئے بولا۔ "اس مکان کی مرمت وغیرہ کروا لیں
اسے بیچ دوں گا۔ میں اب دوبارہ یہاں نہیں آؤں گا۔"

اسی رات وہ گھر میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ مریم نے
کھولا۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا ماں جی؟ کون تھا؟" شارق نے پوچھا۔

"تمہارے مکان کو آگ لگ گئی ہے۔" مریم نے جواب دیا۔

شارق کھانا چھوڑ کر باہر دوڑا۔ جب وہ اپنے مکان والی گلی میں پہنچا تو دور ہی رک گیا۔ گلی
کا ہجوم تھا اور اس کے مکان سے اٹھنے والے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

○

شارق بے بسی سے دور ہی کھڑا مکان سے اٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ لوگ
سے بالٹیوں میں پانی بھر بھر کر لا رہے تھے' لیکن یہ آگ بالٹیوں سے بجھنے والی نہیں
حقیقت یہ ہے کہ اب تو فائر بریگیڈ کے بس کی بھی نہیں رہی تھی اور فائر بریگیڈ کا یہاں
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' یہ مکان لوہاری گیٹ کے اندر والی کشادہ سڑک سے
میل دور واقع تھا اور وہاں تک راستہ تنگ اور پر پیچ گلیوں پر مشتمل تھا۔ صرف سائیکل
سائیکل ہی واحد سواری تھی جو ان گلیوں میں آ سکتی تھی۔ فائر بریگیڈ کی گاڑی کے یہاں
کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لوگ دوسرے گھروں کو آگ کی لپیٹ میں آنے سے
لئے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر ڈال رہے تھے۔

چھ گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد اس آگ پر قابو پایا جا سکا تھا' لیکن شارق کا یہ مکان
پر جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ پڑوس کے دو اور مکانوں کو جزوی طور پر نقصان پہنچا تھا۔ لوگوں' وکیل صاحب نے پھر میرے خلاف کوئی شکایت کی ہے کیا؟" شارق نے کہتے ہوئے
سے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔ بعض لوگ اس بات پر حیران تھی کہ بند مکان میں
لگ گئی؟ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ آگ بجلی کے شارٹ سرکٹ کی وجہ سے لگی تھی اور
اس بات پر مصر تھے کہ یہ آگ جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔ آگ بجھانے کی کوشش
انہوں نے پیٹرول کی بو بھی محسوس کی تھی جس کا مطلب تھا کہ پیٹرول چھڑک کر آگ
تھی۔

شارق نے آتش زدگی کی رپورٹ تھانے میں نہیں لکھوائی تھی' کیونکہ اسے یقین
یہ آگ کسی نے جان بوجھ کر بھی لگائی تھی تو پولیس اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکے گی
دوسرے دن وہ مریم کے ساتھ مکان کے ملبے اور راکھ کے ڈھیر کا معائنہ کر رہا تھا
کہیں کہیں سے اب بھی ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔ آٹھ کمروں میں سے صرف دو کمرے
جن کی چھتیں ابھی تک قائم تھیں لیکن ان کے شہتیر بھی ادھ جلے تھے اور وہ
وقت بھی گر سکتی تھیں' شارق نے سوچا تھا کہ یہ مکان بیچ کر اس سے ملنے والی رقم
کسی اور علاقے میں کوئی مناسب مکان خرید لے گا' لیکن اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

جلی ہوئی زمین ہی کی قیمت مل سکتی تھی' لیکن شارق کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکی تھی کہ
مکان کو آگ کس نے لگائی تھی؟

ملبے کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظریں اچانک ہی سامنے والے مکان کی طرف اٹھ گئیں۔
اسی لمحہ اس مکان کے اوپر والے ایک کمرے کی کھڑکی بند ہوئی تھی۔ شارق کو یوں لگا تھا
اس نے کھڑکی میں کسی کو کھڑے دیکھا ہو۔ لیکن وہ اس چہرے کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن وہ
پوری طرح بند نہیں ہوئی تھی۔ اس کے دونوں پٹوں میں تقریباً نصف انچ کا خلا اب بھی
تھا۔ شارق کو یقین تھا کہ اب بھی کوئی کھڑکی میں کھڑا اس خلا سے ان کی طرف دیکھ رہا ہے۔

"چلو بیٹا' اب چلیں۔ کب تک یہاں کھڑے اس راکھ کو دیکھتے رہو گے؟" مریم نے کہا۔

"ہاں چلیں ماں جی!" شارق نے کہا۔ "ایک دو دن بعد مزدوروں کو بلا کر یہ ملبہ ہٹوا دوں گا
تاکہ زمین کو فروخت کرنے کے لئے اخبار میں اشتہار دے دوں گا۔"

بیرونی دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ تین چار پولیس والے اندر داخل ہوئے۔ ان
انسپکٹر تھا' ایک اے ایس آئی اور دو کانسٹیبل۔ ان پولیس والوں کو دیکھ کر شارق کا ماتھا

"ہم تمہاری ہی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ تمہیں ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہو گا شارق۔"
شارق کے قریب پہنچ کر کرخت لہجے میں کہا۔

"کیا میرے خلاف کوئی شکایت کی ہے کیا؟" شارق نے کہتے ہوئے

"کیا آپ کیا کہہ رہے ہیں انسپکٹر صاحب؟" شارق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا
سکتے ہیں کہ کوئی باہوش شخص اپنی جائیداد کو اس طرح جلا کر راکھ کر دے گا۔"

جو رپورٹ ملی ہے اس سے پتہ چلا ہے کہ آگ لگنے سے تھوڑی دیر پہلے تمہیں اس
کھڑکی میں کھڑے ہوئے دیکھا گیا تھا۔" تھانیدار نے کہا۔

"جھوٹ ہے۔" مریم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "شارق تو شام ہی سے گھر میں تھا'
کھا رہے تھے تو محلے کے ایک آدمی نے ہمیں آگ لگنے کی اطلاع دی تھی۔"

"زیادہ بڑھیا۔" تھانیدار نے اسے ڈانٹ دیا۔

"ویسے بائی دی وے آپ کو یہ اطلاع کسی نے دی تھی؟" شارق نے پوچھا اور سامنے والے مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ کوئی بھی ہو۔ مگر یہ اطلاع غلط نہیں ہو سکتی۔ چلو ہمارے ساتھ تھانے چلو۔" نے کہا اور دونوں کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا۔

"دونوں کانسٹیبلوں نے شارق کے دائیں بائیں آکر اسے بانہوں سے پکڑ لیا۔

"چل اوئے۔" دونوں کانسٹیبل اسے دروازے کی طرف کھینچنے لگے۔

"میں سمجھ گیا ہوں کہ میرے خلاف یہ کمینی حرکت کس نے کی ہے۔" شارق

"یہ ظلم ہے۔ چھوڑ دو اسے۔" مریم چیختی ہوئی ان کے راستے میں آ گئی۔ "یہ آگ کیسے لگا سکتا ہے؟ اپنے پیروں پر کلہاڑی کون مار سکتا ہے؟"

"ہٹ جاؤ مائی۔" تھانیدار نے مریم کو ایک طرف دھکیل دیا۔ "ورنہ تمہیں بند کر دیں گے اس کے ساتھ۔"

"تم پر خدا کی لعنت ہو تھانیدار۔" مریم چیخی۔ "صورت پر پہلے ہی پھٹکار برسا غریبوں اور بے گناہوں کی آہیں مت لو۔ چھوڑ دو اسے۔"

"لے چلو اسے۔" تھانیدار نے پولیس والوں کو اشارہ کیا۔

وہ لوگ شارق کو پکڑ کر گلی میں آ گئے۔ مریم ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی چیختی کو کوسنے دے رہی تھی۔ بہت سے لوگ بھی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے تھے۔ آواز میں پولیس والوں کو برا بھلا بھی کہہ رہے تھے۔ مگر تھانیدار اور پولیس والوں کوسنوں اور لوگوں کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایسے چکنے گھڑے تھے جن بوند بھی نہیں ٹھہرتی تھی۔

لوہاری گیٹ کے اندر گلیوں کے چوک پر پہنچ کر مریم رک گئی۔ وہ اب بھی چیخ کو بددعائیں اور کوسنے دے رہی تھی۔

"کیا ہوا مریم بہن! کیوں چیخ رہی ہو؟" ایک دکاندار نے پوچھا۔ مریم گھر کا سودا سے لیا کرتی تھی اور ویسے بھی محلے کے تقریباً سب ہی لوگ اسے جانتے تھے۔

"گھ نہ رہے اس ٹٹ پینے' مرن جوگے تھانیدار کا۔" مریم چیخی۔ "وہ شفاعت پکڑ کر لے گیا ہے۔ کہتا ہے کہ اپنے گھر کو آگ اس نے خود لگائی تھی۔"

"مریم بہن' یہ پولیس والے ہوتے ہی ایسے ہیں۔" دکاندار نے کہا۔ "جس کو دیں اور جس کو چاہیں پکڑ کر جیل میں بند کر دیں۔ ملک صاحب کے پاس چلی جاؤ۔

شفاعت کے بیٹے کو۔ ورنہ پولیس والے اسے پھر لمبے عرصے کے لئے جیل بھجوا دیں گے۔"

"میں ابھی جاتی ہوں۔" مریم کہتی ہوئی ایک گلی میں مڑ کر تیز تیز چلنے لگی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بدستور تھانے دار کو کوس رہی تھی۔ لوگ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ملک منیر کا شمار اس علاقے کے معززین میں ہوتا تھا۔ اسے سیاست سے شغف تھا۔ کورا ان آدمی تھا۔ مگر اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے سامنے اس کا ایک تھا اور لنڈا بازار میں پانچ چھ دکانیں تھیں جو اس نے کرائے پر دے رکھی تھیں۔ قیام پاکستان وقت اس کا باپ تانگہ چلاتا تھا۔ اس نے ریلوے اسٹیشن والے ہوٹل اور لنڈا بازار کی ان پر قبضہ کر لیا جو ہندو چھوڑ گئے تھے۔ لوہاری گیٹ والا مکان بھی ایک سکھ کی ملکیت تھا۔ کیا تھا پوری حویلی تھی۔ اس وقت کچھ اور لوگوں نے اس مکان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر منیر کا باپ تلوار نکال کر کھڑا ہو گیا تھا۔

منیر کے باپ نے تانگہ چلانا چھوڑ دیا۔ چالاک آدمی تھا۔ کچھ لوگوں سے تعلقات بھی تھے۔ دوڑ کر کے اس نے یہ ساری جائیداد اپنے نام لکھوا لی۔ منیر کا باپ خود تو آٹھ جماعتیں پڑھا ۔ اس نے منیر کو پڑھانے کی کوشش کی۔ مگر پانچویں جماعت سے آگے نہیں جا سکا۔ باپ اس پر دباؤ نہیں ڈالا کہ اسے کونسا نوکری کرنی ہے۔

ان پڑھ ہونے کے بوجود منیر ذہین آدمی تھا۔ اس نے جلد ہی باپ کا کاروبار سنبھال لیا۔ بہت عرصے میں اس نے نہ صرف میکلوڈ روڈ پر ایک اور ہوٹل خرید لیا بلکہ سمن آباد میں خرید کر اس پر شاندار کوٹھی بھی بنوا لی۔ میکلوڈ روڈ والا ہوٹل ٹھیکے پر اور سمن آباد والی ایک نامور فلم ایکٹریس کو کرائے پر دے رکھی تھی۔ اس نے خود اس محلے میں رہنے کو ترجیح البتہ اس پرانی طرز کی حویلی کی جگہ ایک جدید طرز کا خوبصورت مکان بن چکا تھا جس کے کے ساتھ والی دیوار پر سنگ مرمر کی سل لگی ہوئی تھی۔ جس پر جلی حروف میں ملک منیر ا تھا۔ منیر کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے باپ کی ذات کیا تھی۔ اس کا باپ جب تانگہ چلاتا اسے بشیرا تانگے والا کہتے تھے۔ جب وہ صاحب جائیداد بنا اور ریشمی لاچا' کلف لگا ہوا اور اجلی سفید پگڑی باندھ کر ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھنے لگا تو لوگوں نے اسے مہرجی کہنا شروع منیر کے ایک دوست نے مذاق میں اسے ملک کہہ کر پکارا تو یہ لفظ اسے اچھا لگا۔ اس کے ساتھ ملک لکھنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ ملک منیر بن گیا۔

منیر کو جوانی ہی میں سیاست کا چسکا لگ گیا تھا۔ ایوب خان کے زمانے میں بنیادی نظام متعارف ہوا تو دوستوں کے کہنے پر اس نے بھی الیکشن میں حصہ لے ڈالا اور بی

ڈی ممبر منتخب ہو گیا۔ وہ سیاست کو دولت مندوں کا چونچلا اور مشغلہ سمجھتا رہا تھا لیکن جب عملی طور پر سیاست میں آیا تو پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ سیاست مشغلہ اور چونچلا کندھوں پر پڑنے والی ایک بھاری ذمے داری ہے۔ بعض لوگوں نے سیاست کو حصول زر سمجھا تھا۔ وہ دس لاکھ خرچ کر کے ممبر منتخب ہوتے تھے تو پہلے ہی سال میں پچاس لاکھ تھے۔ مگر منیر نے سیاست کا مفہوم کچھ اور سمجھا تھا۔ اپنے علاقے کے عوام اور ملک دیانتداری سے خدمت۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود اس نے خدمت و دیانت کو اپنا وطیرہ روپے پیسے کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ حکومت سے ملنے والے فنڈ انہی کاموں پر جن کے لئے وہ جاری کئے جاتے تھے۔ لوگ ناجائز کام کروانے کے لئے اسے لاکھوں کرتے مگر وہ ایسی ہر پیشکش کو ٹھکرا دیتا۔ البتہ جائز کاموں کے لئے وہ لوگوں کے ساتھ رات دو بجے بھی کوئی اس کے گھر آ جاتا اور اگر کام جائز ہوتا تو اسی وقت اٹھ کر اس چل پڑتا اور اگر اسے اندازہ ہو جاتا کہ کام ناجائز ہے تو بڑی خوبصورتی سے آنے والے کو

ملک منیر سیاست میں ہمیشہ ان رہا تھا۔ آج تک ایک مرتبہ بھی آؤٹ نہیں ہوا تھا بھی اپنے علاقے کا کونسلر تھا۔ مختلف پارٹیوں نے اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی ہمیشہ آزاد ہی رہا تھا۔ ہر پارٹی کے لیڈروں سے اس کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے۔ تھا میں بھی اس کی بات سنی جاتی تھی۔ اس کی دیانت داری کی وجہ سے ہر جگہ اسے عزت دیکھا جاتا تھا۔

شفاعت اور سکینہ کے قتل کے بعد شارق کو جب عمر قید کی سزا سنا کر جیل میں ڈا مریم کی بہت بری حالت ہوئی تھی۔ بھاگ دوڑ کی وجہ سے وہ نہ صرف بیمار ہو گئی تھ ساری جمع پونجی مقدمے پر خرچ کر چکی تھی۔

شارق کو جیل گئے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔ مریم گھروں میں کام کرتے ہوئے ملک منیر کے گھر پہنچ گئی۔ یہاں وہ صرف آدھا دن کام کرتی تھی لیکن اسے اتنی تنخواہ کسی اور جگہ کام کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی تھی۔ اسی وقت مریم کو پہلی مرتبہ ملک کیا ہے۔ اس نے ایک روز موقع پا کر اس سے شفاعت اور سکینہ کے قتل اور شا ذکر کیا تو ملک منیر کو بے حد افسوس ہوا۔ اس نے وکیل سے مشورہ کیا۔ وکیل نے بتایا کا وقت بھی نہیں رہا۔

مریم نے دو سال ملک منیر کے گھر کام کیا پھر کسی وجہ سے چھوڑ دیا اور آج تقریباً بعد وہ اس کے گھر جا رہی تھی۔ ملک منیر اس وقت گھر پر ہی تھا۔ وہ بیٹھک میں

کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ مریم بیٹھک میں گھس گئی۔

"کیا بات ہے مریم بی بی' بہت گھبرائی ہوئی ہو؟" ملک منیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھے پہچان لیا ملک جی؟" مریم بولی۔

"کیوں بھئی' میں تمہیں کیسے نہ پہچانتا؟ تم نے دو سال میرے گھر والوں کی خدمت کی ہے۔ میں جس کو ایک مرتبہ اچھی طرح دیکھ لیتا ہوں۔ اسے کبھی نہیں بھولتا۔ کہو' کیسے آنا ہوا؟ تمہاری بیٹی تو ٹھیک ہے نا؟ اب تو ماشاء اللہ بڑی ہو گئی ہو گی؟" ملک منیر نے کہا۔

"اس نے تو جی ماشاء اللہ بی اے کر لیا ہے۔" مریم نے جواب دیا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کی بعد بولی۔ "آپ نے مجھے پہچان لیا۔ میری بیٹی کو بھی یاد رکھا۔ پھر تو آپ کو شفاعت اور سکینہ کے بیٹے کا قصہ بھی یاد ہو گا۔ وہی شارق۔ جس کے بارے میں' میں نے اس وقت آپ کو بتایا تھا؟"

"مجھے یاد ہے۔ مگر وہ تو شاید جیل میں ہے؟" ملک منیر نے کہا۔

"وہ رہا ہو گیا ہے جی۔ چند روز پہلے۔" مریم نے بتایا۔ "اس نے بھی جیل میں پڑھ کر بی اے کر لیا ہے۔ مگر پتہ نہیں یہ لڑکا کیسی قسمت لے کر اس دنیا میں آیا ہے۔ پہلے ماں باپ کے قتل کے جھوٹے الزام میں چودہ سال جیل میں کاٹے۔ رہا ہو کر آیا تو دوسرے دن پولیس نے پکڑ کر اسے مارا پیٹا۔ کل اس کا مکان جل کر راکھ ہو گیا اور آج پھر وہ مرن جوگا تھانیدار اسے پکڑ کر لے گیا ہے۔"

"کیوں؟ کیا کیا ہے اس نے؟" ملک منیر نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ملک جی۔ تھانیدار کہتا ہے کہ مکان کو خود اس نے آگ لگائی تھی۔ آپ ہی سوچیں جی۔ بھلا کوئی اپنے گھر کو جلا سکتا ہے۔ اسے بچا لیں ملک جی۔ بڑا نیک بچہ ہے وہ تو۔ پولیس والے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیں گے۔" مریم نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"اچھا تم اندر جا کر بیٹھو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" ملک منیر نے کہا۔

مریم مکان کے اندرونی حصے میں آ گئی۔ ملک منیر کی بیوی نے بھی مریم کو پہچان لیا۔ مریم نے اسے رو رو کر واقعہ بتایا تو وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"مت رو مریم۔ حوصلہ کر۔ تسلی رکھ۔ ملک جی تھانیدار کو ٹیلی فون کر دیں گے۔ کچھ نہیں ہوتا اس لڑکے کو۔"

"وہ تو میرا پتر ہے ملکانی جی۔ کوئی نہیں ہے اس کا اس دنیا میں۔" مریم بولی۔

"خدا تو ہے نا۔" ملکانی نے کہا۔ "حوصلہ رکھ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ملک منیر کے پاس اگرچہ ٹیلی فون بھی موجود تھا۔ وہ اگر چاہتا تو فون پر بھی تھانیدار سے بات کر سکتا تھا۔ مگر بیٹھک میں بیٹھے ہوئے آدمیوں سے نمٹنے کے بعد تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ مریم کے ساتھ تھانے کی طرف چل پڑا۔

بازار میں ہر شخص اٹھ اٹھ کر ملک منیر کو سلام کر رہا تھا۔ ملک منیر خوش اخلاقی سے ہر ایک کے سلام کا جواب دیتا رہا۔ جب وہ تھانے میں داخل ہوا تو پولیس والوں نے بھی اسے سلام کیا۔ ملک منیر سیدھا تھانیدار کے کمرے میں گھس گیا۔ مریم بھی اس کے پیچھے ہی تھی۔ تھانیدار کے کمرے میں دو آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

"آیئے ملک جی۔" تھانیدار نے اٹھ کر ملک منیر سے ہاتھ ملایا۔ "بیٹھیے' کیسے زحمت کی؟ کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"تمہارے بارے میں مجھے بڑی شکایتیں مل رہی ہیں تھانیدار۔" ملک منیر نے اس کی خوشامد سے متاثر ہوئے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تو علاقے کے لوگوں کو ناجائز تنگ کرتا ہے۔ تھانیداری کیا ہوتی ہے' پتہ ہے تجھے؟"

"بات کیا ہے ملک جی؟" تھانیدار کن انکھیوں سے مریم کی طرف دیکھنے لگا۔

"اوئے پہلے تو یہ بتا کہ تو اپنے گھر کو آگ لگا سکتا ہے؟" ملک منیر نے اسے گھورا۔

"میرا دماغ تو خراب نہیں ہوا ملک جی۔" تھانیدار نے جواب دیا۔

"تو کیا اس لڑکے کا دماغ خراب ہوا ہے جسے تو پکڑ لایا ہے؟ کیا جرم کیا ہے اس نے؟ کیا دفعہ لگائی ہے اس پر؟ کس کے کہنے پر پکڑا ہے تم نے اسے؟" ملک نے کہا۔

"اوہ!" تھانیدار نے گہرا سانس لیا۔ "تو آپ اس عورت کے ساتھ آئے ہیں؟" اس نے مریم کی طرف دیکھا۔ "آپ اس آدمی کو نہیں جانتے ملک جی! وہ ماں باپ کے قتل کے جرم میں لمبی سزا کاٹ کر آیا ہے۔ باہر آتے ہی اس نے لوگوں کو برے نتائج کی دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں۔ ایک آدمی کو پھنسانے کے لئے اس نے اپنے مکان کو آگ لگا دی۔"

"کیا اس نے اس آدمی کے خلاف رپٹ لکھوائی تھی؟" ملک منیر نے اسے گھورا۔

"نہیں' لیکن اس سے پہلے ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ مکان کو آگ اس نے خود لگائی تھی۔ یہ جرم ہے۔ اس کا مکان تو جلا ہی تھا۔ دوسرے دو مکانوں کو بھی نقصان پہنچا ہے۔"

"نہ تو تو ولی ہے۔ تم نے خواب میں اسے اپنے مکان کو آگ لگاتے ہوئے دیکھا تھا؟" ملک منیر نے کہا۔

"میں نہ تو ولی ہوں' نہ میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔" تھانیدار نے جواب دیا۔ غصے کے

باعث اس کے چہرے پر سرخی بڑھ رہی تھی۔ ملک منیر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اب تک اسے سلاخوں کے پیچھے بند کر چکا ہوتا۔ مگر وہ ملک منیر کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے تعلقات بہت اوپر تک تھے۔ "لیکن....." وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "ایک آدمی نے اس کے خلاف شکایت کی تھی کہ مکان کو آگ لگنے سے تھوڑی دیر پہلے اس نے شارق کو مکان سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"اپنے گھر میں جانا کوئی جرم ہے کیا؟" ملک منیر نے اسے گھورا۔ "کس نے شکایت کی تھی؟ مجھے اس کا نام بتاؤ۔ میری بات غور سے سنو تھانیدار۔ میں اس علاقے کا کونسلر ہوں۔ اپنے علاقے کے لوگوں کا خیال رکھنا میری ذمے داری ہے۔ مجھے اس شخص کا نام بتاؤ جس نے شارق کے خلاف شکایت کی ہے کہ اس نے شارق کو اپنے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"وہ اس کے سامنے والے گھر میں رہتا ہے۔ سلمان ایڈووکیٹ۔" تھانیدار نے بتایا۔

"اوئے' وہ تو پہلے ہی بہت خبیث آدمی ہے۔ جعلساز اور دھوکے باز۔" ملک منیر نے کہا۔ "سچ بتا' اس نے تمہیں کتنے پیسے دیئے تھے؟"

"آپ اپنی حد سے بڑھ رہے ہیں ملک جی۔" تھانیدار کی قوت برداشت جواب دینے لگی۔

"مجھے اپنی حد کا پتہ ہے۔ تو اپنی کھال میں رہ۔ یہ وردی پہن کر فرعون مت بنو۔ اس لڑکے کے خلاف کوئی ثبوت ہے کسی جرم کا تو بتاؤ مجھے۔ ورنہ ابھی اور اسی وقت چھوڑ دو اسے۔"

تھانیدار چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر محرر کو بلا کر پوچھا۔

"اس لڑکے کے خلاف ابھی پرچہ تو نہیں کاٹا؟"

"کچی رپورٹ لکھی ہے جی۔ آپ نے کہا تھا ابھی پرچہ نہ کاٹا جائے۔" محرر نے جواب دیا۔

"یہاں لے کر آؤ اسے۔" تھانیدار نے کہا۔

کچھ دیر بعد شارق کو ایک پولیس والا تھانیدار کے کمرے میں لے آیا۔ شارق کو تھانے لائے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہوا تھا اور اس عرصہ میں پولیس والے اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت کر چکے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر خون جما ہوا تھا اور دائیں رخسار پر بھی سیاہ دھبہ نظر آ رہا تھا۔ مریم دوڑ کر شارق سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"تم واقعی انسان نہیں درندے ہو۔ میں آج ہی تمہارا بندوبست کرتا ہوں۔" ملک منیر نے خونخوار نظروں سے تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے لے جاؤ ملک جی! کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے ساتھ میں تمہیں بھی بند کر دوں۔ بہت دیکھے ہیں تم جیسے کونسلر۔" تھانیدار کی قوت برداشت بالآخر جواب دے گئی۔

"اوئے....اوئے.... تو مجھے بند کرے گا۔" ملک منیر کا پارہ بھی چڑھ گیا۔ "کر دے بند مجھے۔"

کمرے میں موجود دوسرے دونوں آدمی ملک منیر کو پکڑ کر زبردستی باہر لے آئے۔

"چھوڑیئے ملک جی۔ آپ کا کام ہو گیا۔ لے جایئے لڑکے کو۔ بات ختم کر دیں۔" ایک آدمی نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"کام تو میں اس فرعون کا کروں گا۔" ملک چیخا۔

ملک کے بولنے کی آواز سن کر بہت سے لوگ تھانے کے باہر جمع ہو گئے۔ انہیں جب صورت حال کا پتہ چلا تو وہ بھی پولیس والوں کو کھل کر گالیاں بکنے لگے۔ ملک منیر' مریم اور شارق کے ساتھ تھانے سے باہر آ گیا۔

"بہن مریم' تم گھر جاؤ۔ میں ایک دو گھنٹوں میں آتا ہوں اس لڑکے کو ساتھ لے کر۔" ملک منیر نے کہا۔ پھر ہجوم میں دو آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اوئے' تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔"

وہ دونوں آدمی شارق کو لے کر ملک منیر کے ساتھ ایک تانگے میں بیٹھ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ملک منیر' شارق کو ہسپتال یا کسی ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہے۔ مگر ان کی منزل ڈی آئی جی کا دفتر ثابت ہوئی تھی۔

عام طور پر ڈی آئی جی جیسے افسران سے ملاقات کے لئے خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عام آدمی تو ان تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن وہ ملک منیر تھا۔ کونسلر ہونا بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی' لیکن ملک منیر ایک دیانت دار اور بے خوف آدمی تھا۔ شہر میں اسے خاصی شہرت حاصل تھی۔ وہ خود کو قوم کا خادم سمجھتا تھا اور سرکاری افسران کے بارے میں تو اس کا خیال تھا کہ قوم کے ٹیکسوں پر پلنے والے یہ لوگ بھی قوم کے خدمت گار ہیں اور پولیس کے افسران کے بارے میں تو اس کا خیال تھا کہ ان کے دروازے چوبیس گھنٹے عوام کے لئے کھلے رہنے چاہئیں' لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ عام آدمی کے لئے ڈی آئی جی کے رتبے کے پولیس آفیسر تک پہنچنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی گداگر بادشاہ سلامت کے دربار تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

پولیس ہیڈ کوارٹر کی بلڈنگ میں داخل ہونا بھی ایک عام آدمی کے لئے نہایت کٹھن مرحلہ تھا۔ لیکن ملک منیر اپنی کونسلری کی بنیاد پر پرچی بنوا کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تو راستے میں اور بیسیوں رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ "صاحب میٹنگ میں ہیں' صاحب مصروف ہیں' آج ملاقات کا دن نہیں ہے' کیا صاحب نے پہلے سے ملاقات کا وقت دے رکھا ہے۔ درخواست لکھ کر دے

جایئے' آپ کو بلا لیا جائے گا۔" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ملک منیر زبردستی ان رکاوٹوں کو عبور کرتا ہوا ڈی آئی جی کے کمرے تک پہنچ گیا۔ دروازے کے سامنے دو کانسٹیبل کھڑے تھے۔ ایک رائفل بردار اور دوسرا اردلی۔

"آپ صاحب کے پی اے سے مل لیں۔ وہ پرچی اندر بھجوائیں گے تو آپ کو بلا لیا جائے گا۔" اردلی نے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

"تو مجھے نہیں جانتا اوئے پرچی کے کچھ لگتے۔" ملک منیر نے کہا۔ "میں ڈی آئی جی سے ملنے آیا ہوں۔ وزیر اعظم سے نہیں۔" اس نے اردلی کو ایک طرف ہٹایا۔ ایک ہاتھ سے شارق کا بازو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اندر واقعی میٹنگ ہو رہی تھی۔ شہر کے تمام ایس پی اور ڈی ایس پی حضرات جمع تھے۔ ان سب کے سامنے چائے کے کپ رکھے ہوئے تھے اور چائے کی چسکیوں کے ساتھ اس طرح باتیں ہو رہی تھیں جیسے شادی کی کسی تقریب میں آئے ہوں۔

"سر! یہ لوگ زبردستی اندر آ گئے ہیں۔" اردلی نے اندر داخل ہو کر کہا۔ وہ خاصا بدحواس نظر آ رہا تھا۔

تمام پولیس افسران شارق اور ملک منیر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ملک منیر کا چہرہ ڈی آئی جی کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ اس کے علاقے کا ایس پی بھی موجود تھا۔

"ٹھیک ہے' تم جاؤ۔" ڈی آئی جی نے اردلی کو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر ملک منیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "ملک صاحب' ہم اس وقت ایک ضروری میٹنگ میں مصروف ہیں۔ اگر آپ کچھ دیر ساتھ والے کمرے میں جا کر بیٹھ جائیں تو میں فارغ ہو کر آپ سے بات کروں گا۔"

"جو ضروری میٹنگ ہو رہی ہے' میں دیکھ رہا ہوں۔" ملک منیر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گا جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ پولیس عوام کی محافظ ہے یا یہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کا گروہ؟"

"ملک صاحب۔" اس علاقے کے ڈی ایس پی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ پولیس کے سربراہ سے...."

"آپ چپ رہو جی۔" ملک منیر نے اسے ٹوک دیا۔ "پولیس کا سربراہ تو شہریوں کا محافظ ہوتا ہے' لیکن آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر چائے پی رہے ہیں اور اپنے ماتحتوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ لوگوں کے ساتھ جو سلوک چاہیں کرتے رہیں۔"

"آپ کو جو شکایت ہے وہ....."

"میں نے کہا نا آپ چپ رہیں۔" ملک منیر نے ایک بار پھر ڈی ایس پی کو ٹوک دیا۔ "آپ کو معلوم ہی نہیں کہ آپ کے علاقے میں کیا ہو رہا ہے۔ بس وردی پہن کر اکڑ رہے ہیں آپ تو۔ اس وردی کا آپ پر کچھ حق ہے۔ پہلے وہ حق ادا کریں۔ پھر مجھ سے بات کریں۔"

ڈی ایس پی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر ڈی آئی جی نے اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور ملک منیر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تشریف رکھئے ملک صاحب۔ یہ نوجوان کون ہے اور بتائیے کیا قصہ ہے؟"

"قصہ مختصر یہ ہے کہ....." ملک منیر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور پھر شارق کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "اگر اس بدمعاش تھانے دار کو برطرف نہ کیا گیا تو میں یہ معاملہ اوپر تک لے جاؤں گا۔ اور یہ ڈی ایس پی صاحب جو بیٹھے ہیں۔" اس نے علاقے کے ڈی ایس پی کی طرف اشارہ کیا۔ "چودہ سال پہلے یہی اس علاقے کا تھانے دار تھا۔ اس نے بارہ سال کے بچے کو ماں باپ کے قتل کے الزام میں عمر قید کی سزا سنوائی تھی۔ میں پوچھتا ہوں کیا ملا اسے کسی کا گھر برباد کر کے۔ پولیس کی وردی پہن لینے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ لوگ قانون کے مالک بن گئے ہیں۔"

"ملک صاحب۔" ڈی آئی جی نے کہا۔ "پولیس عوام کی خادم ہے۔ عوام کی محافظ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس محکمہ میں کچھ کالی بھیڑیں بھی ہیں۔ ایسے غیر ذمے دار لوگوں کے خلاف ہمیں کوئی شکایت ملتی ہے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرتے ہیں۔"

"اچھے محافظ ہیں آپ لوگ۔" ملک منیر نے کہا۔ "مار مار کے حلیہ بگاڑ دیا ہے اس شریف آدمی کا۔" وہ شارق کی طرف مڑ گیا۔ "تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے وہ لکھ دو۔ اگر کوئی کارروائی نہ ہوئی تو میں اوپر تک بھی جا سکتا ہوں۔"

شارق نے اس واقعہ کی مکمل تفصیل لکھ کر ڈی آئی جی کے حوالے کر دیا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ جب سے جیل سے رہا ہو کر آیا ہے۔ علاقے کا تھانیدار اسے مسلسل پریشان کر رہا ہے۔ ڈی آئی جی نے درخواست پر ڈی ایس پی کے نام احکامات لکھ دیئے۔

"مجھے دو گھنٹے کے اندر اندر رپورٹ ملنی چاہئے۔ میں کوئی لاقانونیت برداشت نہیں کروں گا۔ آپ جائیے اور دو گھنٹے بعد مجھے رپورٹ پیش کریں۔" اس نے ڈی ایس پی سے کہا اور پھر ملک منیر کی طرف رخ کر کے بولا۔ "آپ مطمئن رہئے ملک صاحب۔ اگر مذکورہ انسپکٹر فرائض میں غفلت اور بددیانتی کا مجرم پایا گیا تو اس کے خلاف کارروائی ضرور ہو گی۔"

"پایا گیا کا کیا مطلب؟ وہ مجرم ہے۔ اس نے علاقے کے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ بھتے

وصول کرتا ہے دکانداروں سے۔ جس شریف آدمی کو چاہتا ہے پکڑ کر بند کر دیتا ہے۔ کوئی بھی شریف آدمی اس سے محفوظ نہیں ہے۔ جب کہ غنڈے اور بدمعاش علاقے میں دندناتے پھرتے ہیں۔" ملک منیر نے کہا۔

"میں نے ڈی ایس پی صاحب کو تحقیقات کا حکم دے دیا ہے۔ اب آپ کو اطمینان ہو جانا چاہئے۔" ڈی آئی جی نے کہا۔ وہ ملک منیر جیسے لوگوں کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ سیدھی راہ پر چلنے والے ایسے لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے بھی ان کی تقلید کریں اور پھر ملک منیر تو ان معاملات میں پورے شہر میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ چند سال پہلے وہ ڈپٹی کمشنر کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پاس ڈپٹی کمشنر کے خلاف بدعنوانیوں کے ٹھوس الزامات موجود تھے اور جب تک اس ڈپٹی کمشنر کا ٹرانسفر نہیں کر دیا گیا تھا وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ اس وقت بھی اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر اس تھانیدار کے خلاف فوری کارروائی نہ کی گئی تو وہ اس معاملے کو بہت اوپر تک لے جائے گا۔

ملک منیر، شارق کو لے کر لوہاری میں ایک ڈاکٹر کے پاس آ گیا۔ اس کی مرہم پٹی کروانے کے بعد اسے گھر چھوڑا اور پھر اپنے گھر چلا گیا۔

اس روز شام کو انسپکٹر کو معطل کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر سلمان ایڈووکیٹ سے مل کر شارق کے خلاف سازش میں حصہ لینے اور معزز اور شریف شہریوں کو رسوا کرنے اور رشوت لینے کے الزامات عائد کئے گئے تھے۔ پولیس سلمان ایڈووکیٹ کو بھی گرفتار کرنا چاہتی تھی لیکن وہ گھر سے فرار ہو گیا تھا۔ اخبارات نے پولیس انسپکٹر کے خلاف کارروائی کی خبر شہ سرخیوں میں شائع کی تھی۔

شارق ایک ہفتے تک گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ان واقعات سے وہ محتاط ہو گیا تھا۔ اور بلا وجہ کسی الجھن میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا۔ ایک پولیس آفیسر کی معطلی اور گرفتاری کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تمام پولیس والے سدھر گئے تھے۔ شارق کو سلمان ایڈووکیٹ کے فرار ہو جانے کا افسوس ہوا تھا۔ اب اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ تمام فسادات کی جڑ وہی بدفطرت اور کمینہ شخص تھا۔ اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ چودہ سال پہلے اس کے ماں باپ کو بھی اسی نے قتل کروایا تھا اور وہ ڈی ایس پی، جو چودہ سال پہلے اس علاقے کا تھانیدار تھا، بھی شارق کو قتل کے کیس میں پھنسوانے کی سازش میں شریک تھا۔

موجودہ تھانیدار کے خلاف تحقیقات کی ذمہ داری اسی ڈی ایس پی کو سونپی گئی تھی۔ اس نے ڈی آئی جی کے احکامات کے تحت تھانیدار کے خلاف تو رپورٹ مرتب کر لی تھی اور شہریوں کے

بیانات کی روشنی میں اسے قصور وار قرار دیا گیا تھا' لیکن شارق کو شبہ تھا کہ سلمان ایڈووکیٹ کو فرار کا موقع بھی اسی ڈی ایس پی نے ہی فراہم کیا ہو گا۔ کیونکہ چودہ سال پہلے اگر وہ اس سازش میں شریک تھا تو سلمان ایڈووکیٹ کی گرفتاری سے پرانی باتیں سامنے آ سکتی تھیں اور خود ڈی ایس پی بھی ان کی زد میں آ سکتا تھا۔ شارق نے ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ ڈی ایس پی کسی بات کی آڑ لے کر اس کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتا تھا یا سلمان ایڈووکیٹ اسے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس جیسے بے ضمیر اور بدفطرت لوگ کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ ان کے سینوں میں حسد و رقابت کی آگ سلگتی رہتی ہے جو انہیں برائیوں پر اکساتی رہتی ہے۔ کسی نیک کام کی ایسے لوگوں سے توقع نہیں کی جا سکتی۔

اس دوران شارق اپنے دوست سہیل کی طرف بھی نہیں گیا تھا۔ اس نے اخبار میں شارق کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ اور تھانیدار کے خلاف کارروائی کے بارے میں ضرور پڑھا ہو گا اور ممکن ہے اس نے شارق سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی ہو۔ لیکن اسے شارق کے گھر کا پتہ نہیں معلوم تھا۔

بھاٹی والی دکان کے لرائے دار لطیف نے وعدے کے مطابق تیس تاریخ سے پہلے ہی دکان خالی کر کے چابی ان کے حوالے کر دی۔ اسے کوئی اور دکان نہیں ملی تھی اور وہ اپنی لکشمی والی دکان میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہ دکان مین روڈ سے ذرا ہٹ کر واقع تھی جس وجہ سے وہ عرصہ سے بند پڑی تھی۔ مگر اب لطیف نے اس دکان میں اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا۔

شارق نے دکان میں رنگ و روغن کروا لیا۔ وہ کئی روز تک یہی سوچتا رہا کہ یہاں کیا کاروبار شروع کرے۔ اس کے دادا نے یہاں پھلوں کی دکان کھولی تھی۔ باپ بھی یہی کاروبار کرتا رہا تھا۔ بچپن میں اس نے بھی باپ کے ساتھ یہی کام کیا تھا۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پھلوں ہی کی دکان کھولے گا۔ اس کے مکان اور دکان کے کرائے کی چودہ سال کی کمائی ابھی تک مریم کے نام سے بینک اکاؤنٹ میں جمع تھی۔ مریم اسے کئی مرتبہ کہہ چکی تھی کہ وہ اپنے نام سے اکاؤنٹ کھلوا لے تاکہ یہ رقم اس اکاؤنٹ میں منتقل کر دی جائے۔ مگر شارق اب تک ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ اس روز رات کے کھانے کے بعد اس نے مریم کی دی ہوئی چیک بک نکال لی۔ اس میں ایک لاکھ روپے کی رقم بھرنی۔ چیک پر اس نے بیئرر کے آگے کیش لکھا تھا۔

"ماں جی' میں نے پھلوں ہی کی دکان کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے لئے مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ یہ میں نے ایک لاکھ کا چیک بھر دیا ہے۔ اس پر دستخط کر دیں۔ کل چیک کیش کروا کر دکان سیٹ کرنے کے لئے کچھ سامان لے آؤں گا اور پھر دو چار روز میں دکانداری شروع کر

دوں گا۔ اس نے چیک بک مریم کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک لاکھ کیوں؟" مریم نے اسے گھورا۔ "تم صبح میرے ساتھ چل کر اپنا اکاؤنٹ کھلوا لو اور ساری رقم اس میں منتقل کر لو۔ میں نہیں اب سنبھال سکتی۔"

"میرے لئے ایک لاکھ کی رقم کافی ہے ماں جی۔" شارق نے کہا۔ "بلکہ دکانداری شروع کرنے کے بعد بھی اس میں آدھی سے زیادہ رقم بچ جائے گی۔ وہ میں اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا لوں گا۔"

"اور باقی رقم؟" مریم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس کا داخلہ ہونے والا ہے۔" اس نے رضیہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے بعد بھی اسے پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔ آپ کو تو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ تعلیم کتنی مہنگی ہے۔ میں تو آپ کی ہمت کو داد دیتا ہوں جو اسے بی اے کروا دیا۔ اب یہ ایم اے بھی ضرور کرے گی۔"

"لیکن...."

"اس سلسلے میں کوئی بات نہیں سنوں گا ماں جی۔" شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اگر آپ نے انکار کیا تو میں سمجھوں گا کہ آپ مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھتیں۔"

"نہیں پتر' یہ بات نہیں ہے۔" مریم بولی۔

"تو پھر خاموشی سے صرف ایک لاکھ کے اس چیک پر دستخط کر دیں۔" شارق بولا۔

"اچھا۔" مریم کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ "لیکن صرف دستخط کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ چیک کیش کروانے کے لئے مجھے خود بھی بینک جانا پڑے گا۔"

صبح شارق نے مریم کے ساتھ جا کر اس بینک میں اپنا کاؤنٹ کھولا۔ مریم کے اکاؤنٹ میں سے ایک لاکھ کی رقم نکلوا کر اس میں سے بیس ہزار جیب میں رکھ لئے اور باقی رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دی۔ بینک سے نکل کر اس نے مریم کو گھر بھیج دیا اور خود دوکان کی طرف چلا گیا۔ وہ اس دکان کو معیاری انداز میں شروع کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نے پہلے ہی منصوبہ بنا رکھا تھا۔

ایک ہفتے میں اس نے دکان کے خوبصورت شیلف بنوا لئے۔ شیشے کے خوبصورت مرتبان میں انواع و اقسام کے ڈرائی فروٹ سجا کر شیلفوں پر رکھے اور پھر اس کے دو چار روز بعد وہ صبح سویرے منڈی پہنچ گیا اور اس روز سے دکان داری شروع ہو گئی۔

پہلے ہی روز شام کے وقت وہ ایک گاہک کو پھل دے رہا تھا کہ میلے کچیلے لباس میں ایک مجہول سا آدمی دکان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ صورت ہی سے نشے کا عادی لگتا تھا۔ اس قسم

کے لوگ بھیک مانگ کر نشے کی عادت پوری کیا کرتے تھے۔ شارق اسے بھی بھکاری ہی سمجھا گاہک کے جانے کے بعد وہ آدمی قریب آ گیا۔ شارق نے اس کی طرف دیکھا تو چونکے بغیر نہیں سکا تھا۔ اس نے اس شخص کو پہچان لیا تھا۔ پہلی مرتبہ جب وہ مریم کے ساتھ کرائے دار کو خالی کرنے کے لئے کہنے آیا تھا تو اس وقت یہاں پان کی دکان تھی۔ اس شخص نے لطیف کو پ کا نوٹ دیا اور لطیف نے اسے کاغذ کی ایک تھیلی تھما دی تھی' جسے لے کر یہ شخص چلا گیا اب بھی اس شخص نے جیب سے پچاس روپے کا تڑا مڑا نوٹ نکالا اور کچھ کہے بغیر شارق کی طر بڑھا دیا۔

"کیا چاہئے؟" شارق نے پچاس کا نوٹ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔

"افغانی پوڈر۔ لطیف نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں یہاں کیا لینے آتا ہوں۔" اس شخص کہا۔

"یہ پوڈر کی دکان ہے؟" شارق نے اسے گھورا۔ "چل بھاگ یہاں سے۔" اس نے پچاس نوٹ دوبارہ اس شخص کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ایک تو اتنے دن بعد دوکان کھولی ہے اور سودا بھی نہیں دیتا۔ لطیف کی دکان پر ہی جانا پڑ گا لکشمی۔" وہ شخص بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

اس روز تین اور ایسے آدمی آئے تھے جنہوں نے اس سے افغانی پوڈر مانگا تھا۔ اس کے بع کئی روز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ روزانہ کئی گاہک ایسے آتے جو پچاس یا سو کا نوٹ دے کر اس سے افغانی پوڈر طلب کرتے۔ ان میں کچھ سفید پوش بھی ہوتے اور کچھ بھکاری قسم کے آدمی بھی۔

اس روز رات نو بجے ایک کار اس کی دکان کے سامنے آ کر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خوبصورت اور جوان عورت کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ شارق کی دکان پر کاروں والے گاہک آتے رہتے تھے۔ وہ عورت انجن بند کر کے کار سے اتر آئی۔ شارق کے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس نے دکان کے سامنے رک کر پہلے عجیب سی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا پھر ایک کلو امرود تلوا کر پرس میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"کتنے پیسے؟"

"دس روپے۔ اور کچھ نہیں چاہئے؟" شارق نے پوچھا۔

اس عورت نے پرس میں سے ایک دس اور ایک پانچ سو کا نوٹ نکال کر شارق کی طرف بڑھ دیا۔ وہ گھبرائی ہوئی سی تھی اور بار بار ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ دس روپے کے ساتھ پانچ سو روپ کا نوٹ دیکھ کر شارق اس طرح اس عورت کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس کی ذہنی صحت پر شبہ ہو۔

"یہ پانچ سو کا نوٹ....."

"مجھے....افغانی پوڈر چاہئے۔" اس عورت نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"افغانی پوڈر....میں سمجھا نہیں۔" شارق نے اسے گھورا۔

"میں ہمیشہ یہیں سے لے جاتی ہوں۔ پہلے یہاں پان کی دکان تھی اور....."

"ممکن ہے وہ پان والا افغانی پوڈر رکھتا ہو۔ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ پھلوں کی دکان ہے۔ کاسمیٹکس کی نہیں۔" شارق نے کہتے ہوئے پانچ سو کا نوٹ اسے لوٹا دیا۔

وہ عورت چند لمحے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے شارق کے ہاتھ سے نوٹ جھپٹا' امرود والا لفافہ اٹھایا اور کار میں بیٹھ گئی۔ اس نے دروازہ اس زور سے بند کیا تھا کہ آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے انجن سٹارٹ کر کے گاڑی بڑے خطرناک انداز میں آگے بڑھائی تھی۔ شاید اس پر کسی قسم کی جھنجھلاہٹ سوار ہو گئی تھی۔

شارق اب واقعی پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے پاس افغانی پوڈر کے گاہک آ رہے تھے اور بقول ان گاہکوں کے' وہ لطیف سے یہ سودا لیتے رہے تھے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ افغانی پوڈر ہوتا کیا ہے؟

شارق عام طور پر رات ساڑھے دس بجے دکان بند کر دیا کرتا تھا۔ اس رات وہ دکان بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک آدمی اس کی دکان پر آ کر رکا۔ وہ دبلا پتلا لمبا سا آدمی تھا۔ اس نے جسم پر چادر لپیٹ رکھی تھی۔ سر پر مفلر لپٹا ہوا تھا۔ شیو بڑھا ہوا تھا۔

"کیا حال ہے شارق باؤ؟" اس شخص نے اس طرح بے تکلفی سے اس سے ہاتھ ملایا جیسے بہت پرانی جان پہچان ہو۔ مگر وہ چہرہ شارق کے لئے قطعی اجنبی تھا۔

"میں نے پہچانا نہیں۔" شارق نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں پہچانا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن میں تو تم کو جانتا ہوں۔" اس شخص نے کہتے ہوئے چادر میں کالے رنگ کا ایک شاپنگ بیگ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ "تمہارے گاہک واپس جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا تمہیں مال دے دوں۔ لو یہ رکھ لو۔ آدھا کلو ہے۔ پیسے بعد میں دے دینا۔ گاہک کو پچیس روپے کی ایک پڑیا دینا۔"

"یہ کیا ہے؟" شارق نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"افغانی پوڈر ہے شارق باؤ۔ پیسہ ہی پیسے ہے اس میں۔ اصلی مال ہے اس میں۔ تمہارے پاس

ایسے ایسے گاہک آئیں گے کہ تم منہ مانگے پیسے لے سکتے ہو ان سے۔" اس شخص نے کہا۔

"افغانی پوڈر کے گاہک تو واقعی آ رہے ہیں۔ مگر یہ ہے کیا؟" شارق نے کہتے ہوئے تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔ اس میں پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں بھری ہوئی تھیں۔ ہر تھیلی میں چٹکی بھر سفید رنگ کا پوڈر بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک پڑیا نکال کر دیکھنے لگا۔

"شارق باؤ....." وہ آدمی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس تھیلے کو نیچے رکھو۔ چھپا کر۔ کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہئے۔ ایسی چیزیں چوری چھپے بکتی ہیں اور بڑے پیسے دیتی ہیں۔ عیش کرو گے۔"

"ایسی کیا چیز ہے جو چوری چھپے بکتی ہے؟" شارق نے پڑیا دوبارہ تھیلے میں ڈال دی۔ وہ صرف ایک بات جانتا تھا کہ شراب' افیون' چرس اور ایسی ہی نشہ آور چیزیں چوری چھپے فروخت ہوتی ہیں۔ اس کی نظروں میں ان لوگوں کے چہرے ابھر آئے جو اس کے پاس افغانی پوڈر مانگنے آتے رہے تھے۔ ان میں ہر شخص چہرے سے نشے کا عادی ہی لگتا تھا اور تقریباً ایک گھنٹہ پہلے جو عورت آئی تھی وہ اگرچہ خوبصورت تھی مگر شارق کو اس کی آنکھوں میں بھی نشے کی سرخی نظر آئی تھی۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک نام ابھرا....ہیروئن....اس نے زندگی کے چودہ سال جیل میں گزارے تھے۔ جیل میں اخبار پڑھنے کا موقع کبھی کبھار ہی ملتا تھا۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ کسی خبر میں ہیروئن کا نام پڑھا تھا۔ جیل سے آنے کے بعد بھی وہ اخبار کبھی کبھار ہی پڑھتا تھا۔ تقریباً پندرہ دن پہلے اس نے اخبار میں کسی کا مراسلہ بھی پڑھا تھا جس میں شکایت کی گئی تھی کہ شہر میں جگہ جگہ ہیروئن فروشی کے اڈے قائم ہیں۔ منشیات فروش نوجوان نسل کو تباہ کر رہے ہیں۔ پولیس صورت حال سے اچھی طرح واقف ہے۔ موت کے ان سوداگروں کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔ مگر ان کے خلاف کارروائی نہیں کی جاتی۔ شارق کی نظروں کے سامنے ایک بار پھر وہ چہرے گھومنے لگے۔

"شارق باؤ۔" وہ آدمی اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "تم افغانی پوڈر کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتے یا جان بوجھ کر انجان بن رہے ہو؟"

"یہ کیا ہے' کوئی نشہ آور چیز؟" شارق نے اسے گھورا۔

"اسے ہیروئن کہتے ہیں شارق باؤ۔" اس شخص نے کہا۔ "اس وقت پوری دنیا میں اس کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں تو اس چھوٹی سی پڑیا کی قیمت بھی سو ڈالر سے زیادہ ہوتی ہے۔ مگر یہاں یورپ کے مقابلے میں یہ مال بہت سستا ہے۔ تمہیں ایک پڑیا کے دس روپے ملیں گے۔ گاہک بناتے جاؤ۔ مال کماتے جاؤ۔"

"نہیں۔" شارق نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں یہ کالا دھندہ نہیں کر سکتا۔ یہ لے جاؤ یہاں سے اور آئندہ یہاں مت آنا۔"

"سوچ لو شارق باؤ۔" اس شخص نے شارق کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"سوچ لیا ہے۔ جاؤ' چلے جاؤ یہاں سے۔ ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔" شارق نے دھمکی دی۔

وہ شخص چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر اس نے شاپنگ بیگ اٹھا کر چادر میں چھپایا اور وہاں سے چلا گیا۔ شارق نے بھی دکان بند کر دی اور دن بھر کی کمائی سمیٹ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس رات شارق کو نیند نہیں آ سکی۔ افغانی پوڈر کا راز اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ ہیروئن.... جس نے ہزاروں گھروں کو اجاڑ دیا تھا۔ نئی نسل تباہ ہو رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس ناجائز کاروبار میں آمدنی بہت تھی۔ لوگ راتوں رات دولت مند بن جاتے ہیں۔ لیکن وہ کسی کی بربادی میں حصے دار نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ مریم کو اس نے ماں کا درجہ دیا تھا اور رضیہ کو چھوٹی بہن کی طرح سمجھتا تھا۔ اس طرح تین افراد کے کنبے کی پرورش کے لئے پھلوں کی یہ دکان کافی تھی۔ وہ کسی ناجائز کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

شارق نے مریم یا رضیہ کو اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ رات کو دیر تک جاگنے کے باوجود وہ صبح سویرے اٹھ گیا۔ مریم نے اسے چائے بنا دی۔ اس نے چائے پی اور منڈی روانہ ہو گیا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ منڈی سے مال لا کر وہ دکان پر چھوڑ دیتا۔ گھر آ کر ناشتہ کرتا اور پھر دکان کھولتا۔ اس نے محلے ہی کے ایک لڑکے کو ملازم رکھ لیا تھا جو صبح سے لے کر شام سات بجے تک دکان پر رہتا تھا۔ اس طرح شارق کو اس لڑکے کی وجہ سے دوپہر کو دکان میں کچھ دیر آرام کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

اس روز بھی افغانی پوڈر کے کئی گاہک آئے تھے۔ آج شارق نے انہیں ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب ایک شیراڈ کار دکان کے سامنے آ کر رکی۔ کار میں چار آدمی تھے۔ ایک ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ سر پر بال برائے نام ہی تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں اور سرخ آنکھیں۔ اس نے سفید کرتا اور ریشمی لاچا پہن رکھا تھا۔ وہ شکل ہی سے گنوار لگتا تھا اور گنواروں ہی کی طرح سیٹ پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گہری نظروں سے شارق کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پچھلی سیٹ پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں شکلوں سے لفنگے لگتے تھے۔ سروں پر ریشمی مفلر لپیٹ رکھے تھے۔ انہوں نے بھی کرتے اور لاچے پہنے ہوئے تھے۔ شارق نے سرسری

سی نگاہوں سے کار کی طرف دیکھا اور پھر دکان پر کھڑے ہوئے گاہک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس گاہک جیسے ہی دکان سے رخصت ہوا' کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک آدمی اتر کر دکان پر آ گیا۔

"شارق باؤ' ذرا دکان سے باہر آنا۔ شیرا پہلوان تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" اس آدمی نے کہا۔

"شیرا پہلوان کون؟" شارق نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ گاڑی میں بیٹھا ہے۔ دکان سے باہر آؤ۔ ملاقات تو کرو۔" وہ شخص بولا۔ "ویسے حیرانگی کی بات ہے کہ تم شیرا پہلوان کو نہیں جانتے جبکہ شہر کا بچہ بچہ اس کے نام سے واقف ہے۔"

شارق دکان سے نکل کر گاڑی کے پاس آ گیا۔ اس نے پہلے پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا۔ پہلے جو آدمی بیٹھا ہوا تھا اس کی گود میں کلاشنکوف رائفل رکھی ہوئی تھی۔ دوسری کلاشنکوف ساتھ والی سیٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ یہ اس آدمی کی رائفل تھی جو کار سے اترا تھا۔

"شارق تمہارا نام ہے؟" اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ شیرا پہلوان تھا۔

"جی ہاں' فرمایئے۔" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کل تم نے میرے آدمی کو واپس کر دیا تھا۔" شیرا پہلوان نے اسے گھورا۔

"کونسا آدمی؟ میں سمجھا نہیں۔" شارق بولا۔

"میں نے اپنے ایک آدمی کو افغانی پوڈر دے کر بھیجا تھا۔ مگر تم نے وہ پوڈر رکھنے سے انکار کر دیا اور اسے پولیس کے حوالے کر دینے کی دھمکی دی تھی۔" شیرا پہلوان بولا۔

"میں اس قسم کے کام نہیں کر سکتا پہلوان جی۔" شارق نے جواب دیا۔ "آپ کوئی دوسری دکان تلاش کر لیں۔"

"تم بہت بھولے ہو۔" شیرا پہلوان نے کہا۔ "گھر آئی دولت کو ٹھکرا رہے ہو۔ لوگ راتوں رات دولت مند بننے کے خواب دیکھتے ہیں اور تم دولت مند بننے سے انکار کر رہے ہو۔"

"مجھے ایسی دولت نہیں چاہئے پہلوان جی! آپ کوئی اور بندہ تلاش کر لیں۔ مجھے تو معاف ہی رکھیں۔" شارق کہتا ہوا دکان میں واپس آ گیا۔

شیرا پہلوان عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے باہر کھڑے ہوئے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور کار حرکت میں آ گئی۔

اس رات دس بجے شارق دکان بند کر کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ بھی تھا جس میں مریم اور رضیہ کے لئے کچھ پھل ڈال لئے تھے۔ وہ سڑک پار کر کے ٹانگوں کی طرف آ گیا اور فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ فٹ پاتھ پر لوگوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ کہیں راتوں رات جوان بنا دینے والے کسی سنیاسی باوے نے دکان سجا رکھی تھی اور کہیں ہو چھولے اور حلیم بیچنے والے نے قبضہ جما رکھا تھا۔ حالانکہ سڑک کے اس پار حلیم بیچنے والوں کی بے شمار دکانیں تھیں جہاں مرکری بلب جل رہے تھے۔ حلیم کی یہ دکانیں رات بھر کھلی رہتی تھیں۔

شارق جہاں چل رہا تھا وہاں سے کچھ آگے فضل الٰہی ہسپتال کی دکانیں تھیں۔ ایک دو رات بھر کھلے رہنے والے میڈیکل اسٹورز تھے اور باقی پبلشرز اور بک سیلرز کی دکانیں تھیں۔ کتابوں کی دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ البتہ وہ میڈیکل اسٹورز کھلے ہوئے تھے۔ ان دکانوں سے آگے نعمت کدہ اور آبشار ہوٹل تھے اور ان کے بعد لوہاری گیٹ۔ میڈیکل اسٹور کے سامنے سے گزرتے ہوئے شارق کو یاد آ گیا کہ اسے ماں جی کے لئے دوا لینی تھی۔ مریم چند روز سے گردے میں تکلیف محسوس کر رہی تھی اور ڈاکٹر نے کچھ دوائیں لکھ کر دی تھیں جنہیں وہ باقاعدگی سے استعمال کر رہی تھی۔ آج صبح گھر سے نکلتے ہوئے مریم نے اسے کہا تھا کہ واپسی پر گولیاں لیتا آئے۔

شارق نے ایک میڈیکل اسٹور سے مطلوبہ گولیاں لیں۔ پیسے ادا کئے اور گولیوں والی تھیلی جیب میں رکھتا ہوا آگے چل پڑا۔ نعمت کدہ اور آبشار ہوٹل کے سامنے بڑی رونق تھی۔ ہوٹلوں کے سامنے میزیں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور بے فکرے اور منچلے بیٹھے چائے کی چسکیوں کے ساتھ بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ یہ لوہاری کا چوک تھا اور یہاں رات بھر چہل پہل رہا کرتی تھی۔

شارق میڈیکل اسٹور سے نکل کر چند گز آگے بڑھا ہی تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک سفید کار اس کے قریب آ کر رکی۔ دو آدمی نیچے اترے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں پستول تھے اور وہ دونوں شارق کے دائیں بائیں پہنچ گئے۔

"شارق باؤ۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "خاموشی سے ہمارے ساتھ اس کار میں بیٹھ جاؤ۔ شور مچانے یا بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ ہمارے ہاتھوں میں پستول اصلی ہیں' نقلی نہیں۔"

"کک... کون ہو تم لوگ؟" شارق ہکلایا۔ "میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔"

"ہمیں تمہاری رقم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بیٹھو گاڑی میں۔" دوسرا آدمی غرایا۔

شارق کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ خاموشی سے کار میں بیٹھ گیا۔ ایک آدمی اس کے دائیں طرف بیٹھ گیا تھا اور دوسرا بائیں طرف۔ اس طرح وہ ان دونوں کے بیچ میں سینڈوچ بن کر رہ گیا تھا۔ کار حرکت میں آ گئی اور لوہاری کے چوک سے گھوم کر دوبارہ بھاٹی کی طرف دوڑنے لگی۔ بھاٹی کے

چوک سے کار بائیں طرف مڑ گئی۔ اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ تقریباً نصف میل آگے
چوک تھا جہاں سے ایک سڑک چوبرجی کی طرف چلی گئی تھی اور ایک جین مندر کی طرف
ہوتی ہوئی جی پی او اور اسٹیٹ بینک کی پرشکوہ عمارتوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی مال روڈ کو قطع
کر کے میکلوڈ روڈ سے جا ملتی تھی۔

وہ کار دائیں یا بائیں مڑنے کے بجائے چوراہا پار کر کے سیدھی ریواز گارڈن کی طرف جانے
والی سڑک پر نکل گئی۔ شارق نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ اس کے منہ سے بے اختیار گہرا
سانس نکل گیا تھا۔

○

وہ کار مختلف سڑکوں پر گھومتی رہی۔ ان سڑکوں کے دونوں طرف وسیع و عریض رہائشی بنگلے تھے۔ کسی سڑک کے موڑ پر کوئی ایک آدھ دکان بھی نظر آ جاتی۔

ان دونوں آدمیوں میں سے کسی نے بھی راستے کو خفیہ رکھنے کے لئے شارق کی آنکھوں پر پٹی وغیرہ باندھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ڈرائیور بڑے اطمینان سے متوسط رفتار سے کار چلا رہا تھا۔ ان میں سے کسی نے شارق سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا اور نہ ہی شارق نے کچھ پوچھا تھا کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ یہ لوگ اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیں گے۔

ویسے اس کے دل میں ہلکا سا خوف موجود تھا۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ یہ کون لوگ تھے اور اسے اس طرح اغواء کر کے کیوں لے جایا جا رہا تھا؟ اگر یہ لوگ رہزن یا ڈاکو ہوتے تو اس کی جیبیں خالی کر کے، ڈرا دھمکا کر کسی ویران سڑک پر اتار کر چلے جاتے۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی اس کی جیب سے رقم نکالنے یا تلاشی لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پھلوں والا تھیلا بھی شارق کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے اس تھیلے کو بھی نہیں چھوا تھا۔

کار ایک ایسی سڑک پر مڑ گئی جس کے دونوں طرف وسیع و عریض کوٹھیاں تھیں۔ اس وقت تقریباً سوا گیارہ بجے ہوں گے۔ بیشتر کوٹھیوں پر سناٹا طاری تھا۔ بعض کوٹھیوں میں روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔

وہ کار ایک کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ اس کوٹھی کے گیٹ کے سامنے پہلے ہی دو کاریں کھڑی تھیں۔ شارق والی کار کے ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ کوٹھی کا گیٹ کھل گیا اور وہ کار کو اندر لیتا چلا گیا۔ کار کے اندر داخل ہوتے ہی گیٹ بند ہو گیا۔ وہ دونوں آدمی اپنی اپنی طرف کے دروازے کھول کر نیچے اتر آئے۔

"اتر آؤ شارق باؤ۔ ہماری منزل آ گئی ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "اور اپنا یہ پھلوں والا تھیلا سیٹ پر ہی چھوڑ دینا۔ کوئی نہیں کھائے گا انہیں۔"

شارق تھیلا سیٹ پر چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ اس نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ بہت بڑی کوٹھی تھی۔ وسیع و عریض لان تھا۔ آمد و رفت کے لئے دو گیٹ تھے۔ ایک پختہ روش کوٹھی کے برآمدے کے سامنے سے ہوتی ہوئی دونوں گیٹوں کی طرف چلی گئی تھی۔ لان میں اگرچہ فینسی لائٹس کے پول لگے ہوئے تھے لیکن کسی پر بھی کوئی بلب روشن نہیں تھا۔ صرف برآمدے میں ایک بلب جل رہا تھا۔ جس شخص نے گیٹ کھولا تھا اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ لیکن دائیں کندھے پر رائفل کی اٹھی ہوئی نال اس چادر میں سے بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

وہ دونوں اسے لے کر برآمدے والے دروازے میں داخل ہو گئے۔ سامنے ایک راہداری تھی۔ جس کے دائیں بائیں کمرے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے شارق نے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ قالین پر چار آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ریوالور کے ساتھ آٹومیٹک رائفلیں ا-ستادہ تھیں۔

وہ راہداری میں بائیں طرف مڑ کر ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر قالین پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو شارق نے فوراً ہی پہچان لیا وہ شیرا پہلوان تھا۔ شیرا پہلوان کو دیکھ کر شارق کے پورے جسم میں انجانے خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ دوسرے آدمی کو شارق نہیں جانتا تھا۔ اس نے بھی کرتا اور ریشمی لاچا پہن رکھا تھا۔ اسکی عمر بھی چالیس پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہو گا۔ قد "نسبتاً" چھوٹا اور جسم قدرے بھاری بھرکم تھا۔

"ہم شارق باؤ کو لے آئے ہیں شیرا پہلوان۔" شارق کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"اس کو بٹھاؤ ادھر۔" شیرا پہلوان نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "کوئی خاطر شاطر کرو اس کی۔ ٹھنڈا شنڈا پلاؤ۔ مہمان ہے ہمارا۔ میں ذرا چھوٹے پہلوان سے بات کر لوں تو شارق باؤ سے بھی نظر لت کرتا ہوں۔"

"بیٹھو شارق باؤ۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

شارق دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں آدمی باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر ان میں سے ایک نے کوک کی ٹھنڈی بوتل لا کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ شارق کا حلق سوکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت واقعی پانی یا اسی قسم کی کسی چیز کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے بوتل سے چسکیاں لے رہا تھا۔ وہ شیرا پہلوان اور چھوٹے پہلوان کی باتیں بھی سن رہا تھا۔

"یار چھوٹے پہلوان۔ مان لے میری بات۔" شیرا پہلوان کہہ رہا تھا۔ "کل کراچی کی پارٹی آنے والی ہے۔ اس کے لئے بھی مال کا بندوبست کرنا ہے۔ میں تمہیں ایک کلو جو دے رہا ہوں وہی لے جا آج۔ پرسوں تک اور مال آ جائے گا۔ جتنا چاہے لے جانا۔"

"اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات ہے۔" چھوٹے پہلوان نے کہا۔ "ایک کلو کا کیا کروں گا۔ روز کے گاہکوں کو کیا جواب دوں گا۔"

"مجھے بھی تو اپنے روز کے گاہکوں کا خیال رکھنا ہے چھوٹے پہلوان۔" شیرا پہلوان نے کہا۔ "سب کو تھوڑا تھوڑا مال دے رہا ہوں کہ کہیں کوئی ناراض نہ ہو جائے۔ ایک کلو لے جا میرا کام چلانے کا ایک نسخہ بتایا تھا مگر بات تیری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ جگہ سونے کی کان ہے جہاں تم نے پہلوں کی دکان کھول رکھی ہے۔ ٹھیک ہے' اپنی دکانداری کرتے رہو۔ مگر اس کے ساتھ یہ کام کرو یہ تم زیادتی کر رہے ہو میرے ساتھ شیرا پہلوان۔" چھوٹے پہلوان نے کہا۔ "تمہیں تو میرے تو تمہارے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ عیش کرو گے ساری زندگی۔ اس بھی کئی کوٹھیاں بنا لو گے۔ لوگ جھک جھک کر تمہیں سلام کریں گے۔"

"میں سب کا زیادہ خیال رکھتا ہوں۔ لا' رقم نکال۔" شیرا پہلوان بولا۔

"لیکن پہلوان جی' میں یہ ناجائز کام نہیں کرنا چاہتا۔" شارق نے جواب دیا۔ "ایک ناکردہ چھوٹے پہلوان نے گھٹنے کے نیچے دبا ہوا کپڑے کا میلا سا تھیلا نکال کر اس میں سے پانچ جرم میں چودہ سال سزا کاٹ کر آیا ہوں۔ میں شرافت کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ میں ایک شریف اور ہزار روپے کے نوٹوں کی ایک ایک گڈی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ تھیلے میں اور بھی آدمی ہوں۔" گڈیاں موجود تھیں۔

"گن لو' پورے ڈیڑھ لاکھ ہیں۔"

"میں بھی تمہاری طرح ایک شریف آدمی تھا اور شرافت کی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔" شیرا "تم پر کوئی بے اعتباری نہیں چھوٹے پہلوان۔ یہ پہلی مرتبہ یہاں آئے ہو۔" شیرا پہلوان نے کہتے ہوئے شیدے نام کے کسی آدمی کو آواز دی۔ چند سیکنڈ بعد ہی ایک دبلا پتلا سا نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سال رہی ہو گی۔ چھوٹی گول داڑھی تھی اور سر پر چیک دار کپڑے کا صافہ لپٹا ہوا تھا۔ ماتھے پر محراب کا نشان تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ ابھی مسجد سے نماز پڑھ کر آیا ہو۔

"شیدے پتر۔ یہ پیسے لے جا اور چھوٹے پہلوان کو ایک تھیلا لا کر دے۔" شیرا پہلوان کہتے ہوئے نوٹوں کی گڈیاں اس باریش نوجوان کے ہاتھوں میں تھما دیں۔"

شیدا کمرے سے چلا گیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد اس نے پیکٹ کی طرح لپٹا ہوا ایک کالا تھیلا کر چھوٹے پہلوان کو دے دیا۔ چھوٹے پہلوان نے وہ پیکٹ کپڑے کے میلے سے تھیلے میں رکھا اور شیرا پہلوان سے ہاتھ ملا کر کمرے سے نکل گیا۔

اب کمرے میں شیرا پہلوان اور شارق رہ گئے تھے۔

"ادھر' میرے قریب آ شارق باؤ۔ تو گھبرا کیوں رہا ہے؟" شیرا پہلوان نے کہا۔

"مجھے اس طرح اغواء کر کے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔" شارق نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں خوف نمایاں تھا۔

"تجھے سمجھانے کے لئے۔" شیرا پہلوان نے کہا۔ "کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس دنیا میں دولت ہی سب کچھ ہے۔ دولت سے دنیا کی ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان بھی خریدے جا سکتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس دولت ہو تو لوگ جھک جھک کر اسے سلام کرتے ہیں اور اگر دولت نہ ہو تو اسے ٹھوکریں ماری جاتی ہیں۔ میں نے تمہیں بڑی آسانی سے دولت کمانے کا ایک نسخہ بتایا تھا مگر بات تیری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ جگہ سونے کی کان ہے جہاں تم نے پہلوں کی دکان کھول رکھی ہے۔ ٹھیک ہے' اپنی دکانداری کرتے رہو۔ مگر اس کے ساتھ یہ کام کرو تمہارے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ عیش کرو گے ساری زندگی۔ اس کئی کوٹھیاں بنا لو گے۔ لوگ جھک جھک کر تمہیں سلام کریں گے۔"

"لیکن پہلوان جی' میں یہ ناجائز کام نہیں کرنا چاہتا۔" شارق نے جواب دیا۔ "ایک ناکردہ جرم میں چودہ سال سزا کاٹ کر آیا ہوں۔ میں شرافت کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

شارق نے کہا۔ "لیکن مجھے اس راستے پر ڈال دیا گیا جس پر میں نہیں چلنا چاہتا تھا۔ آج مجھے پتہ چلا ہے کہ شرافت کا دوسرا نام دولت ہے۔ میرے پاس بڑی بڑی شان والے لوگ آتے ہیں' ایسے لوگ جن کی معاشرے میں بڑی عزت ہے۔ لیکن وہ میرے سامنے نظریں جھکا کر کھڑے ہوتے ہیں۔"

"میں اپنے حالات سے مطمئن ہوں پہلوان جی۔" شارق نے کہا۔ "میں نے پہلے بھی کہا تھا آپ کوئی اور بندہ دیکھ لیں۔"

"بات یہ ہے کہ تمہاری وہ دکان ہمارا بہت پرانا اڈہ ہے۔ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے اس سے ہمارے گاہک وہیں آتے تھے۔ لطیف نے شرافت سے وہ دکان خالی کر دی۔ ہمارا خیال تھا کہ تم سے کام لیں گے۔ لیکن تمہاری ضد کی وجہ سے ہم کئی دن سے نقصان اٹھا رہے ہیں۔ خیر نہ سہی۔ تم یہ کام نہیں کرنا چاہتے تو وہ دکان ہمیں دے دو۔ منہ مانگی قیمت دے سکتا ہوں۔" اسے پہلوان نے کہا۔

"نہیں پہلوان جی۔" شارق نے جواب دیا۔ "وہ دکان میرے باپ دادا کی نشانی ہے۔ میں کی قیمت پر بھی نہیں بیچ سکتا۔"

"جلدی میں کوئی فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔" شیرا پہلوان نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کر لینا' کل شام کو میرا آدمی آئے گا۔ اسے بتا دینا۔"

"میرا جواب کل بھی یہی ہو گا۔" شارق نے جواب دیا۔

"بڑے ضدی ہو۔" شیرا پہلوان نے کہا' پھر رفیق کا نام لے کر کسی کو آواز دی۔ ایک آدمی اندر آ گیا۔ یہ ان میں سے ایک تھا جو شارق کو یہاں لائے تھے۔ "اوئے رفیق!" شیرا پہلوان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شارق باؤ کو چھوڑ آ' یار یہ ہمارے کام کا نہیں ہے۔" وہ شارق کی طرف مڑ گیا۔ "جا شارق باؤ' تو تو بالکل ہی نکما نکلا۔"

"بھولا آیا ہوا ہے شیرا پہلوان۔" رفیق نے کہا۔

"اس سے کہہ دے آج مال نہیں ہے۔ کل آ جائے۔" شیرا پہلوان نے کہا۔ "جا پہلے اسے چھوڑ آ۔ اس کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"چل شارق باؤ۔" رفیق نے اشارہ کیا۔

شارق ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کمرے سے باہر نکلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ کار اب بھی برآمدے کے سامنے کھڑی تھی۔ شارق جلدی سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ رفیق نے ڈرائیور یا دوسرے آدمی کو بلانے کی بجائے خود ہی اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ اس نے جیسے ہی انجن اسٹارٹ کیا لان میں ٹہلتے ہوئے گن مین نے گیٹ کھول دیا۔ کار گیٹ سے نکل کر مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ اس مرتبہ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔

شارق زندگی میں پہلی مرتبہ اس طرف آیا تھا۔ ماں باپ کے قتل سے پہلے وہ آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا۔ گھر سے دکان اور دکان سے گھر۔ کہیں ادھر ادھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنی زندگی کے چودہ سال جیل کے حصار میں گزرے تھے۔ ان چودہ برسوں میں وہ راستے بھی اس کی نظروں سے دھندلا گئے تھے جن پر وہ بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ جیل سے آئے ہوئے ابھی دو مہینہ ہی ہوا تھا' اپنے علاقے کے کچھ دوستوں سے واقف ہوا تھا یا منڈی کا راستہ معلوم ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ لاہور کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس طرف پہلی مرتبہ آیا تھا اور راستوں کو ذہن میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم تو بے وقوف ہو شارق باؤ۔" رفیق نے کار ایک سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔ "چھوٹے پہلوان کو دیکھا تم نے؟ یہ باغبانپورے کا بہت بڑا بدمعاش ہے۔ چند سال پہلے بالکل سوکھا سڑا سا کرتا تھا۔ حلوائی کی دکان پر کڑاہیاں مانجھا کرتا تھا۔ کبھی کسی کی نوکری کرتا' کبھی کسی کی مار کھاتا۔ ہمارے شیرا پہلوان کو اس پر ترس آ گیا۔ اسے پان سگریٹ کی دکان کھول دی اور ساتھ ہی

دھندہ شروع کرا دیا۔ بڑا جادو ہے اس افغانی پوڈر میں۔ اب یہ باغبان پورے کا سب سے مشہور آدمی ہے۔ اس نے اپنا اکھاڑہ بھی بنا لیا ہے۔ پہلوان بن گیا ہے' لیکن اسے پہلوانی نہیں آتی۔ بڑے بڑے اونچے شملے والے لوگ آتے ہیں اس کے پاس۔ بڑے تعلقات ہو گئے ہیں اس کے بھی۔ میں تو کہتا ہوں تو بھی شیرا پہلوان کی بات مان لے۔ قسم رب کی' عیش کرے گا۔"

"نہیں بھائی' میرا دل نہیں مانتا ایسے کاموں میں۔" شارق نے جواب دیا۔

رفیق بڑبڑا کر خاموش ہو گیا۔ کار مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی بالآخر لوہاری گیٹ کے سامنے رک گئی۔ شارق نے نیچے اتر کر رفیق کا شکریہ ادا کیا۔ سوا بارہ بج رہے تھے۔ چوک پر اب بھی رونق تھی۔ ہوٹلوں کے سامنے لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پان کی دکانوں کے سامنے کھڑے منچلے پان چباتے ہوئے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ دو لڑکے موتیے کے ہار بیچتے پھر رہے تھے۔

شارق ادھر ادھر دیکھتا ہوا گیٹ کی محراب کے اندر داخل ہو گیا۔ مختلف گلیوں میں چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ ماں جی اور رضیہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔ وہ ساڑھے دس بجے دکان بند کرتا تھا اور زیادہ سے زیادہ بارہ بجے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ لیکن آج ساڑھے بارہ بج گئے تھے۔

جب وہ مکان والی گلی میں داخل ہوا تو اس کا خیال درست نکلا۔ مریم اور رضیہ مکان کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ ان کے چہروں پر پریشانی نمایاں تھی۔

"ماں جی۔ آپ لوگ دروازے میں کیوں کھڑی ہیں؟" شارق نے قریب پہنچ کر کہا۔

"کہاں چلا گیا تھا پتر؟" مریم نے راستہ دیتے ہوئے کہا۔ "دو مرتبہ ہو کر آئی ہوں تمہاری دکان سے۔ دوسرے دکانداروں نے بتایا تھا کہ تو ساڑھے دس بجے دکان بند کر کے چلا گیا تھا۔"

"راستے میں ایک پرانا دوست مل گیا تھا۔ وہ مجھے زبردستی اپنے گھر لے گیا تھا۔" شارق نے جواب دیا۔ اور پھلوں والا تھیلا رضیہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"کہیں جانا ہو تو بتا دیا کریں۔" رضیہ نے کہا۔ "آپ کو دیر ہو جاتی ہے تو دل میں ہول سے اٹھنے لگتے ہیں۔"

"اچھا' آئندہ بتا کر جایا کروں گا۔ چلو اب کھانا دے دو۔ بڑی زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" شارق نے رضیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ اماں نے بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ آپ کمرے میں چلیں۔ میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔" رضیہ کہتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

شارق اظہار ندامت کے سوا کچھ نہیں کر سکا تھا۔ وہ دونوں اس کی وجہ سے بھوکی بیٹھی رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد رضیہ کھانا گرم کر کے لے آئی۔ کھانے کے دوران ہی شارق کو ماں جی کی دوا

یاد آ گئی۔ اس نے گولیوں والی تھیلی نکال کر مریم کی طرف بڑھا دی۔

"یہ آپ کی دوا کی گولیاں ہیں۔" اس نے کہا۔

"اچھا کیا تم نے، گولیاں لے آئے۔ ختم ہو گئی تھیں۔" مریم نے تھیلی لیتے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد شارق اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ مریم اور رضیہ کے بارے سوچنے لگا۔ کتنی چاہت تھی ان دونوں کو اس سے۔ اس کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا آدھی رات گزر جانے کے بعد بھی پریشان صورت باہر کھڑی اس کی راہ تکتی رہی تھیں۔ پھر کے ذہن میں شیرا پہلوان کا خیال آ گیا۔ آج جو کچھ اس نے دیکھا تھا اس سے اندازہ ہو گیا تھا ہیروئن کے کاروبار میں کتنی کمائی ہے۔ چھوٹا پہلوان اسے ڈیڑھ لاکھ روپے دے کر گیا تھا اور کے بدلے جو ہیروئن کا پیکٹ دیا گیا تھا اس کا وزن زیادہ سے زیادہ ایک کلو رہا ہو گا اور شارق یقین تھا کہ چھوٹا پہلوان اس سے دوگنی رقم کمائے گا اور شاید اس لئے شیرا پہلوان اس دکان لئے اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ یہ ان کا پرانا اڈا تھا اور یہاں بھی روزانہ لاکھوں کا دھندہ ہوتا ہو کچھ لوگ تو اب بھی آ کر افغانی پوڈر مانگتے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جو وہ بدلی ہوئی دیکھ کر پوچھے بغیر چلے جاتے ہوں گے۔ شیرا پہلوان نے اسے اس دکان کے لئے منہ قیمت کی پیش کش بھی کر دی تھی۔ لیکن شارق کا اس دکان کو بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

شارق یہی سب کچھ سوچتے ہوئے نیند کی آغوش میں پہنچ گیا اور صبح اٹھ کر اپنے معمو میں مصروف ہو گیا۔ دوسرے دن شام کو شیرا پہلوان کا ایک آدمی دکان کی فروخت کے سلسلے اس کا فیصلہ معلوم کرنے کے لئے آیا تھا۔ شارق نے اسے جواب دے دیا کہ اس کا دکان کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہ شخص خاموشی سے واپس چلا گیا۔

تین چار روز گزر گئے۔ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ البتہ افغانی پوڈر کے گاہک آتے رہے۔ جنہیں شارق ڈانٹ کر بھگاتا رہا۔ اس دوران شیرا پہلوان کا کوئی آدمی نہیں آیا شارق نے یہ سمجھ لیا کہ شیرا پہلوان نے یقیناً اس دکان کا خیال ذہن سے نکال دیا ہو گا۔

اس روز رات کے آٹھ بجے تھے۔ شٹل کاک برقع والی ایک عورت پھل لینے کے لئے کی دکان پر آئی۔ اس نے برقع کا نقاب اٹھایا ہوا تھا۔ خوبصورت عورت تھی۔ شارق کے اندا کے مطابق اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس نے دو تین قسموں کے پھل خریدے تھے۔ پیسے دیتے وقت اس نے سیاہ رنگ کا ایک شاپنگ بیگ بھی پھلوں کے قریب رکھ دیا۔ اس تھیلے کی گرہ لگی ہوئی تھی۔

"بھائی، سامان ذرا یہیں رکھو۔ میرا یہ تھیلا بھی رکھ لو۔ میں ذرا دربار سے ہو

ہوں۔" اس عورت نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ ہو آیئے۔" شارق نے کہتے ہوئے وہ تمام تھیلے اٹھا کر نیچے دکان کے اندر کی طرف رکھ دیئے۔

وہ عورت تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی داتا دربار کی طرف چلی گئی۔ شارق اپنی دکان داری میں لگ گیا۔ کچھ دیر تک تو اسے شٹل کاک برقع والی اس عورت کا خیال رہا پھر وہ اسے بھول گیا۔ تقریباً دس بجے وہ کوئی چیز اٹھانے کے لئے نیچے جھکا تو اس کی نظر ان تھیلوں پر پڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے شٹل کاک برقع والی عورت یاد آ گئی۔ تین تھیلوں میں تو پھل تھے اور چوتھا تھیلا وہ عورت چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دو گھنٹے ہو چکے تھے اور وہ عورت ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ اس نے یہ سوچ کر سر جھٹک دیا کہ بعض عقیدت مند گھنٹوں دربار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ عورت بھی ابھی تک دربار میں بیٹھی ہوئی ہو۔

تقریباً پانچ منٹ اور گزر گئے۔ اچانک ہی پانچ چھ پولیس والے اس کی دکان پر آ گئے ان میں ایک سب انسپکٹر بھی تھا۔ یہ سب انسپکٹر کبھی کبھار پھل وغیرہ لینے کے لئے دکان پر آتا رہتا تھا اور ہمیشہ اس سے سلام دعا ہوتی تھی لیکن آج وہ پولیس والوں کو لے کر جس طرح اس کی دکان پر آیا تھا اس سے شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔

"کیا بات ہے سر جی؟ کیا معاملہ ہے؟" شارق نے پوچھا۔

"باہر نکلو دکان سے۔" تھانیدار دھاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شارق کو پکڑ کر دکان سے باہر کھینچ لیا تھا۔ پولیس والے رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ سب انسپکٹر اس کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ اس کی جیبوں سے برآمد ہونے والی رقم اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ٹھونس لی۔

"دکان کی تلاشی لو۔" سب انسپکٹر نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔

دو کانسٹیبل دکان میں گھس گئے۔ انہوں نے چند ہی منٹ میں دکان کو اس طرح الٹ پلٹ کر رکھ دیا جیسے کوئی بیرونی حملہ آور مال غنیمت پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ آس پاس کے دکاندار اور راہگیر بڑی تعداد میں وہاں جمع ہو گئے تھے اور ایک کانسٹیبل انہیں ڈانٹتے ہوئے وہاں سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ارے طفیل۔ کیا بات ہے۔ اس کی دکان پر چھاپہ کیوں مارا ہے؟" ایک پڑوسی دکان دار نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ یہاں کے دکاندار تقریباً سب ہی پولیس والوں کو جانتے تھے کیونکہ تھانہ سامنے مائی لہ چوک کے دوسری طرف۔ بھاٹی گیٹ کے بالکل ساتھ۔

"مخبری ہوئی ہے۔ یہ آدمی ہیروئن بیچتا ہے۔" طفیل نے سرگوشی میں بتایا۔

"کیوں شریف آدمی کو ذلیل کرتے ہو تم لوگ۔ جب یہاں پان کی دکان تھی اور ہیروئن کا کاروبار ہوتا تھا تو اس وقت تو تم لوگوں نے کبھی چھاپا نہیں مارا تھا اور اب ایک شریف آدمی پر چڑھ دوڑے ہو تم لوگ۔" دکاندار نے کہا۔

"جا یار۔ تو اپنی دکان پر بیٹھ جا کے۔ یہ سب انسپکٹر بڑا کرخت ہے۔ کہیں تمہیں بھی نہ سر جا کر بند کر دے۔" کانسٹیبل طفیل نے کہا۔ پھر دوسرے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔ "ہٹو یہاں سے تم لوگ۔ کیوں مجمع لگا دیا ہے۔ پہلے کبھی پولیس نہیں دیکھی۔"

"ایسی پولیس تو واقعی پہلے کبھی نہیں دیکھی جو مجرموں کو پناہ دے اور شرفاء کو سر عام ذلیل کرے۔" ایک بوڑھے نے جواب دیا۔

یہ جملہ سب انسپکٹر نے بھی سن لیا۔ اس نے مڑ کر خونخوار نظروں سے بوڑھے کی طرف دیکھا۔

"سر جی.... یہ دیکھیں۔" دکان کے اندر ایک کانسٹیبل نے کالے رنگ کے شاپنگ بیگ کی گرہ کھول کر اس میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ہیروئن کی پڑیاں بھری ہوئی ہیں اس میں۔"

سب انسپکٹر نے وہ تھیلا لے لیا۔ اس میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر پڑیاں نکال لیں اور لوگوں کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھ لی اس کی شرافت آپ لوگوں نے؟ بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے تھے۔ یہ ہیروئن ہم اپنے ساتھ لے کر نہیں آئے۔ آپ لوگوں کے سامنے اس دکان سے برآمد ہوئی ہے۔"

"اگر تم لوگ چاہتے تو اس دکان سے ایٹم بم بھی برآمد کر سکتے تھے۔" اس بوڑھے نے کہا۔

"جا بابا' یہاں سے چلا جا' کیوں تیری شامت آئی ہے۔" ایک کانسٹیبل نے بوڑھے کو بازو سے پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا۔

"کیوں اوئے۔ کب سے دھندہ کر رہا ہے۔" سب انسپکٹر نے کہتے ہوئے اچانک ہی شارق کو تھپڑ مار دیا۔

"مم.... میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" شارق گال سہلاتے ہوئے ہکلایا۔ "ایک عورت پھل خریدے تھے۔ خریدے ہوئے پھل اور یہ تھیلا وہی عورت رکھ کر گئی تھی۔ اس نے کہا کہ داتا دربار جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس آ کر لے لے گی۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں آئی۔"

"جھوٹ بکتا ہے۔" تھانیدار نے اس کی پٹائی شروع کر دی۔ "کالا دھندہ کرتا ہے۔ لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیل رہا ہے۔ کئی دن سے تمہارے بارے میں اطلاعات مل رہی تھیں۔

پکڑا ہی گیا نا۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ زندگی بھر کے لئے سلاخوں کے پیچھے بند کروا دوں گا۔"

"میرا اس تھیلے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں بے قصور ہوں۔" شارق چیخا۔

"تمہاری دکان سے مال برآمد ہو گیا اور اب بھی کہتا ہے بے قصور ہوں۔ پتہ تو تمہیں تھانے جا کر چلے گا بچو جی۔" ایک کانسٹیبل بھی کہتے ہوئے اس پر پل پڑا۔

"دکان کی اچھی طرح تلاشی لو۔ کچھ اور بھی ہو گا۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"چیک کر لیا ہے سر جی۔" ایک کانسٹیبل نے کہا۔ "دکان میں تو اور کچھ نہیں ہے۔ شاید گھر میں مال چھپا رکھا ہو۔"

"اسے تھانے لے چلو۔ پتہ کر لیتے ہیں سب کچھ اس سے۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

وہ لوگ شارق کو مارتے پیٹتے ہوئے تھانے کی طرف لے چلے۔ بہت سے لوگ اب بھی دکان کے سامنے جمع تھے اور مختلف قسم کے تبصرے کر رہے تھے۔ بعض لوگ اسے مجرم گردان رہے تھے اور بعض لوگ اس کی شرافت کی قسمیں کھا رہے تھے۔

"یہ سب پولیس کے کھانے پینے کے چکر ہیں۔" ایک آدمی نے کہا۔ "جو لوگ پولیس والوں کو بھتہ نہیں دیتے ان کا یہی حشر ہوتا ہے۔"

"اوئے کاکے۔" پڑوسی دکان والے نے اپنے نوکر کو آواز دی۔ "یہ سارا سامان سمیٹ کر دکان کا شٹر گرا دے اور شارق باؤ کے گھر میں جا کر اطلاع کر دے۔"

ایک عورت میری دکان پر رکھ کر گئی تھی' میں بالکل بے قصور ہوں۔"

قریب کھڑے ہوئے سب انسپکٹر نے اس کے منہ پر زور دار گھونسہ رسید کر دیا۔ شارق لڑکھڑاتا ہوا کرسی سے ٹکرایا اور کرسی سمیت الٹ گیا۔ اس کا سر دیوار سے لگا۔ پیشانی کی کھال پھٹ گئی اور خون رسنے لگا۔ سب انسپکٹر نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ میں زور دار گھونسہ مار دیا۔ شارق کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"اسے دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اور اس سے معلوم کرو کہ اس دھندے میں اس کے ساتھ اور کون کون ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے یہ کسی بڑے گروہ کا آدمی ہے۔"

سب انسپکٹر شارق کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔

"بتا کب سے یہ دھندہ کر رہا ہے اور کتنے لوگ ہیں تمہارے ساتھ۔" سب انسپکٹر نے اس کے پیٹ پر ایک اور گھونسہ مارا۔

"مم.... میں کچھ نہیں جانتا۔" شارق چیخا۔ "میں.... میں بے قصور ہوں۔"

"ابھی تم سب کچھ بتا دو گے۔" سب انسپکٹر نے اس مرتبہ اس کے سینے پر مکا مارا۔

"خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ میں بے قصور ہوں۔ میرا اس دھندے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" شارق چیخ رہا تھا۔

سب انسپکٹر تقریباً آدھے گھنٹے تک شارق کی دھنائی کرتا رہا اور شارق کی چیخیں تھانے میں گونجتی رہیں۔ اسے ادھ موا کر کے سب انسپکٹر ایس ایچ او کے کمرے میں آ گیا۔ وہ معزز آدمی جا چکا تھا جو پہلے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں مریم روتی دھوتی تھانے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ملک منیر بھی تھا۔

"کیا قصہ ہے تھانیدار صاحب! اس کے بیٹے کو کیوں پکڑا ہے؟" ملک منیر نے علیک سلیک کے بعد کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ یہ اس کا حلقہ انتخاب نہیں تھا مگر اس کے تعلقات تو ہر جگہ تھے۔

"کس لڑکے کی بات کر رہے ہو ملک صاحب؟" تھانیدار نے گھورتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہی پھل فروش۔" ملک منیر نے جواب دیا۔

"اچھا وہ۔ منشیات فروش۔" تھانیدار بولا۔ "آپ کا اس سے کیا تعلق ہے ملک صاحب؟"

"وہ میرے علاقے کا آدمی ہے۔ اور اسے تم نے منشیات فروش کیسے کہہ دیا۔" ملک منیر نے کہا۔

"ملک صاحب!" انسپکٹر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس لڑکے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ ممکن ہے لوہاری والے تھانیدار نے کسی سے پیسہ کھا کر اسے جرم کے بغیر پکڑ لیا ہو۔ آپ کی مداخلت سے اس کی نوکری بھی گئی اور وہ اپنے خلاف کیس بھگت رہا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ کچھ مختلف ہے۔ اس کی دکان سے یہ ہیروئن برآمد ہوئی ہے آپ کے سامنے رکھی ہے۔ بہتر ہے آپ اس معاملے سے الگ رہیں۔"

"یہ ہیروئن تو آپ کے گھر سے بھی برآمد ہو سکتی ہی۔" ملک منیر نے کہا۔

"ملک صاحب!" انسپکٹر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا تھا

"بیٹھو... بیٹھو.... آرام سے بیٹھو۔ اکڑنے کی ضرورت نہیں۔" ملک منیر نے پرسکون لہجے کہا۔ "دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے نا تو بھی تم لوگ نہیں سدھر سکو گے۔ میں جانتا ہوں یہ ہیرو کہاں سے آئی ہو گی۔ تم مجھے بھی جانتے ہو۔ میں کبھی غلط آدمی کی سفارش نہیں کرتا۔ ہیرو برآمد کرنے کا شوق ہے نا تو میرے ساتھ چلو.... میں بتاتا ہوں تمہارے علاقے میں ہیروئن کہا

کہاں بکتی ہے۔ ان اڈوں پر کئی سالوں سے کھلے عام ہیروئن بک رہی ہے۔ مگر تم نے وہاں سے کبھی ہیروئن برآمد نہیں کی۔ کسی کو نہیں پکڑا۔"

"یہ ہیروئن اس پھل والے کی دکان سے برآمد ہوئی ہے ملک صاحب!" تھانیدار نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "سب انسپکٹر نے اطلاع ملنے پر چھاپہ مارا تھا اور یہ ہیروئن کئی لوگوں کی موجودگی میں اس کی دکان سے برآمد ہوئی ہے۔"

"یہ ٹیلی فون مجھے دو نا۔" ملک منیر نے کہا۔ "میں ابھی تمہارے گھر میں چھاپہ پڑواتا ہوں اور ملے والوں کے موجودگی میں تمہارے گھر سے ہیروئن بھی برآمد ہو گی اور ناجائز اسلحہ بھی۔"

"ملک صاحب!" انسپکٹر نے خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ ایک عزت دار آدمی ہیں۔ میں بھی آپ کی عزت کرتا ہوں۔"

"عزت انہی کی کی جاتی ہے جن کی عزت ہو۔" ملک منیر نے کہا۔ "میں اس لڑکے کی ضمانت دینے کے لئے آیا ہوں۔"

"ضمانت تو آپ عدالت میں دے سکیں گے جب اس کا چالان پیش ہو گا۔" تھانیدار نے کہا۔ "جب اسے عدالت میں پیش کیا جائے گا تو آپ کو بتا دیا جائے گا۔ آپ عدالت میں پیش ہو کر اس کی ضمانت کروا لیں۔"

"ٹھیک ہے تھانیدار۔" ملک منیر کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ "میری ایک بات یاد رکھو۔ بے گناہوں پر ظلم کر کے تم اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اپنی ذلت اور رسوائی کا سامان کر رہے ہو۔ چلو بہن مریم۔" اس نے آخری الفاظ مریم سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔ "تمہارا بیٹا آج ہی رات گھر آ جائے گا۔ پریشان نہ ہو۔"

وہ لوگ تھانے سے باہر آ گئے۔ انسپکٹر نے انہیں شارق سے ملنے بھی نہیں دیا تھا۔ وہ تھانے سے چند قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ سفید رنگ کی ایک کار تھانے کے سامنے رکی۔ دو آدمی کار سے اتر کر تھانے میں داخل ہوئے ان میں ایک شیرا پہلوان تھا اور دوسرا رفیق۔ دو آدمی کار ہی میں بیٹھے رہے تھے۔

انسپکٹر اور سب انسپکٹر شیرا پہلوان کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔

"کہاں ہے وہ لڑکا۔ اسے بلاؤ ذرا۔" شیرا پہلوان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔" انسپکٹر بولا۔

"کیسی گڑبڑ؟" شیرا پہلوان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ابھی ملک منیر آیا تھا۔ لڑکے کو چھڑوا کر لے جانا چاہتا تھا۔ دھمکیاں دیتا ہوا گیا ہے۔"

"بات ہی کوئی نہیں۔" شیرا پہلوان نے کہا۔ "اسے منانے کا بھی طریقہ آتا ہے۔ تم لڑکے کو بلاؤ۔" شارق کو انسپکٹر کے کمرے میں لایا گیا۔

"کیا حال کر دیا ہے اس کا تم لوگوں نے۔ یہ تو ایک شریف آدمی ہے۔ کیوں پکڑا ہے تم لوگوں نے اسے۔" شیرا پہلوان نے انسپکٹر کو گھورا۔

"ہیروئن بیچتا ہے یہ پہلوان۔" انسپکٹر نے کہا۔ "یہ ہیروئن اس کے قبضے سے برآمد ہوئی ہے۔"

"یہ غلط ہے۔" شیرا پہلوان بولا۔ "یہ تو شریف آدمی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے کسی نے بتایا تو میں فوراً چلا آیا ہوں۔ چھوڑ دو اسے۔"

"لیکن پہلوان جی....."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" پہلوان نے اس کی بات کاٹ دی اور جیب سے سو سو روپے کے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر اس کے سامنے میز پر پھینک دیا۔ "یہ لو دس ہزار اور اسے چھوڑ دو۔ غریبوں کی بددعائیں مت لو۔ اب تم خود اسے گھر چھوڑ کر آؤ گے۔"

"تم باہر جا کر بینچ پر بیٹھو۔" انسپکٹر نے شارق سے کہا۔ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"تم اسے لے کر ملک منیر کے پاس چھوڑ آؤ۔ وہ تمہارا احسان مند رہے گا۔" شیرا پہلوان نے کہا۔

"میں اس کے گھر کیسے جا سکتا ہوں؟" تھانیدار بولا۔

"تم تو ہو نرے بے وقوف۔" شیرا پہلوان نے اسے گھورا۔ "ملک منیر جیسے لوگ کچھ غلط ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہوتے ہیں۔ اس کے پاس چلے جاؤ گے تو تمہاری شان نہیں گھٹ جائے گی۔ اس پر یہ احسان لاد دینا کہ اس کی سفارش پر چھوڑ رہے ہو تم اسے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ملک منیر جیسے آدمی اندر سے بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ لوہاری والے انسپکٹر کا حشر دیکھ چکے ہو۔ میں جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد تم اسے لے کر چلے جانا۔"

شیرا پہلوان کمرے سے باہر آ گیا۔ برآمدے میں بینچ پر شارق بیٹھا ہوا تھا۔

"بات ہی کوئی نہیں شارق باؤ۔" وہ شارق کے قریب رک کر بولا۔ "یہ انسپکٹر ابھی تمہیں گھر چھوڑ کر آئے گا۔ گھبراؤ نہیں۔ زندگی میں یہ سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔"

شیرا پہلوان چلا گیا۔ وہ شارق کے لئے سوچوں کی بہت سی راہیں کھول گیا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اسے ہیروئن کے چکر میں پھنسانے والا کون تھا۔ کچھ ہی دیر میں انسپکٹر

باہر آ گیا۔

"چل اوئے، تجھے گھر چھوڑ آؤں پھنے کا کے۔"

شارق انسپکٹر کے ساتھ تھانے سے باہر آ گیا۔ وہ بھاٹی گیٹ کے محرابی دروازے میں داخل ہو گئے اور اندرونی گلیوں ہی گلیوں میں ہوتے ہوئے ملک منیر کے گھر پہنچ گئے۔

"ملک صاحب!" انسپکٹر نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ "میں بہت معافی چاہتا ہوں ملک صاحب! آپ کے آنے کے بعد میں نے سب انسپکٹر سے باز پرس کی اور خود تحقیق کی تو پتہ چلا کہ ہیروئن کا تھیلا اس کی دکان پر واقعی کوئی عورت رکھ کر گئی تھی۔ ذرا سی غلط فہمی کی وجہ سے معاملہ گڑبڑ ہو گیا تھا۔ اب میں اسے لے آیا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس معاملہ کو نظرانداز کر دیں گے۔"

"چلو شکر ہے تمہیں کسی کی بے گناہی کا احساس تو ہوا۔" ملک منیر نے کہا۔ "لیکن اس کا جو نقصان ہوا ہی وہ کون پورا کرے گا۔ میں نے اس کی دکان دیکھی ہے۔ بالکل تباہ کر دی ہے تمہارے ماتحتوں نے۔"

"اس کا نقصان بھی میں پورا کروں گا ملک صاحب۔" انسپکٹر نے کہا۔ "آئندہ میں خیال رکھوں گا کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ بہت بہت شکریہ تمہارا۔" ملک منیر نے اس انداز میں کہا جیسے اسے وہاں سے رخصت کر دینا چاہتا ہو۔

انسپکٹر بھی اس کا مطلب سمجھ گیا اور ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

"چل اوئے پتر، میں تجھے تیرے گھر چھوڑ آؤں۔" انسپکٹر کے جانے کے بعد ملک منیر نے شارق کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔

جب شارق گھر پہنچا تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ملک منیر اسے مریم کے حوالے کر کے رخصت ہو گیا۔ مریم شارق کو اندر لے آئی۔ وہ دل کھول کر پولیس والوں کو کوسنے دے رہی تھی۔

دو تین دن شارق کی دکان بند رہی۔ اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو اس نے دکان پر جا کر جائزہ لیا۔ سامان کا جو نقصان ہوا تھا وہ تو ہوا تھا پولیس والے اس کی دراز سے سارے پیسے بھی نکال کر لے گئے تھے۔ وہ شارق کی اس روز کی دن بھر کی کمائی تھی جو یقیناً چھ سات ہزار روپے سے کم نہیں تھی۔ دو ڈھائی ہزار اس کی جیب میں تھے جو جامہ تلاشی کے دوران سب انسپکٹر نے نکال لئے تھے۔

دکان کو دوبارہ سیٹ کرنے میں آٹھ دس ہزار روپے خرچ ہو گئے تھے۔ دس بارہ دن گزر گئے

اور پھر ایک روز یہ خبر اس پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑی کہ ملک منیر کا ایک حادثے میں انتقال ہو گ ہے۔ شاہ عالمی میں مندر والے چوک پر ایک تیز رفتار کار اسے ٹکر مارتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ملک منیر کو لوگوں نے فوراً ہی ہسپتال پہنچا دیا مگر ڈاکٹر اسے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

شارق کو یہ اطلاع دکان پر ملی تھی۔ وہ دکان بند کر کے ہسپتال پہنچ گیا۔ اس وقت بیسیوں لوگ ہسپتال پہنچ چکے تھے اور جب ڈاکٹر نے اعلان کیا کہ وہ ملک منیر کو نہیں بچا سکے تو ایک کہرا مچ گیا۔

ملک منیر کے جنازے میں شہر کی بے شمار معزز شخصیات بھی شامل تھیں۔ ہزاروں لوگ تھے جو اس کے سفر آخرت میں شریک تھے۔ ہر آنکھ اشک بار تھی۔ شارق بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اس کا نجات دہندہ رخصت ہو گیا تھا۔

ملک منیر کے سوئم کے دو دن بعد شارق دکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ شیرا پہلوان کا آدمی رفیق آیا اور پلاسٹک کا ایک تھیلا بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ مال شیرا پہلوان نے بھیجا ہے۔ آرام سے بیچو۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

"لے جاؤ اسے۔ میں نہیں بیچوں گا یہ مال۔" شارق نے کہا۔

"بڑے احسان فراموش ہو تم شارق باؤ۔" رفیق نے اسے گھورا۔ "ابھی تھوڑے دن پہلے تو شیرا پہلوان نے دس ہزار روپے دے کر تمہیں تھانے سے چھڑوایا تھا۔ اگر وہ تمہیں چھڑانے کے لئے نہ جاتا تو اس وقت تم جیل میں ہوتے۔"

"وہ سب ڈرامہ تھا۔" شارق نے جواب دیا۔ "میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ مجھے کس طرح پھنسایا تھا۔ اب میں اس چکر میں نہیں آ سکتا۔ اگر تم لوگوں نے آئندہ مجھے پریشان کیا تو میں پولیس میں رپورٹ کر دوں گا۔"

"کونسی پولیس کیا بات کر رہے ہو شارق باؤ۔" رفیق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ پولیس والے تو شیرا پہلوان کا مال کھاتے ہیں۔ اسے جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ اس کے خلاف کچھ کیسے کر سکتے ہیں؟"

"تم یہاں سے جاتے ہو یا بلاؤں لوگوں کو؟" شارق نے دکان سے باہر آ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے دھکیلتا ہوا دو تین قدم دور لے گیا۔

یہ صورت حال دیکھ کر دو تین دکاندار دوڑ پڑے۔

"کیا ہوا شارق باؤ، کون ہے یہ بدمعاش؟" پڑوسی دکاندار نے پوچھا۔

"ہیروئن کا اسمگلر ہے۔ اس تھیلے میں ہیروئن ہے۔ مجھے زبردستی ہیروئن بیچنے کے لئے کہہ ہے۔ یہ لوگ میری دکان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے پھنسایا بھی انہوں نے ہی تھا۔" شارق چیخا۔

رفیق صورت حال دیکھ کر بدحواس سا ہو گیا۔ اس نے پہلے تو جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا پھر بھاگنے کی کوشش کی مگر لوگوں نے پکڑ کر اس کی دھنائی شروع کر دی۔ اس کے قبضے سے ہیروئن کے علاوہ ایک پستول بھی برآمد ہوا تھا۔ شارق اور پانچ چھ آدمی اسے تھانے لے گئے۔ اتفاق سے انسپکٹر اس وقت تھانے کے گیٹ سے نکل رہا تھا۔

"کیا بات ہے، کون ہو تم لوگ اور اسے کیوں پکڑ کر لائے ہو؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"یہ ہیروئن بیچتا ہے انسپکٹر صاحب۔" حنیف نامی دکاندار نے کہا۔ "اس کی قبضے سے ہیروئن کے علاوہ ایک پستول بھی برآمد ہوئی ہے۔ چند روز پہلے شارق کی دکان پر بھی انہی لوگوں نے ہیروئن رکھوائی تھی۔"

"شارق.... اچھا یہ لڑکا۔" انسپکٹر نے شارق کی طرف دیکھا۔ "اوئے علی احمد۔" اس نے ایک کانسٹیبل کو آواز دی۔ "اسے اندر لے کر چلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

دکانداروں نے پستول اور ہیروئن بھی پولیس کے حوالے کر دی۔

"ٹھیک ہے، آپ لوگ جایئے۔ ہم دیکھ لیں گے۔" انسپکٹر نے کہا۔

شارق اور باقی لوگ واپس آ گئے۔ شارق کو یقین تھا کہ رفیق ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ تھانے میں نہیں رہ سکے گا۔ وہ شیرا پہلوان کا آدمی تھا اور شیرا پہلوان کے تھانیدار سے تعلقات وہ دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنے پڑوسی دکاندار حنیف سے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تو وہ بولا۔

"دیکھا جائے گا شارق باؤ، اگر انسپکٹر نے اسے چھوڑ دیا تو ہم مل کر ڈی ایس پی کے پاس جائیں گے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔"

یہ سہ پہر چار بجے کی بات تھی۔ اس وقت سات بجے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ دکانوں کے برقی قمقمے جگمگا اٹھے تھے۔ شارق کی دکان پر تین چار گاہک کھڑے تھے۔ ان میں دو عورتیں بھی کھڑی تھیں۔ شارق انہیں سودا دینے میں مصروف تھا کہ ایک کار دکان کے سامنے آ کر رکی۔ چار پانچ غنڈے کار سے اترے۔ ان کے ہاتھوں میں ہاکیاں تھیں۔ انہوں نے آتے ہی دکان پر کر دیا۔ عورتیں چیختی ہوئی ایک طرف دوڑیں۔

غنڈوں نے پھلوں کے ٹوکرے الٹ دیئے۔ وہ ہر چیز توڑ پھوڑ رہے تھے۔ شارق بچنے کے لئے جھک گیا۔ ایک ہاکی اس کے بائیں کندھے پر لگی۔ دوسرے دکاندار بھی ڈنڈے اور ہاکیاں لے کر دوڑ پڑے۔ شارق نے بھی دکان کے اندر پڑا ہوا ایک ڈنڈا اٹھا لیا اور غنڈوں پر حملہ کرنے لگا۔ دکانداروں کے اس اتحاد سے اسے حوصلہ مل گیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ شیرا

پہلوان کے آدمی تھے۔ اس میں سے ایک کو تو اس نے پہچان بھی لیا تھا۔ وہ رفیق کا ساتھی تھا جو اس رات اسے کار میں اغواء کر کے لے گئے تھے۔

غنڈوں نے دوسری دکانوں پر بھی حملہ کیا تھا۔ لیکن کچھ اور دکاندار لاٹھیاں لے کر آ گئے تھے اور بالآخر غنڈوں کو وہاں سے بھاگتے ہی بن پڑی۔ ان کا ایک ساتھی پہلے ہی سے کار کی اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور کار کا انجن اسٹارٹ تھا۔ وہ لوگ کار میں ٹھنس گئے اور کار تیزی سے وہاں سے فرار ہو گئی۔ کچھ لوگ ڈنڈے لہراتے ہوئے کار کے پیچھے دوڑے تھے' مگر کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کار دور نکل گئی تھی۔

شارق کا ٹھیک ٹھاک نقصان ہوا تھا۔ لیکن اب اسے نقصان کی پرواہ نہیں تھی۔ اس نے شیرا پہلوان جیسے غنڈے کے سامنے ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا خواہ اسے خود ہی کیوں نہ غنڈہ بننا پڑے۔ ان چند روز کے واقعات سے اس نے یہ سبق سیکھا تھا کہ اس طرح دب کر نہیں رہا جا سکتا تھا اور پھر اس رات شیرا پہلوان نے بھی اسے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ شرافت کی زندگی بسر نہیں کی جا سکتی۔

شارق اور دو تین دکاندار رپورٹ لکھوانے کے لئے تھانے پہنچ گئے۔ اس وقت انسپکٹر موجود نہیں تھا۔ البتہ سب انسپکٹر موجود تھا۔

"ٹھیک ہے آپ لوگ تحریری شکایت لکھ کر دے جائیں۔ ہم معاملے کی تحقیقات کریں گے۔ دیکھیں گے کہ وہ کون لوگ تھے؟" سب انسپکٹر نے ان کی بات سننے کے بعد کہا۔

شارق نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک کاغذ پر رپورٹ لکھ دی۔ دکانداروں نے بھی اس پر دستخط کر دیئے۔ شارق نے اس رپورٹ میں یہ بات واضح طور پر تحریر کی تھی کہ حملہ آور شہر کے مشہور بدمعاش اور منشیات فروش شیرا پہلوان کے آدمی تھے۔ سب انسپکٹر نے ان کی تحریری شکایت وصول کر لی لیکن ایف آئی آر نہیں کاٹی۔

دو تین دن گزر گئے۔ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس دوران دکاندار آپس میں باتیں کرتے رہتے تھے کہ ان غنڈوں کے خلاف کوئی کارروائی ہوئی یا نہیں۔ اگر کوئی کارروائی ہوئی تھی تو پولیس نے انہیں کیوں نہیں بتایا۔

اور پھر ایک روز دن کے گیارہ بجے کے قریب دو پولیس والے شارق کی دکان پر پہنچ گئے۔

"شارق تمہارا نام ہے؟" ایک پولیس والے نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں فرعونیت تھی۔

"ہاں' کیا بات ہے؟" شارق نے اس کے لہجے سے مرعوب ہوئے بغیر پوچھا۔

"تھانیدار صاحب نے بلایا ہے تمہیں۔" پولیس والے نے کہا۔ "غنڈوں کے خلاف رپورٹ

نے لکھوائی تھی؟"

"ہاں' رپورٹ تو سب دکانداروں نے لکھوائی تھی۔" شارق نے کہا۔

"تھانیدار صاحب نے تمہیں بلایا ہے۔ رپورٹ میں سب سے اوپر تمہارا نام ہے۔ چلو رے ساتھ۔" پولیس والے نے اس طرح کہا جیسے اس نے غنڈوں کے خلاف رپورٹ لکھوا کر ئی جرم کیا ہو۔

"تم چلو' میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" شارق بولا۔

"تھانیدار تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہے جو تمہارے انتظار میں بیٹھا رہے گا۔ ہمارے ساتھ ۔" پولیس والے نے کہا۔

"اچھا چلو۔" شارق نے ساتھ والی دکان پر دیکھا۔ حنیف نہیں تھا۔ اسنے اپنی ملازم لڑکے کو ہدایات دیں اور پولیس والوں کے ساتھ چل دیا۔

جب وہ تھانے پہنچا تو پولیس والے ایک جیب تراش کی دھنائی کر رہے تھے جسے داتا دربار کے نے بازار میں ایک آدمی کی جیب کاٹتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ شارق ایس ایچ او کے کمرے میں ل ہونے لگا تو کانسٹیبل نے اسے روک دیا۔

"یہیں رکو....میں تھانیدار صاحب کو بتا دوں۔"

کانسٹیبل پانچ منٹ بعد ایس ایچ او کے کمرے سے باہر آیا۔ "تھانیدار صاحب مصروف ہیں۔ ا کھڑے ہو جاؤ' ایک طرف۔ فارغ ہو کر تمہیں بلائیں گے۔" اس نے کہا۔

وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ شارق برآمدے میں کھڑا رہا۔ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ وہ ے کھڑے تھک گیا تھا۔ انسپکٹر کے کمرے سے باتوں اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی ۔ شارق نے ایک پولیس والے سے دو تین مرتبہ کہا مگر اسے ہر مرتبہ یہی جواب ملا کہ ار صاحب فارغ ہوں گے تو بلا لیں گے۔ بالآخر مزید آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد دو آدمی کے کمرے سے نکلے۔ ان میں سے ایک وکیل تھا جس نے سفید پتلون اور سفید شرٹ پہنی تھی۔ گلے میں سیاہ رنگ کی بو تھی اور گرمی کے باوجود اس نے کالا کوٹ پہن رکھا تھا۔ ے آدمی نے جینز اور نیلی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ شرٹ پر آرنلڈ شوارزنیگر کی تصویر کا عکس ہوا تھا۔ اس نوجوان کے بال خاصے لمبے تھے۔ عمر پچیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ ان کے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد انسپکٹر نے شارق کو بلوایا۔

"پہلی مرتبہ تمہیں منشیات فروشی کے الزام میں پکڑ کر لایا گیا تھا۔" تھانیدار نے اسے تے ہوئے کہا۔ "پھر تم نے دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل کر رفیق نامی ایک آدمی کو زد و

کوب کیا اور اسے ایک جھوٹے الزام میں پولیس کے حوالے کر گئے۔ پھر تم لوگوں نے دنگا فر
اور شیرا پہلوان کے آدمیوں کے خلاف جھوٹی رپورٹ لکھوائی۔ میں نے تحقیقات کر لی ہے۔
پہلوان اور اس کا کوئی آدمی اس روز اس علاقے میں نہیں تھا۔ کسی کے خلاف جھوٹی رپ
لکھوانے کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"یہ جھوٹی رپورٹ نہیں ہے جناب!" شارق نے کہا۔ "آپ چوک پر آ کر لوگوں
پوچھیں۔ وہ شیرا پہلوان کے آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کو تو میں نے پہچان لیا تھا۔ انہوں
ہاکیوں سے حملہ کیا تھا اور توڑ پھوڑ کی تھی۔"

"اور تم شاید بھول گئے ہو کہ اس شیرا پہلوان نے تمہیں بچایا تھا۔ وہ تمہارے ساتھ
نہ کرتا تو آج تم کم از کم چھ ماہ کے لئے جیل میں جا چکے ہوتے۔" تھانیدار نے کہا۔

"اس وقت بھی مجھے شیرا پہلوان کے آدمیوں نے پھنسانے کی کوشش کی تھی۔" شار
کہا۔ "میری دکان پر ہیروئن انہی لوگوں نے رکھوائی تھی اور بعد میں چھاپہ پڑوا دیا۔"

"شیرا پہلوان کو تم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟" تھانیدار نے اسے گھورا۔

"وہ مجھے مجبور کرتا رہا ہے کہ میں اپنی دکان پر اس کے ایجنٹ کی حیثیت سے ہیروئن فر
کروں' کیونکہ اس سے پہلے یہاں پان کی دکان تھی اور یہ دکان ان کا منشیات فروشی کا بہت
تھا۔ میرے انکار پر اس نے مجھے اس طرح پریشان کرنا شروع کر دیا ہے۔" شارق نے کہا۔

"شیرا پہلوان جیسے لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ اس سے کسی طرح مفاہمت
مل جل کر رہنا سیکھو۔ ہمیں بھی آرام سے کام کرنے دو۔" انسپکٹر نے کہا۔

"کیا کسی جرائم پیشہ آدمی کے خلاف شکایت کرنا جرم ہے؟" شارق نے پوچھا۔

"مجھے یہ انسپکٹری تحفے میں نہیں ملی۔" انسپکٹر نے اسے گھورا۔ "میری زندگی گزر
پولیس میں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کون شریف ہے اور کون جرائم پیشہ۔ تمہارا پورا
میرے پاس موجود ہے۔ میں تمہیں آخری مرتبہ وارننگ دے رہا ہوں۔ آئندہ مجھے تھانے
نہ آؤ۔ جاؤ.....دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

شارق چند لمحے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر خاموشی سے کمرے
کر تھانے سے باہر آ گیا۔ جب وہ دکان پر پہنچا تو دو بج چکے تھے۔ پڑوسی دکاندار حنیف
موجود نہیں تھا۔ دوسرے دکانداروں کو پتہ نہیں چل سکا تھا کہ شارق کو پولیس والے تھا
گئے تھے۔ حنیف تقریباً چار بجے آیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں
اسے لے کر اسپتال گیا ہوا تھا۔ شارق نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو اس کے چہ

پریشانی کے تاثرات ابھر آئے۔

"اس کا مطلب ہے ڈی ایس پی سے ملنا پڑے گا۔" وہ بولا۔

"وہ اس انسپکٹر کا بھی استاد ہے۔" شارق نے جواب دیا۔ "مجھے میرے والدین کے قتل کے
الزام میں اسی نے تو سزا دلوائی تھی۔ وہ اس وقت لوہاری کا انسپکٹر ہوا کرتا تھا۔"

"ٹھیک ہے شارق باؤ۔" حنیف نے کہا۔ "اس مرتبہ تو صبر کر لو۔ آئندہ کوئی بات ہوئی تو پھر
اوپر جائیں گے۔"

اس کے دو تین روز بعد رات کے وقت شارق کو پھر پولیس نے پکڑ لیا۔ اس روز وہ ساڑھے
دس بجے دکان بند کر کے گھر کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اس نے چوک پار کیا ہی تھا کہ دو تین پولیس
والے اچانک ہی کہیں سے نکل کر اس پر جھپٹ پڑے۔ شارق کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر انہوں
نے اس کی دھنائی شروع کر دی اور کھینچتے ہوئے تھانے لے گئے۔ کچھ لوگوں نے پولیس والوں کو
شارق پر جھپٹتے ہوئے دیکھا تھا لیکن انہوں نے مداخلت اس لئے نہیں کی تھی کہ وہ پولیس والے
تھے اور غالباً یہی سمجھے تھے کہ شارق کوئی جرائم پیشہ تھا۔ جسے پولیس والوں نے اس طرح پکڑا تھا۔

انسپکٹر تھانے میں نہیں تھا۔ شارق کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ رات ایک بجے انسپکٹر کسی
معرکے سے واپس آیا تو شارق کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔

"اب کیا کیا ہے اس نے؟" انسپکٹر نے خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تانگوں والے اڈے پر چھپ کر ہیروئن بیچ رہا تھا۔" ایک ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ "اس کے
ساتھ دو گاہک تھے جو ہمیں دیکھتے ہی نالے کی طرف بھاگ گئے۔ اس نے بھی بھاگنے کی کوشش کی
تھی مگر ہم نے اسے موقع نہیں دیا۔ اس کے قبضے سے ہیروئن کی یہ پڑیاں نکلی ہیں۔ دو سو گرام تو
ہوں گی۔ معلوم ہوتا ہے باقی مال بیچ دیا تھا۔" اس نے چند پڑیاں میز پر رکھ دیں۔

"یہ جھوٹ ہے سر جی۔" شارق چیخا۔ "میں تو دکان بند کر کے گھر.....

انسپکٹر نے بات مکمل کرنے کا موقع دیئے بغیر اس کے منہ پر زور دار تھپڑ مار دیا۔

"اب تو تمہارا حمایتی بھی اس دنیا میں نہیں رہا۔ کس کو بلاؤ گے اپنی سفارش کے لئے۔"
انسپکٹر نے کہا اور پھر ہیڈ کانسٹیبل کی طرف مڑ گیا۔ "بند کر دو اسے' چالان بنا کر صبح عدالت میں پیش
کر دیا جائے گا۔ ملک غفور اپنے کمرے میں ہے؟"

"نو سر۔ وہ تو گشت پر گئے ہیں۔" ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"صبح مجھے ہائی کورٹ جانا ہے۔ ملک غفور سے کہنا اسے عدالت میں لے جا کر پیش کر
دے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب۔" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا اور پھر شارق کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "چل اوئے۔"

"انسپکٹر۔" شارق نے تھانیدار کی طرف مڑ کر کہا۔ "تم پچھتاؤ گے۔ آج میرے ساتھ تمہاری زیادتی کا آخری دن ہے۔ تم بھی جانتے ہو کہ جب کسی شریف آدمی کو مجرم بننے پر مجبور کیا جا ہے تو وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ اب کوئی میری سفارش بن کر نہیں آئے گا۔ اب میں تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ اس کیس میں مجھے کتنی سزا دلواؤ گے؟ جیل سے نکلنے کے بعد بہت بدل چکا ہوں گا اور پھر سب سے پہلے میری ملاقات تم سے ہو گی۔ اس کے بعد میں تمہارے سرپرست شیرا پہلوان سے نمٹوں گا۔"

"بند کر دو اسے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہیڈ کانسٹیبل شارق کو کھینچتا ہوا انسپکٹر کے دفتر سے نکال کر لے گیا۔ شارق نے اس مرتبہ کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

شارق کو صبح عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اس پر منشیات فروشی کا الزام تھا۔ مجسٹریٹ نے پہلی ہی پیشی پر اس کیس کا فیصلہ کر دیا اور پھر اسے پندرہ دن کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔

○

شارق کو دیکھ کر جیلر کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"میں نے تمہاری فائل دیکھی ہے۔" جیلر نے کہا۔ "تم پر منشیات فروشی کا الزام ہے۔ یقین نہیں آتا۔"

"بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر یقین کرنا پڑتا ہے جیلر صاحب۔" شارق نے جواب دیا۔ "جب میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو اس وقت بھی آپ نے غالباً ایسے ہی الفاظ کہے تھے۔ بارہ سال کے ایک لڑکے کو اپنے ماں باپ کے قتل کے الزام میں عمر قید کی سزا ہو سکتی ہے تو ایک آدمی کو منشیات فروشی کے جرم میں سزا کیوں نہیں ہو سکتی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "جب میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو صرف بارہ سال کا تھا۔ یہ وہ ہوتی ہے جب انسان کو اپنا شعور بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اچھے برے کو نہیں سمجھ سکتا۔ بڑوں انگلی پکڑ کر چلتا ہے۔ اس عمر کے بچے کو تو اکیلے گھر سے بھی نہیں نکلنے دیا جاتا۔ میں نے اس دیواری کے اندر ہوش سنبھالا۔ میری دنیا ان دیواروں تک محدود تھی۔ میرے سر پر یہی آسمان تھا۔ یہاں میں نے خونخوار درندہ نما لوگ بھی دیکھے اور آپ جیسے محبت کرنے والے آفیسر بھی۔ میں نے یہاں رہ کر بی اے کی ڈگری تو حاصل کر لی لیکن دنیا میں رہنے کا سلیقہ آیا۔ جب میں یہاں سے باہر نکلا تھا تو اس وقت یہی سمجھا تھا کہ اس دنیا میں رہنے والے سب

آپ جیسے ہوں گے۔ انسانیت سے محبت کرنے والے۔ مخلص.... لیکن باہر رہ کر ان چند مہینوں میں مجھے تجربہ ہوا کہ یہ دنیا خونخوار بھیڑیوں سے بھری ہوئی ہے۔ آپ کی طرح کے انسان کو تو موٹروں کے نیچے کچل دیا جاتا ہے۔ اور کسی خوش فہمی کا شکار مجھ جیسے لوگوں کو کٹھ پتلیاں بنا دیا جاتا ہے۔ انہیں گھناؤنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے کٹھ پتلی بننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان چند مہینوں میں مجھے صرف یہ تجربہ ہوا ہے کہ اس دنیا میں صرف دو طرح سے زندہ رہا جا سکتا ہے۔ کٹھ پتلی بن کر یا وہ پراسرار قوت بن کر جو ان کٹھ پتلیوں کو اپنی انگلیوں پر نچاتے ہیں۔"

"تم پندرہ دن کے لئے یہاں آئے ہو۔" جیلر نے کہا۔ "اس دوران میں کوشش کروں گا کہ ایک بار پھر تمہیں کچھ سمجھا سکوں۔ تم ایک اچھے انسان ہو اور بہت اچھے انسان بن سکتے ہو۔"

شارق دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس جیلر کو بھی شاید دنیا کا تجربہ نہیں تھا۔ اس کے شب و روز بھی تو جیل کے اس حصار میں گزرتے تھے۔

تین روز بعد وارڈن نے اسے آواز دی۔

"شارق! تمہاری ملاقات آئی ہے۔"

"کون ہے؟" شارق نے پوچھا۔ ویسے اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ مریم ہو گی۔ اس رات پکڑے جانے کے بعد شارق نے گھر اطلاع نہیں بھجوائی تھی اور نہ ہی بعد میں اسے خبر کی تھی۔ دو تین دن تک روتی پیٹتی اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی ہو گی اور بالآخر اسے پتہ چل گیا ہو گا کہ وہ جیل میں ہے اور ملاقات کے لئے دوڑی آئی تھی۔

"تمہاری ماں ہے۔" وارڈن نے جواب دیا۔ "میرا مطلب ہے وہی عورت جو پہلے بھی تم سے ملاقات کے لئے آتی رہی ہے۔"

"اس سے کہہ دو کہ شارق نام کا کوئی قیدی اس جیل میں نہیں ہے۔" شارق نے جواب دیا۔

"ارے پاگل آدمی۔" وارڈن نے اسے گھورا۔ "وہ تمہاری ماں ہے۔ رو رو کر اس نے اپنا برا حال کر رکھا ہے اور تو کہتا ہے کہ ملاقات نہیں کرے گا۔"

"ہاں، میں اس سے ملاقات نہیں کروں گا۔" شارق نے جواب دیا۔

وارڈن عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔ شارق دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مریم اور رضیہ نے اس کی گمشدگی پر واقعی رو رو کر برا حال کر رکھا ہو گا۔ لیکن اب وہ ایک قیدی اور غلام انسان کی حیثیت سے اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے زندگی گزارنے کا

جو فیصلہ کر لیا تھا وہ بہت خطرناک تھا۔

اس سے ایک ہفتہ بعد ایک روز وارڈن نے پھر ایک ملاقات کی آمد کی اطلاع دی۔

"میں نے کہا تھا نا کہ میں نہیں ملوں گا۔" شارق نے کہا۔

"وہ تمہاری ماں نہیں ہے۔" وارڈن نے کہا۔

"پھر کون ہے؟" اس نے گھورا۔

"چھانگا نام بتایا ہے اس نے۔ کئی سال پہلے وہ بھی ایک جرم میں یہاں کی ہوا کھا چکا ہے۔ اگر نہیں ملنا چاہتے تو میں اسے منع کر دوں۔" وارڈن نے کہا۔

"نہیں۔ میں اس سے ملاقات کروں گا۔" شارق اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چھانگا نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا تھا۔ وارڈن کے کہنے کے مطابق کئی سال پہلے وہ کسی جرم میں جیل کی ہوا بھی کھا چکا تھا۔ شارق حیران ہو رہا تھا کہ وہ کون ہو سکتا تھا۔

آج ملاقاتوں کا دن تھا۔ کئی قیدیوں کے ملاقاتی آئے ہوئے تھے۔ ہال نما کمرہ موٹی موٹی آہنی سلاخوں کی مدد سے دو حصوں میں تقسیم تھا۔ سلاخوں پر جالی بھی لگی ہوئی تھی۔ سلاخوں کے اس طرف قیدی تھے اور دوسری طرف ان کے ملاقاتی۔ وارڈن اسے آخری سرے پر لے گیا۔ سلاخوں کے دوسری طرف ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس نے لاچا اور کرتا پہنا ہوا تھا۔ وہ درمیانے قد کا ایک ادھیڑ عمر مگر صحت مند آدمی تھا۔ کشادہ پیشانی' بڑی بڑی سرخ آنکھیں اور بھاری مونچھیں۔

"میرا نام چھانگا ہے۔ تم مجھے نہیں جانتے شارق باؤ۔" اس نے کہا۔

"ہاں واقعی میں تمہیں نہیں جانتا۔ کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے؟" شارق نے کہا۔

"مجھے کل پتہ چلا تھا کہ تمہیں جھوٹے کیس میں سزا دلوائی گئی ہے۔ اس سارے چکر کے پیچھے شیرا پہلوان کا ہاتھ ہے۔ تم یہاں سے باہر آ جاؤ تو اس سے حساب کتاب کر لیں گے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے شارق باؤ۔ اب تم اپنے آپ کو اکیلا نہیں پاؤ گے۔" چھانگا نے کہا۔

"تم کون ہو؟" شارق نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دوست۔" چھانگا نے جواب دیا۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

"نہیں' مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" شارق نے جواب دیا۔

"تمہیں پندرہ دن کی سزا ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے ایک دو روز میں رہا ہو جاؤ گے۔ جیل سے نکل کر سیدھے میرے پاس آ جانا۔" چھانگا نے کہا۔

"کہاں؟" شارق نے پوچھا۔

"مزنگ۔" چھانگا نے جواب دیا۔ "مزنگ چوک پر کسی سے بھی پوچھ لینا۔ تمہاری دعا سے بچہ چھانگا کو جانتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آ جاؤں گا۔" شارق نے جواب دیا۔

"اچھا۔ رب راکھا۔ بھولنا مت۔" چھانگا نے کہا اور مڑ کر باہر کی طرف چلا گیا۔

شارق چند سیکنڈ وہاں کھڑا رہا پھر واپس آ گیا۔ وہ دن بھر چھانگا کے بارے میں سوچتا رہا۔ شکل و صورت' لباس اور انداز گفتگو سے تو وہ بھی کوئی اسمگلر ہی لگتا تھا۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ چھانگا کو اس کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟"

اس رات شارق کو دیر تک نیند نہیں آ سکی۔ وہ کوٹھڑی کے کھردرے فرش پر لیٹا چھانگا کے بارے میں سوچتا رہا۔ چھانگا نے گفتگو میں شیرا پہلوان کا بھی حوالہ دیا تھا اور اس سے حساب کتاب کر لینے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔ اس کی باتوں سے شارق اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ شیرا پہلوان اور چھانگا میں کوئی دشمنی تھی اور چھانگا غالباً اپنے حریف سے کسی قسم کا بدلہ لینے کے لئے اسے آلہ کار بنانا چاہتا تھا۔ ہو سکتا ہے ان میں کوئی کاروباری رقابت ہو۔

اس نے کروٹ بدلی اور دروازے کی آہنی سلاخوں سے باہر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں بہت دور ستارے ٹمٹماتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ دفعتاً" اس کے ذہن میں مریم اور رضیہ کا خیال ابھر آیا۔ مریم دو مرتبہ ملاقات کے لئے آ چکی تھی۔ دوسری مرتبہ رضیہ بھی اس کے ساتھ تھی مگر شارق نے ان سے ملاقات سے انکار کر دیا تھا۔ کیا سوچا ہو گا انہوں نے اس کے بارے میں۔ مریم وہ واحد ہستی تھی جو چودہ سال کی قید کے دوران باقاعدگی سے اس سے ملنے کے لئے آتی رہی تھی۔ اس نے اسے ماں کی ممتا دی تھی۔ رضیہ سے اسے بہن کا پیار ملا تھا۔

دو دن بعد شارق کو رہائی مل گئی۔ وہ لباس بدل کر جیلر کی نصیحتوں کو دماغ سے جھٹکتا ہوا جیل کے گیٹ سے باہر نکلا تو سب سے پہلے اس کی نظر مریم پر پڑی جو گیٹ کے سامنے ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ شارق کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف لپکی۔ شارق سے کچھ فاصلے پر ایک اور آدمی بھی کھڑا تھا۔ اس نے چادر جسم پر لپیٹ رکھی تھی۔ شارق اسے پہچانتا تو نہیں تھا' لیکن اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ شیرا پہلوان کا آدمی تھا۔

"شارق پتر۔" مریم بانہیں پھیلا کر اس کی طرف لپکی۔

شارق نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر اس کا ہاتھ جھٹک کر تیزی سے ایک طرف چلنے لگا۔ مریم روتی چیختی اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ شارق کے دل پر چھریاں سی چل رہی تھیں۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا کہ وہ چادر پوش آدمی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سڑک پر آ گیا اور ایک رکشے میں بیٹھ گیا۔

"کہاں چلنا ہے؟" ڈرائیوار نے رکشہ اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے یہاں سے چلو۔ راستے میں بتا دوں گا۔" شارق نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ مریم پاگلوں کی طرح اسے پکارتی ہوئی دوڑتی آ رہی تھی۔

رکشہ حرکت میں آ گیا۔ مریم کچھ دیر تک رکشے کے پیچھے دوڑتی رہی پھر رک گئی۔ شارق نے پھر مڑ کر دیکھا۔ مریم بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ مگر سفید رنگ کی ایک سوزوکی کار رکشے کے پیچھے آ رہی تھی۔ کار میں صرف ڈرائیور تھا اور شارق نے اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔ یہ وہی چادر پوش آدمی تھا جسے اس نے جیل کے گیٹ کے سامنے دیکھا تھا۔

رکشہ کئی میل تک مختلف سڑکوں پر دوڑتا ہوا میکلوڈ روڈ کی طرف آ گیا۔

"اسٹیشن لے چلو۔" شارق نے کہا۔

"رکشہ ریلوے اسٹیشن کی طرف مڑ گیا۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب پہنچ کر شارق نے رکشہ رکوا لیا اور جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ڈرائیور نے اس کے ہاتھ سے سو روپے کا نوٹ لے لیا اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی جیب میں پچاس روپے کا صرف ایک نوٹ تھا اور میٹر پر پینتیس روپے بنے تھے۔

"میرے پاس کھلے نہیں ہیں باؤ۔" ڈرائیور نے سو کا نوٹ دوبارہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ پکڑو اپنا سو کا نوٹ اور پیسے کھلے کروا کے دو۔"

شارق نے اس کے ہاتھ سے پچاس کا نوٹ کھینچ لیا اور رکشہ سے اتر کر تیزی سے ایک طرف دوڑا جو میکلوڈ روڈ ہی کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بس کے اگلے دروازے سے سوار ہو گیا۔ بس بھری ہوئی تھی۔ شارق نے جھانک کر دیکھا۔ سفید سوزوکی سڑک کے کنارے پر کھڑی تھی اور اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا شخص متجسس نگاہوں سے اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں رکشہ رکا تھا۔ اگلا موڑ مڑنے کے لئے بس کی رفتار کم ہوئی تو شارق پچھلے دروازے سے اتر گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اس موڑ پر کھڑا تھا جہاں سے بھاٹی لوہاری کی طرف تانگے جا رہے تھے۔ تمام تانگے والے سواریوں کو آواز لگاتے ہوئے دربار..... دربار کی آوازیں لگا رہے تھے۔ شارق پہلے ایک تانگے کی طرف بڑھا پھر ایک خالی رکشہ دیکھ کر اس کی طرف مڑ گیا۔

"لوہاری چلو۔" شارق رکشے میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میٹر خراب ہے باؤ جی۔ پندرہ روپے ہوں گے۔" ڈرائیور نے کہا۔

"چلو..... پندرہ ہی لے لینا۔" شارق نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

رکشہ حرکت میں آ گیا اور مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا لوہاری کی طرف جانے والی سڑک پر

گیا۔ موچی دروازے سے ذرا آگے نکلتے ہی شارق نے رکشہ رکوا لیا اور پچاس کا نوٹ ڈرائیور کی طرف بڑھا دیا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس رکشہ ڈرائیور کے پاس کھلے پیسے موجود تھے۔ اس نے پینتیس روپے واپس کر دیئے۔ شارق رکشے سے اتر کر ہسپتال روڈ پر آ گیا۔ اور اخبار مارکیٹ سے ذرا آگے جا کر دائیں طرف ایک گلی میں مڑ گیا۔ یہ بازارا نما گلی آگے جا کر انارکلی سے جا ملی تھی لیکن شارق انارکلی تک پہنچنے سے پہلے ہی بائیں طرف ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ ریسٹورنٹ میں اس وقت اچھے خاصے گاہک تھے۔ ساری ہی میزیں بھری ہوئی تھیں۔ مگر شارق کا رخ کاؤنٹر کی طرف تھا۔ اس کا بچپن کا دوست سہیل کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً چار مہینے پہلے سہیل سے اس کی ملاقات کے بعد شارق آج اس کے سامنے آیا تھا۔

"ارے تم....."

"میں زیادہ دیر یہاں لوگوں کے سامنے کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اوپر اپنے کمرے میں چلو۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" شارق نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تم اوپر جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" سہیل نے کہا۔

شارق نے ادھر ادھر دیکھا اور کاؤنٹر سے ذرا آگے لکڑی کی گول سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر والے کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے گہرا سانس لیا اور پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ پلنگ پر لیٹا کچھ دیر تک چھت کو گھورتا رہا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

آنکھ کھلتے ہی اس کی نظر سامنے دیوار گیر گھڑی پر پڑی۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد باتھ روم کا دروازہ کھلا اور سہیل تولیئے سے منہ پونچھتا ہوا باہر آ گیا۔

"میں نے بیرے کو تمہارے لئے چائے دے کر بھیجا تھا۔ اس نے واپس آ کر بتایا کہ تم سو رہے ہو۔ میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔" سہیل نے کہا۔ "ویسے بھی سچی بات یہ ہے کہ تم بھی سو لو۔ صبح جس وقت تم آئے تھے وہ ذرا دھندے کا وقت ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی دھندہ کر لوں۔"

"تم میرے لئے ناشتہ منگواؤ۔" میں بھی ذرا منہ ہاتھ دھو لوں۔" شارق کہتا ہوا اس سے تولیہ لے کر باتھ روم میں گھس گیا۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد شارق اس کمرے میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا اور سہیل اس کے سامنے لکڑی کی کرسی پر بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔

"اس ملاقات کے بعد تم تو ایسے غائب ہوئے کہ لوٹ کر آئے ہی نہیں۔ نہ ہی تم نے اپنے گھر کا پتہ بتایا تھا کہ جا کر تم سے ملاقات کرتا۔" سہیل نے پوچھا۔

"تم انجان بننے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟" شارق نے اسے گھورا۔ "یا واقعی تمہیں پتہ نہیں معلوم؟"

"کیا معلوم نہیں؟" سہیل کے لہجے میں حیرت تھی۔

شارق کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ "کیا تم اسی دنیا میں رہتے ہو؟ اخبار نہیں پڑھتے کیا؟" اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اس نے کہا۔

"اس دنیا میں رہتا ہوں۔ اخبار بھی پڑھتا ہوں لیکن....."

"لیکن میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا رہا اس سے بے خبر رہے۔" شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کیا ہوا تمہارے ساتھ؟" سہیل نے اسے گھورا۔

"آج صبح میں جیل سے رہا ہو کر آیا ہوں۔" شارق نے کہا۔

"کیوں؟ کیا کیا تھا تم نے؟ کس جرم کی سزا میں جیل گئے تھے؟" سہیل کے لہجے میں حیرت تھی۔

"منشیات فروشی کا الزام تھا مجھ پر۔" شارق نے کہا۔

"یقین کرو شارق.... مجھے تمہارے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔" سہیل بولا۔

شارق چند لمحے خاموش رہا پھر اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔ میں وہ کہہ رہا تھا۔

"شیرا پہلوان اور پولیس والوں نے مل کر میری زندگی کی راہیں بدل ڈالی ہیں۔ اب میں فیصلہ کر لیا ہے کہ وہی بنوں گا جو یہ لوگ مجھے بنانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ لوگ مجھ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ میں ان کی جڑیں تک کھود ڈالوں گا۔"

"یقین کرو شارق...." سہیل اس کے خاموش ہونے کے بعد بولا۔ "کچھ اسی قسم کی خبریں اخبار میں پڑھتا تو رہا ہوں' لیکن میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ تم ہو سکتے ہو۔ میں یہ سمجھا تھا کہ یا تو تم کسی کام دھندے میں مصروف ہو گئے ہو یا یہ شہر چھوڑ کر چلے گئے ہو۔ افسوس کی بات ہے کہ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی میں تمہارے حالات سے بے خبر رہا۔"

"خیر' چھوڑو اس بات کو۔ یہ سب باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟" شارق نے کہا۔

"تم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ اگرچہ درست نہیں ہے لیکن ایک دوست ہونے کے ناطے میں تم سے دامن چھڑانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ ویسے میرا مشورہ یہی ہے کہ جو کچھ ہوا بھول جاؤ۔ کہیں اور چلے جاؤ۔ تم نے جس راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا ہے وہ بہت خطرناک ہے۔" سہیل نے کہا۔

"کیسے بھول جاؤں۔" شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے دل پر اتنے زخم لگے ہیں جن کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جیل سے باہر آنے کے بعد میں نے شرافت کی زندگی گزارنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مجھ جیسے لوگ شرافت کی زندگی نہیں گزار سکتے۔ انہیں ان خطرناک راستوں پر دھکیل دیا جاتا ہے جن پر مجھے دھکیلا گیا ہے۔"

"سوچ لو شارق۔" سہیل نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔" شارق نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"شیرا پہلوان بہت خطرناک آدمی ہے۔ اس کا اندازہ تم نے لگا لیا ہو گا۔ اسے پولیس کی مکمل سرپرستی حاصل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس قدر نہ پھیل جاتا۔" سہیل نے کہا۔

"اسے صرف انسپکٹر اور ڈی ایس پی کی سطح تک سرپرستی حاصل ہے۔ اس سے....."

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔" سہیل نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ڈی ایس پی سے اوپر کے پولیس افسران اسے نہیں جانتے؟ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے میرے دوست! اگر کوئی معمولی کانسٹیبل بھی کسی رکشہ یا تانگے والے سے دس روپے بھی رشوت لیتا ہے تو ان دس روپوں میں اس کانسٹیبل سے لے کر پولیس کے اعلیٰ ترین آفیسر تک کا حصہ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس ملک میں اندھیر نگری نہ مچی ہوتی۔ معاشرے میں ایسے جرائم نہ ہوتے۔ ان پولیس والوں کو دولت سے محبت کی بجائے اپنے فرض کا احساس ہوتا تو ہمارا یہ ملک جنت ہوتا۔ اگر تم ایک معمولی سے پولیس انسپکٹر کے بارے میں تحقیقات کرو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ اس کی تنخواہ تو چھ سات ہزار روپے ہے لیکن وہ کروڑوں کی جائیداد کا مالک ہے۔ یہ جائیداد اس کے نام نہیں ہو گی۔ اس کے بینک اکاؤنٹ میں بھی چند روپے ہوں گے۔ ساری جائیداد اس کی بیوی' بیٹے' بیٹیوں اور دوسرے رشتہ داروں کے نام ہوگی۔ میں صرف پولیس کی بات نہیں کر رہا۔ ہر سرکاری محکمہ کا یہی حال ہے۔ ہر شخص اس ملک کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھ کر لوٹ رہا ہے۔"

"تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں بھی اس ملک کو لوٹنا چاہتا ہوں۔" شارق بولا۔

"نہیں' میرا یہ مطلب نہیں ہے۔" سہیل نے کہا۔ "تم کمزور ہو۔ ان کے پاس طاقت ہے۔ وہ تمہیں اٹھنے سے پہلے ہی کچل دیں گے۔"

"کمزور آدمی اس وقت تک کمزور ہوتا ہے جب تک وہ اپنے آپ کو کمزور سمجھتا ہے۔" شارق نے کہا۔ "میں جب تک اپنے آپ کو کمزور سمجھتا رہا یہ لوگ مجھے ٹھوکریں مارتے رہے۔ لیکن ان ٹھوکروں نے مجھے مضبوط بنا دیا ہے۔ مجھے طاقت بخشی ہے انہوں نے۔ اب میں وہ شارق نہیں ہوں جو جیل جانے سے پہلے تھا۔"

"لیکن تم اکیلے کیا کر لو گے۔" سہیل نے کہا۔ "وہ تو گروہ ہیں۔ انسانوں کے نہیں خونخوار بھیڑیوں کے گروہ.....جو اپنے سے کمزور کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔"

"اب وہ کم از کم میری چیر پھاڑ نہیں کریں گے۔" شارق بولا۔ "تم مجھ سے صرف اتنی ہمدردی کرو کہ مجھے چند روز کے لئے پناہ دے دو۔ صرف چند روز۔"

"میں نے تمہاری مدد کرنے سے انکار نہیں کیا۔" سہیل نے کہا۔ "لیکن یہ جگہ تمہارے لئے محفوظ نہیں ہے۔ تم چوبیس گھنٹے اس کمرے میں بند ہو کر نہیں رہ سکتے۔ میں نے دو سال پہلے باغبانپورہ میں ایک مکان خریدا تھا۔ پہلے تو اس میں کرائے دار تھے لیکن اب تین مہینوں سے خالی پڑا ہے۔ تم چاہو تو وہاں رہ سکتے ہو۔ ان بھیڑیوں کی نظروں سے محفوظ رہو گے۔ لیکن کیا تم نے مریم اور رضیہ کے بارے میں سوچا ہے؟ میں نے انہیں ابھی تک دیکھا تو نہیں، لیکن تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمہیں بہت چاہتی ہیں۔ اگر شیرا پہلوان کو ان سے تمہارے تعلق کا پتہ چل گیا تو وہ لوگ انہیں پریشان کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"میں انہیں بے سہارا نہیں چھوڑ سکتا۔" شارق نے کہا۔ "میں انہیں وہاں سے نکال کر کہیں اور منتقل کر دوں گا تاکہ وہ ان کے شر سے محفوظ رہیں۔"

"تو پھر یوں کرو کہ پہلی فرصت میں انہیں میرے باغبانہ پورہ والے مکان میں منتقل کر دو۔ اس کے بعد جو کچھ بھی کرنا چاہو کرتے رہنا۔" سہیل نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" شارق نے کہا۔ "چھانگا نامی کسی آدمی کو جانتے ہو؟ وہ مزنگ کا رہنے والا ہے؟"

"نام سنا ہے۔" سہیل نے کہا۔ "وہ بھی اسی قسم کے دھندے کرتا ہے۔ دراصل حکمرانی تو بڑے غنڈے اور بدمعاش ہی کرتے ہیں۔ انہوں نے علاقے بانٹ رکھے ہیں۔ یہ غنڈے اور بدمعاش ان علاقوں کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ بھتے وصول کرنا، شہریوں کو پریشان کرنا اور منشیات فروشی ان کا کاروبار ہے۔ یہ کاروبار کھلے عام ہوتا ہے۔ پولیس کی ان کو سرپرستی حاصل ہے۔ پولیس ان سے بھتہ وصول کرتی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے پولیس کی سرپرستی میں ہو رہا ہے۔ چھانگا بھی ایک ہی آدمی ہے مگر تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"وہ میری رہائی سے دو دن پہلے مجھ سے ملنے کے لئے آیا تھا۔" شارق نے بتایا۔ "وہ شیرا پہلوان سے کوئی انتقام لینا چاہتا ہے۔ ممکن ہے ان میں کاروباری رقابت ہو۔ وہ مجھے آلہ کار بنانا چاہتا ہے۔ اس نے میری طرف دوست کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ میں اس کی دوستی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس طرح شیرا پہلوان اور اس جیسے لوگوں کے خلاف مجھے ایک سپورٹ مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" سہیل نے کندھے اچکا دیئے۔ "میرا کام تمہیں سمجھانا تھا۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اچھے برے کی تمیز تم خود کر سکتے ہو۔ اچھا، تم بیٹھو۔ میں ذرا ریسٹورنٹ کا چکر لگا کر آتا ہوں۔" سہیل کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بیل کا بٹن دبا دینا۔" اس نے دروازے کے قریب لگے ہوئے ایک بٹن کی طرف اشارہ کیا۔

سہیل کے جانے کے بعد شارق دیر تک صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ تو بہرحال طے تھا کہ اسے شرافت کی زندگی گزارنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ وہ ملک کے کسی بھی کونے میں چلا جائے وہ لوگ اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگے کیوں؟ منہ چھپانے سے تو بہتر ہے کہ یہاں رہتے ہوئے ان لوگوں کا مقابلہ کیا جائے۔

دوپہر کا کھانا بھی اس نے کمرے میں کھایا اور پھر سو گیا۔ شام کو چھ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ سہیل اس وقت تھوڑی دیر کے لئے اوپر آیا تھا۔ اس نے اسے کچھ رقم بھی دے دی تھی اور اس کمرے کے دوسرے دروازے کی چابی تاکہ ریسٹورنٹ میں آنے کے بجائے دوسرے دراوزے سے اپنی آمد و رفت جاری رکھ سکے۔

آٹھ بجے کے قریب شارق سیڑھیوں والے دوسرے دروازے سے باہر آ گیا۔ وہ گلیوں ہی گلیوں سے ہوتا ہوا ہسپتال روڈ پر آ گیا اور ہسپتال کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ یہاں سے ایک سڑک گوالمنڈی اور نسبت روڈ کی طرف چلی گئی تھی اور ایک دائیں طرف کچھ آگے جا کر یہ سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک شاخ تو سیدھی میکلوڈ روڈ کی طرف چلی گئی تھی اور دوسری جی پی او کے سامنے مال روڈ سے جا ملتی تھی۔

شارق کو اندازہ نہیں تھا کہ اسے کس طرف جانا چاہئے۔ اسے راستوں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ مزنگ کس طرف ہے اور باغبانپورہ کس طرف۔ اس کی جیب میں تقریباً ساڑھے گیارہ سو روپے کی رقم موجود تھی۔ دو سو روپے صبح اسے جیلر نے دیئے تھے۔ جن میں سے کچھ پیسے خرچ ہوئے تھے اور ایک ہزار روپے سہیل نے دیئے تھے۔ وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ بائیں طرف بانسوں والا بازار تھا۔ اس سڑک پر دونوں طرف بانسوں اور ٹمبر وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ یہی سڑک آگے جا کر شاہ عالمی کے چوک سے جا ملتی تھی۔ ایک رکشہ شارق کے

قریب ہی آ کر رکا۔ دو عورتیں رکشہ سے اتریں۔ وہ ڈرائیور کو پیسے دے رہی تھیں کہ شار
رکشے میں بیٹھ گیا۔

"کہاں جانا ہے باؤ جی۔" ڈرائیور نے رکشہ سے اترنے والی عورتوں سے پیسے لے کر مڑ
شارق کی طرف دیکھا۔

"مزنگ چوک۔" شارق نے جواب دیا۔

"او باؤ۔" رکشہ ڈرائیور نے مڑ کر غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم وہی ہو نا جو صبح میر
رکشے میں بیٹھے تھے اور پورے پیسے لئے بغیر بھاگ کر بس میں سوار ہو گئے تھے؟"

"ارے! تم وہی ہو۔" شارق بولا۔ "کتنی چھوٹی ہے یہ دنیا۔ چند گھنٹوں بعد ہماری دو
ملاقات ہو گئی۔"

"تمہارے جانے کے بعد مجھے ایک سوزوکی کار والے نے بہت تنگ کیا تھا۔" ڈرائیور
کہا۔ "وہ بار بار پوچھ رہا تھا کہ تم رکشے سے اتر کر کہاں گئے ہو؟ کون تھا وہ باؤ جی؟"

"پتہ نہیں وہ کون تھا؟" شارق نے جوابدیا۔

"اور وہ مائی کون تھی جو صبح رکشے کے پیچھے بھاگ رہی تھی؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ تم رکشہ چلاؤ۔" شارق نے اس مرتبہ خشک لہجے میں جواب دیا۔

رکشہ حرکت میں آ گیا۔ شارق گہری نظروں سے راستوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ تقریباً بیس
منٹ بعد رکشہ مزنگ چوک پر پہنچ گیا۔

"کہاں جانا ہے باؤ جی۔ مزنگ چوک پر تو ہم آ گئے ہیں۔" ڈرائیور نے کہا۔

"یہیں روک لو۔" شارق بولا۔ رکشہ رک گیا۔ وہ میٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

"دس روپے دے دو باؤ جی۔ تمہارے صبح کے پیسے بھی بچے تھے۔" ڈرائیور نے کہا۔

بڑا دیانت دار ڈرائیور تھا۔ شارق نے جیب سے دس کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما
اور رکشے سے اتر گیا۔

وہ ایک جگہ رک کر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ بڑی بارونق جگہ تھی۔ کچھ دیر وہ اسی جگہ پر کھڑا
پھر کچھ آگے جا کر ایک پان والے کی دکان پر رک گیا۔ اس وقت دکان پر صرف ایک ہی گاہک
تھا۔ وہ نوجوان ہی تھا۔ عمر انیس بیس سال رہی ہو گی۔ نیلی جینز اور سفید ٹی شرٹ جس کے سینے
میامی کے ساحل کی تصویر کا عکس چھپا ہوا تھا۔ اس نوجوان کے منہ میں پان تھا اور ایک ہاتھ کی
انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ دبا ہوا تھا۔

"ایک آدمی کے بارے میں کچھ معلوم کرنا ہے۔" شارق دکان والے کی طرف دیکھتے ہو

بولا۔

"کون ہے جی؟" دکاندار نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چھانگا نام ہے اس کا۔ یہیں کہیں رہتا ہے۔" شارق نے کہا۔

"آپ کو سودا چاہئے تو مجھ سے لے لیں۔ چھانگا کو تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"وہ میرا دوست ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" شارق نے جواب دیا۔

"آپ سامنے والی سڑک پر چلے جائیں۔ تقریباً دو سو گز آگے بائیں طرف والی سڑک پر مڑ
جائیں۔ وہاں موٹروں کی ورکشاپیں ہیں۔ اسی سڑک پر چھانگے کا طویلہ ہے۔ ویسے آپ کہیں باہر
سے آئے ہیں کیا؟" دکاندار نے کہا۔

"ہاں' میں کراچی سے آیا ہوں۔" شارق نے جواب دیا اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے
سامنے والی سڑک کی طرف چل دیا۔

یہ سڑک بھی بڑی بارونق تھی۔ تمام دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور بڑی چہل پہل تھی۔ تقریباً دو
سو گز آگے بائیں طرف کارنر پر ایک ریسٹورنٹ تھا جو گاہکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ریسٹورنٹ کے اندر
بالکل سامنے والی دیوار پر ایک اونچے شیلف پر ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ جس پر امرتسر ٹیلی ویژن دور
درشن سے کوئی انڈین فلم چل رہی تھی۔ ریسٹورنٹ میں گاہکوں کی زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی جو
بڑے انہماک سے فلم دیکھ رہے تھے۔

شارق ریسٹورنٹ کے ساتھ والی سڑک پر مڑ گیا۔ اس سڑک پر ذرا آگے موٹروں کے لاتعداد
ورکشاپس تھے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر ٹوٹی پھوٹی گاڑیوں کے ڈھانچے پڑے تھے۔ صرف دو
ورکشاپ کھلے تھے اور باقی سب بند ہو چکے تھے۔ تقریباً سو گز آگے دائیں طرف انہی ورکشاپس کے
بیچ میں لکڑی کا ایک اونچا گیٹ تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر چند تانگے کھڑے تھے۔ گیٹ کے اندر
اندھیرا تھا۔ شارق نے ادھر ادھر دیکھا اور گیٹ میں داخل ہو گیا۔ لیکن ابھی چند ہی قدم آگے بڑھا
تھا کہ ایک آدمی تاریکی سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔

"کون ہو تم..... کہاں منہ اٹھائے چلے آ رہے ہو؟ کس سے ملنا ہے؟" اس کے لہجے میں
سرد مہری تھی۔

"میرا نام شارق ہے۔ چھانگا سے ملنا ہے۔" شارق نے جواب دیا۔ اس چادر پوش کو اچانک
ہی اپنے سامنے دیکھ کر شارق کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"چھانگا سے کیا کام ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟" اس شخص نے اسے گھورا۔

"اس سے جا کر کہہ دو' شارق جیل سے رہا ہو کر آ گیا ہے۔" شارق نے جواب دیا۔

وہ شخص چند لمحے خاموشی سے اسے گھورتا رہا اور پھر اس نے شارق کا لباس تھپتھپا کر یہ چیک کیا کہ اس کے پاس کسی قسم کا اسلحہ تو نہیں۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی چادر میں چھپی ہوئی رائفل کی نال شارق سے ٹکرا گئی۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ شخص سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

شارق اس کے ساتھ چل پڑا۔ گھوڑوں کی لید کی بو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ تانگے کھڑے تھے۔ چند گھوڑے بھی بندھے ہوئے تھے۔ یہ وسیع و عریض احاطہ تھا جس کے آخر پر کسی قدیم طرز کا ایک شکستہ سا گنبد بھی تھا۔ دائیں طرف تین چار کمرے بنے ہوئے تھے۔ لاہور میں ایسے احاطے بکثرت پائے جاتے تھے۔ یہ تمام دراصل مغلیہ دور کے مزار تھے۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جن پر چھانگا جیسے لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ شخص ایک جگہ رک گیا۔

"جیرے.....او جیرے۔" اس نے کسی کا نام لے کر پکارا۔

ایک آدمی ایک کمرے سے نکل کر ان کے قریب آ گیا۔

"اس باؤ کو چھانگے استاد کے پاس لے جانا۔ کہتا ہے آج ہی جیل سے آیا ہوں۔ عجیب سا نام بتایا ہے اس نے۔ کیا نام ہے باؤ؟" وہ شارق کی طرف دیکھنے لگا۔

"شارق۔" شارق نے جواب دیا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" جیرے نے کہا۔ شارق اس کے ساتھ چل پڑا اور دوسرا آدمی گیٹ کی طرف واپس چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد شارق' چھانگا کے سامنے موجود تھا۔ چھانگا ایک کمرے میں بچھی ہوئی دری پر بیٹھا ہوا تھا۔ دو آدمی اور بھی تھے۔ وہ شارق کو دیکھ کر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

"بسم اللہ۔" وہ شارق کو گرمجوشی سے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے بولا۔ "میرا شارق باؤ آیا ہے۔ اوست بسم اللہ۔"

وہ شارق سے اس طرح ملا تھا جیسے بچھڑا ہوا بھائی یا بہت قریبی عزیز ہو۔"

"بیٹھو شارق باؤ۔" چھانگا اسے لے کر دری پر بیٹھ گیا۔ "میرا دل کہتا تھا تم ضرور آؤ گے اسی کو کہتے ہیں نا' دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اوئے جیرے.....جا کر کوئی ٹھنڈا شنڈا لے آؤ۔"

جیرا فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ کوک کی ٹھنڈی بوتلیں لے کر آ گیا۔ اس نے ایک ایک بوتل کھول کر سب کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس دوران ایک اور آدمی کمرے میں آ گیا۔ وہ مشتبہ نگاہوں سے شارق کی طرف دیکھنے لگا۔

"اوئے ناداں نکال۔ کتنی چاہئے۔ اس کی طرف کیا دیکھ رہا ہے۔ یہ اپنا ہی بندہ ہے۔" چھانگے نے کہتے ہوئے اسے گھورا۔

"آدھا کلو۔" اس شخص نے قمیص کے نیچے شلوار کی کسی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر چھانگے کی طرف بڑھا دی۔ چھانگے نے نوٹوں کی گڈی لے کر قریب رکھے ہوئے ایک صندوقچے میں ڈال دی۔ اور ایک تھیلے میں سے ایک پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ہیروئن تھی۔ اس شخص نے پیکٹ شلوار کی جیب میں ڈال لیا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

"اور سنا شارق باؤ۔ کب چھوٹے تھے سرکاری مہمان خانے سے؟ قسم خدا کی' بڑی عجیب جگہ ہے وہ۔ میں ایک دفعہ گیا تھا۔ اس کے بعد تو بس کسی کو ہمت نہیں ہوئے میرے اوپر ہاتھ ڈالنے کی۔ رب جھوٹ نہ بلوائے۔ وہ جگہ تو آدمی کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اور مجھے دیکھ لو۔ پولیس والے روز میرے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ ایسی چھترول کرتے تھے کہ بے بے یاد آ جاتی تھی۔ پر اب جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔" چھانگا نے کہا۔

"آج صبح ہی رہائی ملی تھی۔" شارق نے جواب دیا۔ "میں تو صبح ہی یہاں آ جاتا لیکن جیل کے گیٹ سے نکلتے ہی شیرا پہلوان کا ایک آدمی پیچھے لگ گیا تھا۔"

"اب تم آ گئے ہو تو نبڑ لیں گے اس سے بھی۔ آؤ ذرا دوسرے کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" چھانگا کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اوئے جیرے۔ سنبھال یہ سب کچھ۔"

شارق بھی اٹھ گیا۔ وہ دونوں اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔ وہاں بھی دری بچھی ہوئی تھی۔ گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں آمنے سامنے تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ کوک کی بوتل اب بھی شارق کے ہاتھ میں تھی۔

"دیکھ شارق باؤ۔" چھانگا اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یہ تجربہ تو ہو گیا ہو گا کہ اس دنیا میں شرافت سے زندہ نہیں رہا جا سکتا۔ لوگ زندہ رہنے ہی نہیں دیتے۔ مجھے دیکھ لو۔ میرا باپ اسی لاہور میں تانگہ چلاتا تھا مجھے پڑھنے کا شوق تھا۔ میرا باپ بہت ہی غریب آدمی تھا۔ وہ صبح سے رات تک تانگہ چلاتا تب کہیں جا کر گھر کا خرچ پورا ہوتا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ اسے نشے کی لت لگ گئی۔ وہ نشہ کرنے لگا۔ ایک مرتبہ پولیس نے پکڑ لیا۔ تم جانتے ہو نا کہ جو آدمی ایک مرتبہ پولیس کے ہاتھ لگ جائے وہ مر کر ہی پیچھا چھڑا سکتا ہے۔ یہی حال میرے باپ کے ساتھ ہوا۔ میرا باپ نشہ کرتے کرتے نشہ بیچنے لگا۔ وہ اس طویلے سے تانگہ کرائے پر لے کر چلاتا تھا۔ یہ مہر کا طویلہ کہلاتا تھا۔ مہر علی احمد یہاں چرس' افیون اور شراب بیچا کرتا تھا۔ پولیس کو بھی بھتہ دیتا تھا۔ اس کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔

میرا باپ نشہ کرتے کرتے خود بھی زندہ درگور ہو گیا تھا۔ اس کی رگوں میں خون سوکھ گیا تھا۔ اس نے نشہ بیچنا چھوڑ دیا۔ مگر پولیس والے اپنا بھتہ وصول کرنے کے لئے اسے تنگ کرتے رہے۔ پھر وہ اسے پکڑ کر تھانے لے گئے۔ اسے اتنا مارا' اتنا مارا کہ وہ تھانے ہی میں مر گیا۔ انہوں نے اس کی لاش اٹھا کر آدھی رات کو سڑک پر ڈال دی اور دوسرے دن اخبار میں چھپوا دیا کہ نشے کی زیادتی سے مر گیا۔

باپ کے مرنے کے بعد میں نے پڑھنا چھوڑ کر تانگہ چلانا شروع کر دیا۔ اس وقت میری عمر بھی بارہ سال تھی اور میں نے آٹھویں جماعت سے پڑھنا چھوڑا تھا۔ میرے باپ کی موت کے بعد پولیس والے میرے پیچھے پڑ گئے۔ مجھے آئے دن تھانے میں لے جا کر بند کر دیا جاتا اور میری چھترول کی جاتی کہ تھانے کے آس پاس کے مکانوں میں رہنے والے بھی میری چیخوں کی آواز سن کر کانپ جاتے۔

مہر علی احمد نے بھی مجھے پٹی پڑھانا شروع کر دی کہ میں بھی باپ کی طرح یہ دھندہ شروع کر دوں تو پولیس اپنا حصہ لے کر میرے ساتھ مار پیٹ چھوڑ دے گی۔ میں نے مہر علی احمد کا کہا مان لیا اور چرس' افیون اور شراب بیچنے لگا۔ اس دھندے کے ساتھ میں تانگہ بھی چلاتا رہا۔ پھر میں نے تانگہ چلانا چھوڑ دیا اور چوک پر پان سگریٹ کی دکان کھول لی۔ نشہ کرنے والے گاہک اسی دکان پر میرے پاس آتے رہے۔

"ایک دن میں نے نشے کے عادی ایک شخص کو مرتے ہوئے دیکھ لیا۔ رب جھوٹ نہ بلوائے' بڑی ہی اذیت ناک موت تھی۔ میں نے اس روز کے بعد نشہ بیچنا چھوڑ دیا اور پولیس کو بھتہ دینے سے بھی انکار کر دیا۔ پولیس نے پھر میری پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ اور بالآخر منشیات فروشی اور ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزام میں چار سال کے لئے جیل بھجوا دیا۔"

"وہ میری پہلی اور آخری جیل تھی۔ میں جیل سے نکلا تو محمد رفیق سے چھانگا بن گیا۔ میں چھانگا نامی ایک قیدی نے میری تربیت کی تھی۔ میں نے اس کا نام اپنا لیا۔ آج مہر علی احمد یہ طویلہ میری ملکیت ہے۔ وہی پولیس والے جو میری چھترول کیا کرتے تے آج جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ میں یہاں کھل کر یہ کام کرتا ہوں۔ کسی پولیس والے کو میرے اس طویلے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ میرے آدمیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ میں وہی ہوں' یہ پولیس والے بھی وہی ہیں۔ پر دھندہ ذرا سا بدل گیا ہے۔ پہلے یہاں چرس' افیون اور شراب بکا کرتی تھی اب افغانی پوڈر بکتا ہے۔ یہ ہیروئن بڑی نامراد شے ہے۔ بڑا نشہ ہے۔ جب سے اپنے ملک سے بھاگ کر آنے والے افغانوں نے ہمارے ملک کو دو تحفے دیئے ہیں۔ ہیروئن اور

کلاشنکوف۔ اب ہماری قوم ان دو چیزوں سے جان نہیں چھڑا سکتی۔ بھلا پولیس ایسے کام بند کرا سکتی ہے جن سے انہیں روزانہ لاکھوں کروڑوں کی کمائی ہوتی ہے۔ یہ تو بہتی گنگا ہے شارق باؤ۔ جس میں چوٹی سے لے کر بڑے تک.....سب ہی ہاتھ دھو رہے ہیں۔ ہم اور تم کیوں محروم رہیں۔ پولیس نے ہم جیسے لوگوں سے یہ کام کروانا ہی ہے تو کیوں نہ اپنی خوشی سے کریں۔ مجھ جیسے کسی کا دل ٹٹول کر دیکھ لو۔ کوئی شخص ماں کے پیٹ سے مجرم پیدا نہیں ہوا۔ اسے مجرم بنایا جاتا ہے اور بنانے والے یہی ہیں۔ ہمارے قانون کے محافظ تیری اپنی مثال تیرے سامنے ہے۔ خود ہی سوچ لے۔ تیرے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا۔ اب تیرے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ پولیس کی مار یا پھر خوشی سے یہ دھندہ۔ عزت اور شرافت کی زندگی تو کبھی نہیں گزار سکتا۔ پولیس کو جب بھی کسی مجرم کی ضرورت ہو گی خانہ پری کے لئے تمہیں پکڑ کر بند کر دے گی۔ اگر بھاگنا چاہو گے تو بھاگ نہیں سکو گے۔ میری طرح اس دھندے میں آؤ گے تو دولت بھی ملے گی اور یہ پولیس والے بھی جھک جھک کر تمہیں سلام کریں گے۔

"میں نے تمہارے بارے میں سب کچھ جان لیا ہے۔ اس لئے جیل جا کر تم سے ملا بھی تھا۔ یہاں آئے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے کوئی فیصلہ بھی کر لیا ہے۔"

"ہاں' میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" شارق نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "لیکن مجھے تحفظ کی ضرورت ہے۔"

"تحفظ!" چھانگا نے کہا۔ "تم میرے پاس آ گئے ہو' سمجھو کہ اب لاہور کا کوئی پولیس والا تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اور جہاں تک شیرا پہلوان کا سوال ہے تو دیکھتے رہنا میں کس طرح ناک آؤٹ کرتا ہوں۔ اسے تو ایسا گراؤں گا کہ دوبارہ اٹھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکے گا۔"

"تمہارے ساتھ کاروبار میں شریک ہونے سے پہلے میں دو تین آدمیوں کو تھوڑی سی سزا دینا چاہتا ہوں۔ جن کی وجہ سے آج میں یہاں بیٹھا ہوں۔ ان میں سے ایک کو تو تلاش کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ لیکن باقیوں کو تلاش کرنا مشکل نہیں۔ وہ سامنے ہیں۔" شارق نے کہا۔

"تم نام بتاؤ..... انہیں لا کے تمہارے قدموں میں نہ پھینک دوں تو نام بدل دینا میرا۔" چھانگا نے کہا۔

"ان میں ایک تو ڈی ایس پی ہے۔" شارق نے کہا۔ "گیارہ سال پہلے جب مجھے میرے ماں باپ کے قتل کے الزام میں جیل بھجوایا گیا تھا تو یہی ڈی ایس پی اس وقت انسپکٹر تھا۔ دراصل مکان کے سلسلے میں میرے باپ کا ایک پڑوسی سے مقدمہ چل رہا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ میرے

ماں باپ کو اسی شخص نے قتل کروایا تھا اور پھر انسپکٹر کو بھی پیسے دے کر مجھے ماں باپ کے
الزام میں پھنسوا دیا۔ یہیں سے میری بربادی شروع ہوئی تھی۔ اگر وہ انسپکٹر ایماندار
شناس ہوتا تو مجھ پر جھوٹا مقدمہ بنانے کے بجائے اصل قاتلوں کو تلاش کرتا۔ لیکن اس
نہیں کیا۔ رشوت نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ فرض بھی اور دیانت بھی۔ اور پھر دس
جب میں جیل سے باہر آیا تو اس بدنیت شخص نے میرے مکان کو آگ لگوا کر مجھے آتش
الزام میں پھنسانے کی کوشش کی مگر علاقے کے کونسلر ملک منیر نے نہ صرف مجھے بچا
تھانیدار کو معطل کروا دیا۔ اس تھانیدار پر اب کیس چل رہا ہے جب کہ سلمان نامی
روپوش ہو گیا۔ اسے میں بعد میں تلاش کر لوں گا۔ لیکن وہ انسپکٹر جو میری بربادی کے آغاز
دار ہے آج ڈی ایس پی ہے۔ اس کے بعد دوسرا نمبر بھاٹی کے موجودہ انسپکٹر کا ہے۔
پہلوان کے ساتھ مل کر پچھلے تین مہینوں سے میرا جینا حرام کیے ہوئے ہے۔ بس یہ دو آ
کے علاوہ اپنے دشمنوں سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔"

"شارق باؤ۔" چھانگا نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "بڑا مشکل کام بتایا ہے تم نے۔
نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے اور دوستی میں نفع نقصان نہیں دیکھا جاتا۔ لا
آج سے ہماری دوستی پکی۔"

ان دونوں نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔

"شارق باؤ....." چھانگا نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "کل رات کو تماشہ د
تمہارے ڈی ایس پی کا جو حشر ہو گا وہ تم دیکھ لو گے۔"

"میں ساتھ ہوں گا۔" شارق نے کہا۔ "پہلے میں اسے بتاؤں گا کہ سزا اسے کس جر
جا رہی ہے۔"

"ایسے لوگوں کے ہزاروں دشمن ہوتے ہیں' تمہیں سامنے آنے کی کیا ضرورت ہے۔
بولا۔

"نہیں' سزا میں اسے خود دوں گا۔" شارق نے کہا۔

"ٹھیک ہے شارق باؤ۔" چھانگا نے کہا۔ "کل دن میں' میں اس کے بارے میں س
معلوم کر لوں گا۔ رات کو دو تین بندے اپنے ساتھ لے جانا۔ اسے اٹھا کر یہیں لے آنا۔
گے اس ڈی ایس پی میں کتنا دم خم ہے۔"

"اچھا تو اب میں چلوں' کل رات کو آؤں گا۔" شارق اٹھتے ہوئے بولا۔

"یہ طویلہ اب تمہارا ہے۔ یہیں رہو۔" چھانگا نے کہا۔

"میں جیل سے نکلنے کے بعد اپنے بچپن کے ایک دوست کے پاس چلا گیا تھا۔ سارا دن اس
ں رہا۔ میں اسے بتا کر نہیں آیا تھا۔ اگر واپس نہ گیا تو وہ پریشان ہو گا۔ میں کل شام کو آ
گا۔" شارق نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔ لو یہ رکھ لو..... تمہیں اس کی ضرورت ہو گی۔" اس نے
ے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر شارق کے ہاتھ میں تھما دی۔

وٹوں کی گڈی تھی جسے شارق نے پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا اور چھانگا سے ہاتھ
طویلے سے باہر آ گیا۔ جب وہ چوک سے رکشے پر بیٹھ رہا تھا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی
ٹ تھی۔

○

شارق نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ واقعی بہت خطرناک تھا۔ لیکن وہ اس راستے پر خود
آیا تھا۔ اسے دھکیلا گیا تھا۔ مجبور کیا گیا تھا اس راستے پر چلنے کے لئے۔

چھانگا سے ملاقات کے بعد جب وہ سہیل کے ریسٹورنٹ والے کمرے میں پہنچا تو رات کے
گیارہ بج چکے تھے۔ ریسٹورنٹ میں اس وقت بھی چند گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ
و ریستورانوں میں بیٹھ کر چائے کی ایک پیالی پر گھنٹوں سیاست پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ ان
کی باتوں سے یہ تاثر ملتا ہے جیسے انہیں ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر مکمل عبور حاصل ہے
ر ان کی تجاویز اور مشوروں پر عمل کر لیا جائے تو دنیا جنت بن جائے۔

شارق گلی میں سیڑھی والے دروازے سے آیا تھا اور اوپر والے کمرے کا دروازہ اس نے اس
سے کھولا تھا جو سہیل نے اسے دی تھی۔ جب وہ دراوزہ کھول کر اندر داخل ہوا تو سہیل
ے میں موجود تھا اور بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔

"میں عام طور پر رات کا کھانا دس بجے کھا لیتا ہوں۔" سہیل اسے دیکھ کر بولا۔ "آج میں
ہارا انتظار کیا مگر تم نہیں آئے تو بھوک برداشت سے باہر ہو گئی۔ آؤ' تم بھی آ جاؤ۔"

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔" شارق کہتے ہوئے اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ
"تم اس وقت ریسٹورنٹ میں نہیں بیٹھتے کیا؟"

"کبھی کبھی تو دیر تک بیٹھا رہتا ہوں۔ ویسے عام طور پر اس وقت شاہد کاؤنٹر پر بیٹھ جاتا ہے۔
لڑکا ہے۔ چھ سال سے میرے پاس کام کر رہا ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے بہت سی سہولتیں
گئی ہیں۔ آرام کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔" سہیل نے کہا۔

کھانے کے بعد سہیل نے چائے منگوا لی۔ چائے پینے کے بعد شارق اٹھ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" سہیل نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں ذرا ماں جی اور رضیہ سے ملنے جا رہا ہوں۔" شارق نے جواب دیا۔ "تمہارا پورے والا مکان مجھے کب مل سکے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ماں جی اور رضیہ کو وہاں منتقل کر کیونکہ ان کا یہاں رہنا اب ٹھیک نہیں ہوگا۔ شیرا پہلوان کے آدمی یا پولیس انہیں تنگ کرتی گی اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں کسی قسم کی پریشانیوں کا سامنا ہو۔"

"کل صبح شاہد کو ساتھ لے جانا۔" سہیل نے کہا۔ "وہ صفائی وغیرہ کر دے گا۔ اور پھ چاہو تم انہیں وہاں منتقل کر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی واپسی پر شاید مجھے دیر ہو جائے۔ پریشان مت ہونا۔" شارق کہ دروازے سے باہر نکل گیا۔ دروازے کا آٹومیٹک لاک خود بخود بند ہو گیا۔

شارق مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا ہسپتال روڈ پر آ گیا اور اخبار مارکیٹ کے سامنے سے گ مین روڈ پر آ گیا۔ وہ لوہاری دروازے کی طرف مڑنے کی بجائے دائیں طرف مڑ گیا اور سڑک کے سامنے ایک گلی میں داخل ہو گیا اور پھر قدیم لاہور کی بھول بھلیاں نما گلیوں سے ہوتا ہ والے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔

رات کا ایک بج چکا تھا۔ گلیاں تاریک اور سنسان تھیں۔ اس نے مکان کے سامنے ر محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ صبح جیل کے گیٹ پر کو جس حال میں چھوڑ کر بھاگا تھا اس کے پیش نظر اسے یقین تھا کہ مریم نے پورا دن رو کر ہو گا اور اس وقت بھی رو رہی ہو گی۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ اس نے اگرچہ دستک ہ دی تھی لیکن چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی مریم ہی تھی۔ اس نے دوپٹہ پٹی کی طرح باندھ رکھا تھا۔ شارق نے اندر داخل ہوتے ہی جھک کر مریم کے پیر پکڑ

"مجھے معاف کر دیں ماں جی۔" شارق بے اختیار رو دیا۔ "میں نے جیل میں آ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا اور آج صبح جیل کے گیٹ پر میں نے جو کچھ بھی کیا مجھے افسوس ہے ماں جی۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ میرے دل پر کیسے کیسے چھریاں چلتی رہی ہیں نے جو کچھ بھی کیا مجھے معاف کر دیں ماں جی!"

"مجھے یقین تھا کہ تو ضرور آئے گا۔" مریم نے کہتے ہوئے اسے قدموں سے اٹھا کر لگا لیا۔ "میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ میں نے تمہیں اپنا دودھ تو نہیں پلایا لیکن لئے میرے دل میں مامتا جیسی تڑپ ہے۔"

"میں جانتا ہوں ماں جی۔ میں جانتا ہوں۔" شارق بولا۔

"اماں... کون ہے؟" کمرے سے رضیہ کی آواز سنائی دی۔

مریم نے شارق کا نام لینے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ شارق نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ

"اونچی آواز میں میرا نام نہ لیں ماں جی۔ اندر چلیں۔"

وہ دونوں کمرے میں آ گئے۔ رضیہ شارق کو دیکھ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ بھی زار و قطار رو ی تھی۔

"ہم سے ایسا کون سا جرم ہو گیا تھا جو آپ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے بھیا؟" رضیہ روتے ئے بولی۔

"جرم تو میرا تھا رضیہ۔" شارق نے کہا۔ "میری وجہ سے تم لوگوں کو ذلت و رسوائی کا جو امنا کرنا پڑتا رہا ہے۔ اس پر مجھے افسوس ہے۔ صبح ماں جی سے میں اس لئے دامن چھڑا کر بھاگا تھا ہ میرا ایک دشمن بھی جیل کے دروازے پر موجود تھا۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور انہیں پولیس کی سرپرستی حاصل ہے۔ اب تک تو وہ لوگ صرف مجھے ہی پریشان کرتے رہے ہیں۔ لیکن ھے شبہ تھا کہ ماں جی کو میرے ساتھ دیکھ کر وہ تم لوگوں کو بھی پریشان کرنا شروع نہ کر دیں۔ لیکن اب میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ اب کوئی مائی کا لعل میری طرف انگلی بھی نہیں اٹھا سکے گا۔ اب میں چوبیس گھنٹے تم لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے میں نے تم لوگوں کے لئے بھی بندوبست کر لیا ہے۔ تم لوگ کل میرے ساتھ چلو گی۔"

"کہاں؟" مریم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہاں تم لوگوں کا اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" شارق نے جواب دیا۔ "میں نے باغبانپورہ میں ایک مکان کا بندوبست کر لیا ہے۔ کل رات تک اپنی ضروری چیزیں سمیٹ لینا۔ بہت ضروری چیزیں۔ زیادہ سے زیادہ ٹرنک۔ فالتو کوئی چیز نہیں۔ نئے گھر میں ہر چیز موجود ہو گی' اور یہاں کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم لوگ کہیں جا رہی ہو۔ میں کل رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان آؤں گا۔ تم دونوں میرے ساتھ چلو گی۔"

"تو کیا ہمیں چوروں کی طرح یہ گھر چھوڑنا پڑے گا؟" مریم بولی۔

"کچھ عرصے کی بات ہے ماں جی۔ اس کے بعد ہم پھر یہیں آ جائیں گے۔" شارق نے کہا۔

"بات کیا ہے؟ تو مجھے بتاتا کیوں نہیں؟" مریم نے اسے گھورا۔

"آپ سب کچھ جانتی ہیں ماں جی۔" شارق نے جواب دیا۔ "بعض لوگ پولیس کے ساتھ مل کر بلاوجہ میرے دشمن بن گئے ہیں۔ میں چند روز کے لئے باہر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے شبہ ہے کہ

میری عدم موجودگی میں وہ لوگ آپ کو پریشان کریں گے۔ اس لئے میں نے اس مکان کا بندو
کیا ہے۔ تاکہ وہ لوگ آپ دونوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔
لوگ کل رات دس بجے تک تیار رہئے۔"

"تھوڑی دیر تو بیٹھو نا بھیا۔ میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" رضیہ نے کہا۔

"اس نے تمہارے غم میں صبح سے کچھ نہیں کھایا شارق بیٹے۔" مریم نے اسے بتایا۔

"ماں۔ کھایا تو تم نے بھی کچھ نہیں۔ صبح سے رو رو کر ہلکان ہو رہی ہو۔" رضیہ بولی۔

شارق کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ وہ باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھنے لگا۔

"اچھا' چلو تم روٹی پکاؤ۔ میں تم لوگوں کو کھلا کر جاؤں گا۔" شارق بولا۔

"روٹی تو میں نے شام کو پکائی تھی' لیکن نہ اس نے کچھ کھایا نہ میں نے۔ میں سالن گ
کرتی ہوں۔ تم بھی کچھ کھا لینا۔" مریم کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

مریم باورچی خانے میں چلی گئی اور شارق رضیہ سے باتیں کرتا رہا۔ اور پھر ان دونوں
ساتھ اسے بھی تھوڑا بہت کھانا کھانا پڑا تھا اور جب وہ مکان سے باہر نکلا تو تین بج رہے تھے۔
نے ایک بار پھر ان دونوں کو تاکید کی کہ کل رات دس بجے تک تیار رہیں اور دروازے سے
نکل کر تیز تیز قدموں سے تنگ و تاریک پر پیچ گلیوں میں چلنے لگا۔

جب وہ ریسٹورنٹ کے اوپر سہیل کے کمرے میں پہنچا تو سہیل قالین پر چادر بچھائے سو
تھا۔ شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سہیل نے پلنگ شارق ہی کے لئے خالی چھوڑ دیا تھا۔
نے جوتے اتار کر ایک طرف رکھے اور بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔

ریسٹورنٹ کا کاروبار صبح چھ بجے شروع ہو جاتا تھا۔ سات بجے تک شاہد کاؤنٹر سنبھالتا تھا
پھر سہیل ناشتہ کر کے نیچے چلا جاتا تھا۔ شارق اگرچہ تین ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ سویا تھا
صبح ساڑھے چھ بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ سہیل اس وقت جاگ چکا تھا۔ شارق بھی منہ ہاتھ
کر تیار ہو گیا۔ سات بجے انہوں نے اکٹھے ہی ناشتہ کیا اور ساڑھے سات بجے شارق' شاہد کو
کر نکل گیا۔

جب وہ باغبانپورہ پہنچے تو ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ باغبانپورہ ٹیلی فون ایکسچینج بلڈنگ اور
روڈ پر واقع وسیع و عریض کوٹھیوں کے عقب میں متوسط طبقے کی آبادی پر مشتمل وہ علاقہ صاف
ستھرا تھا۔ وہ رکشہ سے اتر کر ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ وہ اس گلی کا تیسرا مکان تھا۔ شارق
اندازے کے مطابق وہ مکان ایک کنال پر مشتمل تھا۔ مکان کے آگے دروازے کے دونوں طر
دیوار کے ساتھ مختصر کیاریاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ لیکن دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے پودے سو

چکے تھے۔ شاہد نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ ایک مختصر
پختہ صحن تھا۔ اور کمرے تھے۔ ایک ڈرائنگ روم اور تین بیڈ رومز۔ کچن میں کیبنٹ بنے ہوئے
تھے۔ تمام کمروں میں پنکھے اور مرکزی ٹیوب لائٹس لگی ہوئی تھیں۔

"میں ہر مہینے یہاں آتا ہوں جی۔ صفائی وغیرہ کر کے جاتا ہوں۔ جو بل وغیرہ آتے ہیں وہ بھی
لے جاتا ہوں۔ سہیل صاحب بل ہر مہینے باقاعدگی سے جمع کرواتے ہیں۔ تاکہ بجلی' گیس یا پانی کی
ن نہ کٹ جائے۔" شاہد نے بتایا۔

"میرا خیال ہے فرش اور دیواریں وغیرہ ذرا جھاڑنی ہوں گی۔" شارق بولا۔

"دس دن پہلے یہاں کی صفائی کر کے گیا تھا۔ پھر بھی تھوڑی بہت جھاڑ پونچھ تو کرنی ہو گی۔
ک اور دوسرا فرنیچر بھی سیٹ کرنا پڑے گا۔ سارا فرنیچر اس کمرے میں بند پڑا ہے۔" شاہد نے
یا۔

شارق نے وہ کمرہ کھلوا کر دیکھا۔ نیواڑی پلنگ' صوفے' کرسیاں' سینٹر ٹیبل اور گھر میں
ستعمال ہونے والا سارا فرنیچر موجود تھا۔

"ایسا کرو تم جھاڑ پونچھ کر لو۔ میں تھوڑا سا سامان لے آؤں۔ یہاں بازار کہاں ہے' جہاں ہر
زل سکے؟" شارق نے کہا۔

"مین روڈ سے تانگے پر بیٹھ جائیں۔ باغبان پورہ کا بازار بہت مشہور ہے۔ ہر چیز مل جائے گی
پ کو۔ آپ اطمینان سے جائیں جی' میں یہ ساری چیزیں سیٹ کر دوں گا۔ سہیل صاحب نے
ے بتا دیا تھا۔ دس بجے تک منا بھی آ جائے گا۔ یوں منٹوں میں کام ختم ہو جائے گا۔" شاہد نے
کی بجائی۔

شارق مسکرا دیا۔ منا بھی ریسٹورنٹ کا ویٹر تھا۔ شارق' شاہد کو مکان میں چھوڑ کر باہر آ گیا۔
سنے والے مکان کے دروازے پر دو عورتیں کھڑی تھیں۔ وہ اسی طرف دیکھ رہی تھیں۔ شارق
ن روڈ پر آ کر تانگے میں بیٹھ گیا۔

باغبانپورہ بازار بہت لمبا چوڑا تھا۔ اس کا ایک سرا شالامار باغ کی دیوار تک چلا گیا تھا۔ شارق
بچپن میں دو تین مرتبہ ماں باپ کے ساتھ شالا مار باغ کی سیر کو آیا تھا۔ مگر یہ بازار اس نے کبھی
ں دیکھا تھا۔ شاہد نے ٹھیک ہی کہا تھا' یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بقول شخصے' سوئی
ے ہاتھی تک دستیاب تھا۔

رات کو چھانگے نے نوٹوں کا جو بنڈل دیا تھا وہ شارق کی جیب میں تھا۔ وہ گھر کی ضرورت کی
رکا خریدتا رہا۔ جب وہ لدا پھندا واپس پہنچا تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ مکان کے سامنے ایک

ریڑا کھڑا تھا اور منا اور شاہد اس پر لدا ہوا فرج اتار رہے تھے۔ یہ وہی فرج تھا جو ریسٹورنٹ اوپر والے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ فرج اور شارق کا لایا ہوا سامان اندر پہنچا دیا گیا۔ شاہد کمرو فرش اور دیواروں کی جھاڑ پونچھ کر چکا تھا۔ ایک کمرے میں بھرا ہوا فرنیچر نکال کر صحن میں لگے اور پھر تینوں مل کر فرنیچر صاف کرنے لگے۔ تین بیڈ رومز تھے۔ اس حساب سے پلنگ بھی تھے۔

جب وہ سارا سامان سیٹ کر کے نکلے تو سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ شارق نے دوپہر منا کو بھیج کر باغبانپورہ کے ایک ہوٹل سے منگوا لیا تھا۔ باہر نکلتے ہی شارق کی نظر اس عورت گئی جو سامنے والے مکان کے دروازے میں کھڑی تھی۔

"وے شاہد۔" اس نے شاہد کو آواز دی۔ وہ یقیناً اسے جانتی تھی۔ "کوئی نیا کرائے دا ہے کیا؟"

"نہیں باجی۔" شاہد نے مڑ کر جواب دیا۔ "سہیل صاحب کی خالہ اور ان کی بیٹی آ رہی سیالکوٹ سے۔ اب وہ یہیں رہیں گی۔ یہ سہیل صاحب کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ آپ لوگ خیال رکھئے باجی۔ ویسے میں بھی یہیں رہوں گا۔"

شارق چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ سہیل نے واقعی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اس فرج بھی بھجوا دیا تھا۔ شارق نے فرج آن کر دیا اور گوشت' دودھ اور کچی سبزیاں بھی لا کر میں رکھ دی تھیں۔ کچن میں رکھے جانے والے نئے برتن بڑے سلیقے سے آراستہ کئے گئے۔ ویسے اسے یہ جان کر اطمینان ہوا تھا کہ شاہد یہیں رہے گا۔

سارے دن کے کام سے شارق بری طرح تھک گیا تھا۔ ریسٹورنٹ کے اوپر والے کمرے پہنچتے ہی وہ بستر پر گر گیا۔ تھوڑی دیر بعد سہیل بھی اوپر آ گیا۔

"سیٹ ہو گیا گھر؟" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے شارق کی طرف دیکھا۔

"ہاں' کوشش تو کی ہے کہ ضرورت کی ہر چیز ڈال دی جائے۔ اگر کسی اور چیز کی ضرور گی تو خود ہی منگوالیں گی۔" شارق نے جواب دیا۔

"میں نے شاہد سے کہہ دیا ہے' وہ کچھ دن وہیں رہے گا۔ جب وہ سیٹ ہو جائیں تو ملازمہ کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ تم تو ظاہر ہے کسی اور ہی راستے پر چل نکلے ہو۔ اس کا افسوس ہی رہے گا۔" سہیل نے کہا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "میں نے شاہد کے بارے میں سمجھا دیا ہے کہ وہ میری خالہ ہیں۔ تم بھی ذرا ماں جی کو سمجھا دینا۔ ویسے وہاں کب لے جاؤ گے؟"

"آج رات۔" شارق نے جواب دیا۔ "شاہد کو شاید لے جاؤں گا۔"

"ہاں' لے جانا۔" سہیل نے سر ہلا دیا۔

تقریباً آٹھ بجے شارق وہاں سے نکل گیا۔ وہ سیدھا مزنگ پہنچا۔ چھانگا اپنے کاروبار میں مصروف تھا۔ لیکن وہ اپنا دھندہ جیرے کے حوالے کر کے فوراً ہی دوسرے کمرے میں آ گیا۔ وہاں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

"میں نے سارا بندوبست کر لیا ہے شارق باؤ۔" چھانگا نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "اس ڈی ایس پی کا گھر گلشن راوی میں ہے۔ میں نے رات دو بجے اسے گھر سے نکالنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ اسے اٹھا کر یہاں لے آئیں گے اور پھر وہ تمہارے رحم و کرم پر ہو گا۔"

"یہاں کوئی گڑبڑ تو نہ ہو جائے گی؟" شارق نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیسی گڑبڑ؟" چھانگا نے کہا۔ "تم چھانگا کو کیا سمجھتے ہو' زندگی اسی لین میں گزاری ہے۔ آؤ' میں تمہیں دکھاؤں۔"

وہ دونوں کمرے سے نکل کر احاطے کے ایک کونے میں واقع مزار کے گنبد میں آ گئے۔ یہ گنبد چھوٹی اینٹوں والے ایک چبوترے پر تعمیر تھا۔ چبوترہ زمین کی سطح سے تقریباً چار فٹ اونچا تھا اور اس پر چڑھنے کے لئے چھوٹی اینٹوں کی تین سیڑھیاں تھیں۔ کسی زمانے میں یہ گنبد بارہ دری کی طرح رہا ہو گا لیکن بعد میں دیواریں کھڑی کر کے اسے ایک کمرے کی شکل دے دی گئی تھی جس میں دروازہ بھی لگا ہوا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

گنبد کی چھت پر ایک بلب ٹنگا ہوا تھا۔ مگر اس کی روشنی ناکافی تھی۔ چبوترے کے وسط میں ایک قبر تھی۔ وہ قبر سنگ مرمر کی تھی اور چبوترے کی سطح سے تقریباً تین فٹ اونچی تھی۔ چھانگے نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈا چڑھا دیا اور دیوار پر لگے ہوئے ایک سوئچ بورڈ پر ایک سوئچ آن کر دیا۔ پھر قبر کے قریب چلا گیا اور قبر کے تعویذ کی نگر کے نیچے ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولنے لگا۔ جب اس نے ہاتھ ہٹایا تو قبر کا تعویذ کسی بہت بڑے صندوق کے ڈھکنے کی طرح اٹھتا چلا گیا۔

شارق حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ قبر کا تعویذ پوری طرح کھل گیا تھا۔

"آؤ شارق باؤ۔" چھانگا نے اشارہ کیا۔

شارق قبر کے قریب پہنچا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ قبر کے اندر نیچے اترنے کی سیڑھیاں تھیں۔ وہ دونوں قبر میں اتر گئے۔ نیچے وسیع و عریض تہہ خانہ تھا۔ تہہ خانے میں بھی بلب جل رہا تھا۔ ایک طرف لکڑی کی بہت سی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان پیٹیوں میں مختلف قسم کا اسلحہ اور ایمونیشن بھرا ہوا تھا۔ ان پیٹیوں کے قریب ہی شیشے کے دروازے والی

بہت بڑی الماری تھی جن میں ہیروئن کے لاتعداد پیکٹ بھرے ہوئے تھے۔

"یہ سب افغان مہاجروں کی مہربانی ہے شارق باؤ۔" چھانگا نے الماری اور پیٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تہہ خانہ کئی سال پہلے میں نے بنوایا تھا۔ بڑا پیسہ لگا تھا اس پر۔ اس کے بارے میں صرف مجھے اور جیرا کو معلوم ہے۔ تیسرے آدمی تم ہو۔ جب لوگ ہیروئن اور ناجائز اسلحہ کے بارے میں شور مچاتے ہیں تو پولیس اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے چھاپے مارنا شروع کر دیتی ہے۔ یہاں بھی کئی مرتبہ چھاپے پڑ چکے ہیں' لیکن پولیس کو یہاں سے کبھی ہیروئن کی ایک پڑیا بھی نہیں ملی۔ اس تہہ خانے میں کسی کو لاکر ذبح بھی کر دیا جائے تو باہر کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔"

شارق حیرت سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ وہ چھانگا کے ساتھ تقریباً آدھے گھنٹے تک تہہ خانے میں رہا۔ چھانگا اسے مختلف اسلحہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ شارق کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس اسلحہ میں پستول' ریوالور اور آٹومیٹک رائفلوں کے علاوہ راکٹ تک موجود تھے۔

وہ تہہ خانے سے باہر آ گئے۔ شارق نے رات کا کھانا چھانگا ہی کے ساتھ کھایا اور پھر ساڑھے نو بجے وہاں سے رخصت ہوگیا۔ اس نے ٹھیک ایک بجے واپس آنے کو کہا تھا۔ چوک پر آ کر اسے فوراً ہی رکشہ مل گیا۔ اس طرح شارق جب ریسٹورنٹ پہنچا تو دس بج چکے تھے۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھی۔ وہ شاہد کو لے کر فوراً ہی مریم کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

مریم اور رضیہ تیار بیٹھی تھیں۔ شارق کی ہدایت کے مطابق انہوں نے صرف دو سوٹ کیس تیار کئے تھے جن میں کپڑے اور انتہائی ضرورت کی چیزیں رکھی تھیں۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ گلی میں اکا دکا لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ شارق اور شاہد دونوں سوٹ کیس اٹھا کر مکان سے نکلے اور سامنے والی گلی میں داخل ہو گئے۔ مریم نے دروازے کو تالا لگاتے ہوئے حسرت بھری نگاہوں سے مکان کی طرف دیکھا اور رضیہ کا ہاتھ تھام کر ان کے پیچھے گلی میں داخل ہو گئی۔

گلیوں ہی گلیوں میں ہوتے ہوئے انہیں لوہاری گیٹ سے کافی آگے مین روڈ پر آنے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ وہاں ایک دو ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ شارق نے ایک ٹیکسی میں سامان رکھوایا اور وہ چاروں اندر بیٹھ گئے۔ شاہد آگے بیٹھا تھا اور شارق پچھلی سیٹ پر مریم اور رضیہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شارق نے ڈرائیور کو ریلوے اسٹیشن چلنے کو کہا تھا۔

ٹیکسی جیسے ہی ریلوے اسٹیشن کے سامنے رکی کئی قلی ان کی طرف جھپٹے تھے مگر شارق نے

قلیوں کو منع کر دیا اور سامان اتروا کر ٹیکسی کو رخصت کرنے کے بعد انکوائری آفس کی طرف چلا گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ واپس آیا اس نے ایک اور ٹیکسی روکی اور سامان لاد کر اس میں سوار ہو گئے۔ اس ڈرائیور کو اس نے باغبان پورہ چلنے کو کہا تھا۔ یہ سب کچھ شارق نے احتیاط کے تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا تھا۔ جب وہ باغبانہ پورہ پہنچے تو بارہ بج رہے تھے۔

"اچھا ماں جی۔" شارق نے سامان اندر رکھوانے کے بعد کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔ ایک دو دن میں ملاقات ہو گی۔ یہ شاہد یہیں رہے گا۔ کوئی بھی ضرورت ہو' کوئی بھی بات ہو اس سے کہہ دیجئے گا۔"

"شارق ان سے رخصت ہو کر جب مزنگ پہنچا تو ایک بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ چھانگا کے تین آدمی تیار کھڑے تھے۔ ان میں جیرا بھی تھا۔ وہ شارق ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ چھانگا نے شارق کے ہاتھ میں ایک پستول تھما دیا۔

"یہ رکھ لو۔ شاید ضرورت پڑ جائے۔ میگزین بھرا ہوا ہے۔" چھانگا نے کہا۔

"مگر مجھے تو پستول چلانا نہیں آتا۔" شارق نے کہا۔

"تو یہ کونسا مشکل ہے۔ ابھی بتا دیتا ہوں۔" چھانگا نے کہتے ہوئے پستول کا میگزین نکال لیا اور اسے پستول کے استعمال اور سیفٹی کیچ وغیرہ کے بارے میں سمجھانے لگا۔ پھر میگزین فٹ کر کے پستول اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "ان سب کے پاس اپنا اپنا اسلحہ موجود ہے۔ اب تم لوگ روانہ ہو جاؤ۔"

وہ طویلے سے باہر آ گئے۔ ایک شیراڈ کار کھڑی تھی۔ جیرا اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ شارق ساتھ والی سیٹ پر اور دوسرے دونوں آدمی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کار فوراً ہی حرکت میں آ گئی۔ سڑکوں پر ٹریفک برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ جیرا کو تیز رفتاری سے کار چلانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

سمن آباد موڑ پر پہنچ کر اس نے کار گلشن راوی کی طرف موڑ دی۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے گاڑی سڑک کے کنارے پر روک لی۔ اس سے ذرا آگے گلشن راوی کی آبادی تھی۔ یہ علاقہ تقریباً دو سال پہلے آباد ہونا شروع ہوا تھا اور ابھی بیشتر علاقے میں تعمیراتی کام جاری تھا۔ متوسط طبقے کے لوگوں نے تو اپنی حیثیت کے مطابق مکان بنوا لئے تھے اور دولت مندوں نے بڑی عالیشان کوٹھیاں بنوائی تھیں۔

"یہاں ڈی ایس پی کی اپنی کوٹھی ہے۔ وہ یہیں رہتا ہے۔ اسے ٹھیک دو بجے گھر سے نکل آنا چاہئے۔" جیرے نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ابھی دو بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔

وہ سب کار سے اتر کر ایک مکان کی دیوار کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ سمن آباد موڑ سے یہاں تک سڑک کے کنارے صرف ایک کھمبے پر بلب جل رہا تھا۔ باقی تمام کھمبوں کے بلب یا تو ٹوٹ چکے تھے یا فیوز ہو چکے تھے۔

نالے کے دوسری طرف کافی دور ایک گاڑی کی ہیڈ لیمپس کی روشنی دکھائی دی۔ اس وقت وہ گاڑی ایک موڑ گھوم رہی تھی۔ موڑ پر اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں وہ گاڑی نظر آگئی وہ پولیس کی جیپ تھی۔

"شاکر... جلدی کرو۔" جیرا نے اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی سے کہا۔

شاکر دوڑ کر سڑک پر لیٹ گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی گاڑی اسے ٹکر مار کر چلی گئی ہو۔ شارق کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور ہاتھ نمایاں طور پر کانپ رہا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ ہاتھ میں پستول پکڑا تھا۔

جیپ سڑک پر رک گی۔ اس میں صرف دو آدمی تھے۔ ایک ڈرائیور اور دوسرا ڈی ایس پی۔ وہ دونوں وردی میں تھے۔ جیپ رکتے ہی ڈرائیور نیچے اتر کر سڑک پر پڑے ہوئے شاکر کی طرف بڑھا۔ وہ جیسے ہی شاکر کے قریب پہنچا' شارق اور جیرا وغیرہ پستول تانے جیپ کی طرف دوڑے۔ ان سب کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ ٹھیک اسی لمحے سڑک پر پڑا ہوا شاکر بھی ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ پولیس ڈرائیور خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا۔ شاکر نے پستول کا دستہ زور سے اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ ڈرائیور چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

ڈی ایس پی نے بڑی تیزی سے جیپ سے چھلانگ لگا دی اس کے ساتھ ہی اس نے ہولسٹر میں لگے ہوئے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ مگر شارق اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر پستول کی نال اسکی کنپٹی سے لگا دی۔ اسی کے ساتھ اس کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

"حرکت کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔ ہاتھ اٹھا لو۔"

"کون ہو تم لوگ؟" ڈی ایس پی ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

شارق نے دوسرے ہاتھ سے اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔

"چلو اس کار میں بیٹھو۔" شارق غرایا۔ شاکر اور دوسرے ساتھی نے بھی ڈی ایس پی پر پستول تان لئے تھے۔ ڈرائیور بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ڈی ایس پی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا تھا۔ جیرا نے کار کے ڈیش بورڈ کے خانے سے ہتھکڑی کا جوڑا نکال کر ڈی ایس پی کے ہاتھ پشت پر کئے اور ان میں ہتھکڑی

ڈال دی اور وہ تینوں اسے دھکیلتے ہوئے کار کی طرف آ گئے۔

ان کی یہ کارروائی دو منٹ میں مکمل ہو گئی۔ تیسرا منٹ شروع ہوتے ہی کار بڑی تیزی سے حرکت میں آ گئی۔ ڈی ایس پی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔

انہیں اپنے اڈے تک پہنچنے میں چالیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ڈی ایس پی کی آنکھوں کی پٹی تہہ خانے میں پہنچنے کے بعد کھولی گئی تھی۔ تہہ خانے میں صرف چھانگا اور شارق تھے۔

"تم لوگ جو کوئی بھی ہو' قانون کی زد سے بچ نہیں سکو گے۔" ڈی ایس پی نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ چھانگا نے بھی کپڑے میں منہ چھپا لیا تھا۔

شارق نے اپنے چہرے سے ڈھاٹا اتار دیا۔

"مجھے پہچانتے ہو؟" وہ ڈی ایس پی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "اگر نہیں پہچان پائے تو آج سے گیارہ سال پیچھے چلے جاؤ۔ جب تم نے ایک بارہ سالہ بے گناہ لڑکے کو اس کے ماں باپ کے قتل کے الزام میں عمر قید کی سزا دلوائی تھی۔"

ڈی ایس پی گہری نظروں سے شارق کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے شارق کو پہچان لیا تھا۔

○

"پہچانا نہیں مجھے۔" شارق اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "تم مجھے پہچان بھی کیسے سکتے ہو۔ بات گیارہ سال پرانی ہو چکی ہے۔ اس وقت میں بچہ تھا اور تم ایک انسپکٹر.... خدمت' دیانت اور فرض کی پیشانی پر بدنما داغ۔"

"کون ہو تم؟" ڈی ایس پی بولا۔ "تم جو کوئی بھی ہو مجھے اغوا کر کے اچھا نہیں کیا' تم قانون سے کبھی نہیں بچ سکو گے۔"

"قانون تمہارے باپ کی جاگیر ہے نا جسے اب تک تم اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے رہے ہو' لیکن اب تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ تمہاری یہ وردی...."

شارق نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ وردی تمہیں شہریوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اور قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے دی گئی تھی لیکن..... تم نے اس وردی کے تقدس کو پامال کیا۔ قانون نے تمہیں غنڈوں' بدمعاشوں اور معاشرے کے ناپسندیدہ عناصر سے نمٹنے کے لئے کچھ اختیارات دیئے تھے لیکن غنڈوں' بدمعاشوں' ڈاکوؤں اور قاتلوں کو تو تم نے ہمیشہ تحفظ فراہم کیا۔ ان کی سرپرستی کرتے رہے اور وہ اختیارات شریف لوگوں کے خلاف استعمال کرتے رہے' ان کی پگڑیاں اچھالتے رہے' انہیں سر بازار ننگا کرتے رہے اور آج تم مجھے اسی قانون کی دھمکی دے رہے ہو۔ لیکن تمہارا قانون آج تمہیں نہیں بچا سکے گا۔"

"تم کون ہو؟" ڈی ایس پی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ شارق کو پہچان نہیں سکا تھا لیکن اس کے چہرے کے خوفناک تاثرات نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔

"گیارہ سال پہلے کی وہ رات یاد کرو جب باد و باراں کا طوفان قیامت بن کر اس شہر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ باد و باراں کے اس طوفان میں ایک اور طوفان بھی آیا تھا جس نے ایک ہنستا بستا گھر اجاڑ دیا تھا۔ لوہاری دروزے کے اندر کوچہ لالہ ہرنام داس میں رہنے والے ایک پھل فروش اور اس کی بیوی کو نقاب پوشوں نے ان کے گھر میں گھس کر خنجروں کے پے در پے وار کر کے بیدری سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ان کا کمسن بیٹا یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے ماں باپ کو بچانے کی کوشش کی تو قاتلوں نے اسے بھی قتل کر دینا چاہا مگر اس نے چھپ کر اپنی

جان بچا لی۔ وہ کمسن اور معصوم بچہ ان قاتلوں سے تو بچ گیا مگر تم جیسے راشی اور ایمان فروش پولیس آفیسر نے اس کی زندگی برباد کر دی۔ اس کے خلاف جھوٹے گواہ پیش کر کے اسے قاتل ثابت کر دیا۔ اپنے ماں باپ کا قاتل..... اور اسے عمر قید کی سزا دلوا کر جیل بھجوا دیا۔ وہی بچہ آج تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ گیارہ سال پہلے وہ بچہ خاموش تھا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی' ہونٹ سل گئے تھے لیکن آج اسے زبان بھی مل گئی ہے اور ہاتھوں میں اتنی طاقت بھی کہ اپنے ماں باپ کے قاتلوں کی گردن مروڑ سکے۔" شارق خاموش ہو گیا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"تت..... تم تم.... شفاعت علی کے بیٹے ہو۔ وہ.... وہ جس کی بھائی گیٹ پر پھلوں کی دکان تھی؟" ڈی ایس پی بولا۔ اس کا چہرہ ایک دم سیاہ پڑ گیا تھا۔

"شکر ہے تم نے پہچان تو لیا۔" شارق بولا۔

"مم..... میں بے گناہ ہوں۔" ڈی ایس پی بولا۔ "اس وقت شہادتیں تمہارے خلاف تھیں۔ خون آلود خنجر تمہارے ہاتھ میں تھا۔ تم نے عدالت میں بھی اپنی صفائی میں زبان نہیں کھولی تھی۔ جس سزا کا فیصلہ عدالت نے سنایا تھا۔ میں نے نہیں...."

"لیکن میرے خلاف سارے گواہ تو تم نے عدالت میں پیش کئے تھے۔ وہ لوگ بھی تمہاری طرح ایمان فروش تھے۔ وہ بھی بک گئے تھے جیسے تم بک چکے تھے۔ مجھے اس وقت بھی معلوم تھا اب بھی جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ تم نے سلمان ایڈووکیٹ کے کہنے پر کیا تھا۔ آج تم میرے ہاتھوں میں پڑے ہو۔ کل سلمان ایڈووکیٹ بھی اسی طرح میرے قدموں میں پڑا ہو گا۔ میں اپنے ماں باپ کے قاتلوں اور اپنے دشمنوں کو چن چن کر ختم کر دوں گا۔ کوئی میرے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔"

"تت..... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" ڈی ایس پی ہکلایا۔ "میں تمہارے ماں باپ کا قاتل نہیں ہوں۔"

"لیکن تم انہیں گرفتار تو کر سکتے تھے۔" شارق غرایا۔ "مگر تم انہیں کیسے پکڑتے۔ تم تو چند روپوں کے عوض اپنا ایمان بیچ چکے تھے۔ اپنے آپ کو بیچ چکے تھے۔ آج تمہارے پاس پہلے سے زیادہ اختیارات ہیں لیکن تمہاری یہ وردی اور تمہارے کندھوں پر چمکتے ہوئے یہ اسٹار تمہیں میرے انتقام سے نہیں بچا سکیں گے۔ میں تمہیں اس طرح سسکا سسکا کر ماروں گا کہ تمہیں موت بھی نہیں آئے گی۔"

"مم..... میں بے گناہ ہوں۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہارے نقصان کی تلافی کر دوں گا۔ جتنی دولت چاہو مجھ سے لے لو۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دوں گا کہ سلمان

ایڈووکیٹ کہاں ہے۔ اس نے تمہارے ماں باپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ اس مکان قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ میں لالچ میں آ گیا تھا.... مجھے معاف کر دو۔"

"حیرت ہے۔" شارق نے کہا۔ "پولیس کا اتنا بڑا اور بااختیار آفیسر ایک معمولی سے شخص معافی مانگ رہا ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "اگر تم میرے ماں باپ کو واپس دو.... میری زندگی کے گیارہ سال لوٹا دو تو میں تمہیں معاف کر سکتا ہوں۔"

"یہ.... یہ ممکن نہیں ہے۔" ڈی ایس پی بولا۔

"تو پھر تیار ہو جاؤ۔" شارق کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ "تم نے مکافات عمل کے بارے تو ضرور سنا ہو گا۔ آج مکافات عمل کا وقت آن پہنچا ہے۔ تم زندگی بھر بے گناہ اور معصوم لوگ کو ظلم کا نشانہ بناتے رہے' ان پر تشدد کرتے رہے' ان کے گھروں کو اجاڑتے رہے۔ آج تمہار باری ہے بتاؤ سلمان کہاں ہے؟ وہ کہاں روپوش ہے؟" شارق نے خاموش ہوتے ہی پیر کی ایک بھوپور ٹھوکر اس کی پسلیوں پر مار دی۔

ڈی ایس پی کراہتا ہوا دائیں طرف لڑھک گیا۔ شارق نے اسے ایک اور ٹھوکر رسید کر یہ ٹھوکر پہلے سے زیادہ زور دار تھی۔ ڈی ایس پی بلبلا اٹھا۔

"تم جتنا چاہو چیخ لو۔ تمہاری آواز اس تہہ خانے سے باہر نہیں جائے گی۔ کوئی تمہاری مد یہاں نہیں آئے گا۔" شارق غرایا۔

وہ ڈی ایس پی پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کرتا رہا اس دوران چھانگا خاموشی سے ایک طرف کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس نے ابھی تک ان دونوں کے معاملے میں مداخلت کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

"یہ پیٹیاں دیکھ رہے ہو؟" شارق نے اسلحہ کی پیٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "ان پیٹیوں اسلحہ بھرا ہوا ہے اور ان الماریوں میں ہیروئن کے پیکٹ سجے ہوئے ہیں۔ مجھے یہاں تک پہنچ والے تم اور تم جیسے لوگ ہیں۔ اب میں وہی بن گیا ہوں جو تم لوگ مجھے بنانا چاہتے تھے۔"

شارق نے ایک بار پھر اس پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ ڈی ایس پی ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ شارق کا ہر گھونسہ اور ہر ٹھوکر اسے بلبلانے پر مجبور دیتے۔

"شارق باؤ۔" چھانگا نے پہلی مرتبہ مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "آج کے لئے اتنا کافی موٹا تازہ آدمی ہے قبر تک جانے میں کئی دن لگیں گے اسے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو چھانگا۔" شارق نے کہا۔ "اسے اس ستون کے ساتھ باندھ دیں۔ اس

ی اسی تہہ خانے میں پوری ہو گی۔"

ان دونوں نے اسے ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ شارق نے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ وہ ان کی موجودگی میں کسی طرح رسی کی بندشیں نہ کھول سکے۔"

"سلمان ایڈووکیٹ کہاں روپوش ہے۔ مجھے اس کا پتہ بتاؤ۔" شارق ایک بار پھر اس کے نے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ..... وہ فیصل آباد میں ہے۔" ڈی ایس پی نے جواب دیا۔

"مجھے اس کا پتہ بتاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تم اسکا پتہ جانتے ہو گے۔ کیونکہ اس قسم کے آدمی یسے لوگوں کے لئے آمدنی کا مستقل ذریعہ ہوتے ہیں۔ تم یقیناً اسے بھی بلیک میل کرتے رہے در تمہیں اس کا پتہ معلوم ہو گا۔"

"وہ پیپلز کالونی میں رہتا ہے۔ رحمانیہ مسجد کے قریب' مجھے اس کے مکان کا نمبر معلوم نہیں ۔ وہ اس کے سالے کا مکان ہے۔ وہ خود بہت کم گھر سے باہر نکلتا ہے۔ اس علاقے کے لوگ نہیں جانتے۔"

"اس کے سالے کا نام کیا ہے' وہ کیا کرتا ہے؟" شارق نے پوچھا۔

"اس کی صابن سازی کی فیکٹری ہے اس کا نام غلام نبی ہے۔ رحمانیہ مسجد کے آس پاس کسی بھی پوچھو گے تو تمہیں اس کے گھر کا پتہ چل جائے گا۔" اس نے جواب دیا۔

"بڑی معلومات رکھی ہیں تم نے اپنے شکار کے بارے میں۔" شارق نے مسکراتے ہوئے ۔ "وہ بھی جلد ہی یہاں تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔"

شارق نے چھانگے کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں تہہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ کچھ ہی بعد وہ مزار کے گنبد سے نکل کر ایک کمرے میں آ گئے۔

"اب سو جاؤ شارق باؤ۔ صبح دیکھنا شہر میں کیا ہنگامہ مچتا ہے۔" چھانگا نے کہا۔

شارق کوئی جواب دیئے بغیر فرش پر بچھی ہوئی دری پر لیٹ گیا۔ اس نے ایک تکیہ کھینچ کر سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ چھانگا کسی دوسرے کمرے میں چلا گیا اور شارق تنہا دری پر لیٹا ت حال کے بارے میں سوچنے لگا۔ جیل سے نکلنے کے بعد شیرا پہلوان نے اور پولیس نے جرائم کی دنیا کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی تھی۔ گو وہ ان طاغوتی قوتوں کے سامنے بھرپور ت کرتا رہا تھا مگر اپنے آپ کو نہیں بچا سکا تھا اور آج وہ جرائم کی دنیا میں پہلا قدم رکھ چکا اسے اس حقیقت کا بھی احساس تھا کہ اگر وہ چاہے بھی تو واپس نہیں پلٹ سکتا تھا۔ واپسی کے راستے بند ہو چکے تھے۔ چھانگا نے محض ہمدردی کی بنا پر اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ وہ اچھی

طرح جانتا تھا کہ چھانگا اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ چھانگا جیسے لوگ بلاوجہ کسی کی مدد نہیں کیا کرتے۔ وہ اگر واپس بھی جانا چاہے گا تو چھانگا دیوار بن کر اس کا راستہ روک لے گا۔

باہر گمبھیر سناٹا تھا اور اس سناٹے میں کبھی کبھار کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دے جاتی۔ شارق پہلے ایک دو مرتبہ تو اس آواز پر چونکا تھا لیکن پھر وہ ان آوازوں کا عادی ہو گیا۔

چھانگا کا اصل کام تو وہی تھا جس میں اب شارق بھی شریک ہو گیا تھا لیکن یہ اڈہ تانگوں کا طویلہ تھا۔ اس احاطے میں کم و بیش تیس پینتیس تانگے تھے جو سب کے سب چھانگا کی ملکیت تھے۔ کوچوان یہاں سے تانگے کرائے پر حاصل کر کے دن بھر شہر میں چلاتے۔ ان کوچوانوں سے بیشتر چھانگے کے ایجنٹ تھے جو کوچوانی کے ساتھ ہیروئن بھی فروخت کرتے۔

صبح ساڑھے چار بجے طویلے میں کوچوانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ تھوڑی تھوڑی بعد کوئی کوچوان آتا اور اپنا تانگہ تیار کر کے لے جاتا۔ شارق دری پر لیٹا یہ آوازیں سنتا رہا اور اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

شارق کی آنکھ کھلی تو صبح کے دس بج چکے تھے۔ اس نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس مختصر سے کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر تک دری پر لیٹا چھت کو گھورتا رہا پھر اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ کچھ ہی فاصلہ پر ایک کشادہ چبوترہ تھا جس پر چٹائیوں کا سائبان سا بنا ہوا تھا۔ بارہ فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ یہ دراصل ایک قبر کا چبوترہ تھا۔ کسی زمانے میں اس چبوترے کے وسط میں ایک قبر ہوا کرتی تھی لیکن اب قبر کا نام و نشان مٹ چکا تھا اور یہ چبوترہ بارہ دری کا کام دیتا تھا۔ اکثر کوچوان اور چھانگا کے آدمی یہاں بیٹھے گپ شپ کرتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی تین چار آدمی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں دو تو کوچوان تھے اور دو چھانگا کے آدمی۔ جن میں ایک جیرا بھی تھا۔ وہ چاروں تاش کھیل رہے تھے۔ شارق کو دیکھ کر جیرا نے ذرا بلند آواز سے آواز لگائی۔

"آؤ شارق باؤ.... بڑا سوئے تم۔"

"ہاں، رات کو دیر تک نیند نہیں آئی تھی۔" شارق نے کہا۔ "پانی کہاں ہے۔ مجھے منہ ہاتھ دھونا ہے۔"

"مزار کے پچھلی طرف نلکا ہے اسی طرف چلے جاؤ۔" جیرا نے اشارہ کیا۔

شارق مزار کے دوسری طرف چلا گیا جہاں ایک چھوٹا سا حوض بنا ہوا تھا۔ حوض کے کنارے ہینڈ پمپ بھی لگا ہوا تھا۔ ایک آدمی حوض پر ایک گھوڑی کو نہلا رہا تھا۔ شارق پمپ کے قریب حوض کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

"میں پمپ چلاتا ہوں شارق باؤ، تم آرام سے منہ ہاتھ دھو لو۔" وہ آدمی گھوڑے کو چھوڑ کر شارق کے قریب آ گیا اور ہینڈ پمپ چلانے لگا۔

شارق نے ایک نظر اس آدمی کی طرف دیکھا اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ گھوڑے کی طرف آ گیا جہاں جیرا وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔

"ناشتہ کیا کرو گے شارق باؤ؟ مزنگ کے پائے بڑے مشہور ہیں نان اور پائے۔ مزہ آ جاتا ہے۔ ویسے اگر تم چاہو تو لسی، قلچہ، ڈبل روٹی، مکھن انڈا جو چاہو منگوایا جا سکتا ہے۔" جیرا نے کہا۔

"مکھن ڈبل روٹی اور چائے منگوا لو۔" شارق نے کہا۔ "چھانگا کہاں ہے؟"

"وہ باغبانپورے گیا ہے۔ نکے پہلوان نے آدمی بھیجا تھا اسے بلانے کے لئے۔" جیرا نے جواب دیا اور جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر ایک آدمی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "جا اوئے! شارق باؤ کے لئے ناشتہ لے کر آ.... چائے فل سیٹ لے کر آنا ہم بھی پی لیں گے۔ بیٹھ جاؤ شارق باؤ۔" آخر میں اس نے شارق کو اشارہ کیا۔

شارق وہیں دری پر بیٹھ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ آدمی ناشتہ لے کر آ گیا۔ شارق نے وہیں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ ان کے چاروں طرف گھوڑوں کی لید اور بو پھیلی ہوئی تھی۔ مگر شارق اطمینان سے ناشتہ کرتا رہا۔

"یہ نکا پہلوان کون ہے، اس کا نام چھوٹا پہلوان تو نہیں؟" شارق نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"چھوٹا پہلوان تو بڑا لیچڑ آدمی ہے۔" جیرا نے کہا "نکا پہلوان بڑا جی دار آدمی ہے، یاروں کا یار ہے۔ یہاں آتا رہتا ہے۔ تم اس سے مل کر خوش ہو گے۔ چھانگے سے بڑی دوستی ہے اس کی۔ اس کی جی داری کا اندازہ تم اس بات سے لگا لو کہ کئی مرتبہ پولیس مقابلے ہوئے ہیں لیکن وہ تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا۔"

"اور ہاں...." شارق جیسے اچانک کچھ یاد آنے پر بولا۔ "تمہارے مہمان کا کیا حال ہے؟"

"پڑا ہو گا کہیں کونے میں۔" جیرا نے کہتے ہوئے اسے آنکھ سے اشارہ کیا۔ شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دوسروں کے سامنے ڈی ایس پی کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ویسے شارق باؤ۔ آج شہر میں بڑی گرما گرمی ہے۔ بڑی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔" جیرا نے کہا۔

"کیوں؟ کوئی خاص بات؟" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا حالانکہ وہ جیرا کا

مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

"سنا ہے رات کو کسی ڈی ایس پی کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ پولیس اس ڈی ایس پی کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ کئی آدمیوں کو پکڑ کر بند کر دیا گیا ہے۔" شارق نے پوچھا۔

"یہاں تو چھاپے کا خطرہ نہیں ہے؟" شارق نے پوچھا۔

"خطرہ تو ہے شارق باؤ لیکن یہاں پولیس کو کیا ملے گا۔" جیرا نے جواب دیا۔ "ویسے بڑی ضروری چیز ہے۔ چھانگا نے سارے آدمیوں کو ادھر ادھر کر دیا ہے۔ میں بھی تمہارے انتظار کر رہا تھا۔ میں گوجرانوالہ جا رہا ہوں۔ تم بھی ایک دو دن ادھر ادھر ہو جاؤ اور یہ اپنے رکھ لو۔ چھانگا دے گیا تھا۔" اس نے دو ہزار روپے کے نوٹ شارق کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

"اور اس کا کیا ہو گا؟" شارق نے جیرا کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔

"وہ دو دن بھوکا رہے گا تو مر نہیں جائے گا۔ تم اس کی فکر مت کرو۔" جیرا نے کہا۔

کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد شارق طویلے سے نکل رہا تھا۔ گلی میں موٹروں کے تمام ورکشاپ ہوئے تھے۔ لوگ معمول کے مطابق اپنے کام دھندوں میں مصروف تھے۔ شارق گلی سے چوک پر آ گیا۔ ایک تانگے پر چار سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں اور تانگے والا اسٹیشن اسٹیشن آوازیں لگا رہا تھا۔ شارق اگلی سیٹ پر دو آدمیوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شارق نے مڑ کر دیکھا وہ جیرا تھا۔

جیرا راستے ہی میں کسی جگہ اتر گیا شارق اسٹیشن تک تانگے میں بیٹھا رہا۔ اسٹیشن سے اتر کر وہ سیڑھیوں والا پل عبور کر کے ریلوے اسٹیشن کے پچھلی طرف جی ٹی روڈ پر آ باغبانپورہ کی طرف جانے والے تانگوں کی لین لگی ہوئی تھی۔ وہ سب سے آگے والے تا بیٹھ گیا اور کچھ ہی دیر بعد چھ سواریاں پوری ہو جانے پر تانگہ حرکت میں آ گیا۔

شارق سنگھ پورہ کے موڑ پر اتر گیا۔ یہاں سے ایک سڑک سنگھ پورہ کی طرف چلی اور دوسری مغلپورہ ریلوے ورکشاپ کی طرف۔ اس سڑک کے موڑ پر ایک چھوٹا سا مزار پر ہرے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ دھوپ تیز تھی کچھ لوگ اس مزار کے قریب ٹاہلی درخت کے سائے میں کھڑے تھے۔ شارق سڑک پار کر کے کچھ دیر اس درخت کے نیچے اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کسی نے اس کا تعاقب نہیں کیا تو وہ مغلپورہ ریلوے ورکشاپ طرف جانے والی سڑک پر چل پڑا۔ اس سڑک کے دائیں طرف ایک چھوٹا سا میدان ملحق روئی پلانٹ اور اس سے آگے گندے پانی کا وسیع و عریض جوہڑ تھا۔ اور بائیں طرف عریض کوٹھیاں تھیں۔ شارق انہی کوٹھیوں کے درمیان ایک گلی میں گھس گیا۔ اور پھر

ہوئی گلیوں سے ہوتا ہوا ٹیلی فون ایکس چینج کے پیچھے کسی گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی کے تیسرے مکان کے سامنے رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

دروازہ شاہد نے کھولا تھا وہ شارق کو دیکھتے ہی دروازے سے ہٹ گیا۔

"کون ہے شاہد بیٹا؟" اندر سے مریم کی آواز سنائی دی۔

"شارق بھائی آئے ہیں ماں جی۔" شاہد نے جواب دیا۔

شارق ابھی نصف صحن میں تھا کہ مریم کمرے سے نکل آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر شارق کو گلے سے لگا لیا اور پھر اس کی پیشانی پر بوسے دینے لگی۔

"ماں جی! شارق مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ تو یوں چوم رہی ہیں جیسے میں بہت عرصہ بعد پردیس سے آیا ہوں۔"

"تم جتنی دیر میری آنکھوں سے اوجھل رہتے ہو جان سولی پر ٹنگی رہتی ہے بیٹا۔" مریم نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

"اب میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ماں جی۔" شارق نے جواب دیا۔ "اب شارق نہ تو اتنا بزدل ہے اور نہ ہی کمزور کہ جس کا دل چاہے آ کر ٹھوکریں مارنا شروع کر دے۔"

"ان چند روز میں کوئی خاص بات ہو گئی ہے بیٹا؟" مریم نے پوچھا۔

"ماں جی' یہاں ہمیشہ کمزوروں اور بے بسوں کو دبایا جاتا ہے۔" شارق نے جواب دیا۔ "طاقتور کو لوگ جھک جھک کر سلام کرتے ہیں یا یوں کہئے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ ہے۔ اب میرے ہاتھ میں بھی ایک لاٹھی آ گئی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ "رضیہ کہاں ہے؟ اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی؟"

"پڑوسیوں کی لڑکی سے اس کی دوستی ہو گئی ہے۔" مریم نے بتایا۔ "رضیہ کی ہم عمر ہے۔ وہ صبح ملنے کے لئے آئی تھی۔ رضیہ کے ساتھ بازار گئی ہے کچھ چیزیں لینے کے لئے' بس آنے ہی والی ہو گی۔"

"میں نے رات کو جو باتیں آپ کو سمجھائی تھیں وہ آپ نے رضیہ کو بھی سمجھا دی ہیں نا؟" شارق نے کہا۔

"ہاں بیٹا میں نے رضیہ کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ وہ سمجھ دار لڑکی ہے یہاں کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرے گی۔" مریم نے جواب دیا۔

وہ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ شاہد چائے لے کر آ گیا۔ اس نے ایک ایک کپ دونوں کے سامنے رکھ دیا اور قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"تم یہاں بور تو نہیں ہو رہے؟" شارق نے پوچھا۔

"نہیں شارق بھائی۔" شاہد نے جواب دیا۔ "یہاں مامی جی کے پاس کون رہ کر بور ہو سکتا ہے اور پھر رضیہ بہن ہیں۔ آپ تو دنیا کے سب سے خوش قسمت انسان ہیں۔ ایسے پیار کرنے والی ماں اور ایسی جان چھڑکنے والی بہن۔ میں کل رات سے ان کی باتیں سن رہا ہوں۔ دونوں کی زبان پر آپ ہی کا ذکر رہتا ہے۔"

"ہاں شاہد۔" شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ایسی پیار کرنے والی ہستیاں خوش قسمت لوگوں ہی کو ملتی ہیں۔"

"سچ کہتے ہو شارق بھائی۔" شاہد گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

شاہد فیصل آباد کا رہنے والا تھا۔ وہ میٹرک پاس تھا۔ وہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ چند سال پہلے اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ باپ نے تو دوسری شادی کر لی۔ اس عورت کا اپنا بھی ایک بیٹا تھا۔ اس نے شاہد کے ساتھ روایتی سوتیلی ماں کا سلوک شروع کر دیا۔ باپ جو شاہد پر جان چھڑکتا تھا وہ بھی اس سے لاپرواہ ہو گیا۔ شاہد نے سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی کی مار پیٹ سے تنگ آ کر بالآخر ایک روز گھر چھوڑ دیا۔ وہ ایک سال تک ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھاتا رہا پھر سہیل کے ہوٹل میں ملازم ہو گیا۔ سہیل کا رویہ عام لوگوں سے مختلف تھا۔ وہ یہاں آ گیا اور اپنی شرافت اور ایمانداری کی وجہ سے اس نے جلد ہی سہیل کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اس کی وجہ سے سہیل کو بھی کچھ سہولت مل گی تھی۔ کئی مرتبہ کام کے سلسلے میں سہیل کو دو تین روز کے لئے شہر سے باہر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ایسے موقعوں پر شاہد ہی ہوٹل کا سارا کام سنبھالتا تھا اور اس نے کبھی ایک پیسے کی بے ایمانی نہیں کی تھی۔ اس کی شرافت اور ایمانداری کی وجہ سے ہی سہیل نے اسے یہاں بھیج دیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد رضیہ آ گئی۔ شارق کو دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کے ساتھ پڑوسیوں کی لڑکی صائمہ بھی تھی۔ وہ دونوں سامان سے لدی پھندی تھیں۔ باہر تیز دھوپ کی وجہ سے ان دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

"آپ یہاں پنکھے کے نیچے بیٹھ جائیں رضیہ باجی۔ اور آپ بھی صائمہ باجی۔ میں شربت بنا کر لاتا ہوں۔" شاہد کہتے ہوئے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

صائمہ، رضیہ کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ کن انکھیوں سے بار بار شارق کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ عمر میں رضیہ سے سال بھر چھوٹی ہو گی۔ دبلی پتلی اور بے حد حسین لڑکی تھی۔

"یہ کیا کچھ لے کر آئی ہو تم؟" شارق نے رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت سی چیزوں کی ضرورت تھی۔ میں نے سوچا تھوڑی بہت تو لے ہی آؤں۔" رضیہ نے جواب دیا اور پھر پیکٹ کھول کر چیزیں دکھانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد صائمہ اپنے گھر چلی گئی۔ دو بجے کے لگ بھگ انہوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد شارق ایک کمرے میں آ گیا۔ رضیہ بھی اس کے ساتھ تھی۔

"یہ آپ کا کمرہ ہے بھائی جان۔" رضیہ نے کہا۔ "ابھی اس گھر میں ضرورت کی بہت سی چیزیں باقی ہیں۔ آہستہ آہستہ آتی رہیں گی۔"

"گھر بنتے بنتے ہی بنتا ہے۔" شارق نے جواب دیا اور دھڑام سے بستر پر لیٹ گیا۔ "تمہارے کالج کب سے شروع ہو رہے ہیں؟" اس نے رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اسی مہینے۔" رضیہ نے جواب دیا۔ "ایک دو دن بعد یونیورسٹی جاؤں گی تو پتہ چلے گا۔"

وہ دونوں کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شارق پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ رضیہ اسے چھوڑ کر کمرے سے چلی گئی۔ اس نے دروازہ بھی بھیڑ دیا تھا۔

شارق شام تک سوتا رہا۔ شام کی چائے کے دوران مریم نے اس کے کام کے سلسلے میں بات چھیڑ دی۔ اس کا خیال تھا کہ شارق بھائی چوک والی دکان چھوڑ دے اور باغبانپورہ ہی میں کوئی دکان لے کر کام شروع کر دے۔

"نہیں ماں جی۔" شارق نے جواب دیا۔ "میں نے ایک پرانے دوست کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے اب اکثر گھر سے باہر رہنا پڑے گا۔"

"تمہاری مرضی بیٹا۔" مریم نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

رات کو کھانے کے بعد بھی وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دوسرے دن صبح نو بجے کے قریب شارق ناشتہ کر کے گھر سے رخصت ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ سہیل کے پاس رکا اور پھر وہاں سے سیدھا ڈی آئی جی پولیس کے دفتر پہنچ گیا۔ ڈی آئی جی سے ملاقات کے لئے اسے صرف پانچ منٹ کا وقت دیا گیا تھا لیکن تقریباً ایک گھنٹے تک ان میں گفتگو ہوتی رہی۔

"جب تک کارروائی مکمل نہیں ہو جاتی میں اس وقت تک اپنے آپ کو پولیس کی تحویل میں دینے کو تیار ہوں لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ کارروائی شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد شروع کی جائے اور اس وقت تک سب کو اس کارروائی کے بارے میں لاعلم رکھا جائے۔" شارق نے کہا۔

"عین ممکن ہے آپ کے ڈی ایس پی کو بھی اسی پارٹی نے اغوا کیا ہو۔"

"ٹھیک ہے مسٹر شارق۔" ڈی آئی جی نے کہا۔ "مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ میں آپ کو پولیس کی تحویل میں دینا ضروری نہیں سمجھتا۔ آپ شام چھ بجے یہاں آ جایئے۔ آپ چونکہ وہ پتہ نہیں

سمجھا سکتے اس لئے رہنمائی کے لئے آپ کو چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ جانا ہو گا۔ ویسے اس وقت تک آپ ایک اور کام بھی کر سکتے ہیں۔"

"وہ کیا سر؟" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"خیر ٹھیک ہے۔" ڈی آئی جی نے کہا۔ "آپ جایئے اور شام کو ٹھیک چھ بجے یہاں پہ جایئے۔"

"یس سر۔" شارق نے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور اس کے دفتر سے باہر آ گیا۔

ڈی آئی جی کے دفتر سے نکل کر شارق سیدھا سہیل کے ریسٹورنٹ پہنچا اور دن کا باقی حصہ اس نے ریسٹورنٹ کے اوپر والے کمرے ہی میں گزارا تھا۔ اس نے سہیل کو بھی نہیں بتایا کہ کہاں گیا تھا اور اب تک کس کام میں مصروف رہا تھا۔

شام کو ٹھیک چھ بجے وہ ڈی آئی جی کے دفتر پہنچ گیا۔ اس مرتبہ ڈی آئی جی نے اسے فوراً بلا لیا۔ شارق جب کمرے میں داخل ہوا تو اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ ڈی آئی جی کے کمرے میں ایک ایس پی اور دو ڈی ایس پی بھی موجود تھے۔ وہ لوگ ایک بار پھر اس سے طرح طرح کے سوال کرتے رہے۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ بنگلہ منشیات فروشی کا اڈہ ہے؟" ایک ڈی ایس پی نے پوچھا۔ ا کا تعلق اسی علاقے سے تھا جس علاقے میں وہ بنگلہ واقع تھا۔

"جس طرح وہاں کاروبار ہو رہا ہے اس حساب سے تو سب کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ بنگ منشیات کا بہت بڑا اڈہ ہے۔" شارق نے جواب دیا۔ "ایسے غیر قانونی کام اس علاقے کی پولیس نگاہوں سے چھپے نہیں رہ سکتے اور جب کام اتنے بڑے پیمانے پر ہو رہا ہو تو اس کے خفیہ رہنے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اس علاقے کا ایک عام آدمی تو جانتا ہو اس جگہ کیا ہو رہا ہے مگر پولیس بے خبر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر اس قسم غیر قانونی کام پولیس کی سرپرستی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتے۔"

"تم پولیس پر الزام لگا رہے ہو؟" ڈی ایس پی نے اسے گھورا۔

"میں الزام نہیں لگا رہا..... یہ حقیقت ہے۔" شارق نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "کاش! آپ لوگ اس حقیقت کو سمجھ سکیں۔"

"اگر یہ غلط ثابت ہوا تو اس کا نتیجہ جانتے ہو؟" ڈی ایس پی نے کہا۔

"میں نتائج سے بے نیاز ہو کر یہاں آیا ہوں۔" شارق نے جواب دیا۔ "اگر مجھے کوئی خو ہوتا تو اس طرح یہاں نہ آتا۔"

"ٹھیک ہے' دیکھ لیں گے۔" ڈی ایس پی نے جواب دیا۔

اگر شارق اپنی شکایت لے کر اس ڈی ایس پی کے پاس جاتا تو شاید اسی کو پکڑ کر بند کر دیا جاتا مگر وہ اس وقت ڈی آئی جی کے سامنے بیٹھا تھا۔ جو پورے ضلع کے امن و امان' لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اور تھانوں کی کارکردگی کا ذمے دار تھا۔

وہ تمام پولیس آفیسر کچھ دیر تک صلاح مشورہ کرتے رہے پھر آدھے گھنٹے کے اندر اندر ایک چھاپہ مار پولیس پارٹی ترتیب دی گئی۔ اس چھاپہ مار پارٹی میں تیس پولیس والے شامل تھے اور سب کے سب دوسرے تھانوں سے منگوائے گئے تھے۔ دو سب انسپکٹرز اور ایک انسپکٹر کا تعلق بھی مختلف علاقوں سے تھا۔ انسپکٹر کو اس چھاپہ مار پارٹی کا انچارج بنایا گیا تھا اور اس ڈی ایس پی کو کارروائی کا نگران۔ شارق بھی پولیس پارٹی کی رہنمائی کے لئے ڈی ایس پی کی جیپ میں سوار تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے دو ٹرکوں اور ایک جیپ پر سوار پولیس پارٹی نے شیرا پہلوان کی کوٹھی کو گھیرے میں لے لیا۔ شیرا پہلوان کا بزنس اس وقت عروج پر تھا۔ اس چھاپے کے بارے میں اگرچہ مقامی پولیس اسٹیشن کو بھی ہوا نہیں لگنے دی گئی تھی لیکن پولیس جیسے ہی اس علاقے میں داخل ہوئی شیرا پہلوان کو اس کی اطلاع مل گئی اور پولیس کے گھیرا ڈالتے ہی شیرا پہلوان کے آدمیوں نے مزاحمتی کارروائی شروع کر دی۔

شارق اس کوٹھی سے دور ڈی ایس پی کی جیپ میں بیٹھا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوتی رہی۔ ایک کانسٹیبل زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے کندھے پر گولی لگی تھی۔ بالآخر پولیس اس کوٹھی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ شیرا پہلوان اور اس کے دو آدمی ساتھ والی کوٹھی میں کود کر فرار ہو گئے تھے جبکہ پانچ آدمیوں کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ ان میں دو شیرا پہلوان کے آدمی تھی جن میں سے ایک زخمی ہوا تھا۔ دو گاہک تھے اور ایک اس علاقے کا سب انسپکٹر جو سادہ لباس میں تھا۔

"اب تو میرا خیال ہے کہ آپ کو میری اس بات کا یقین آ گیا ہو گا کہ اس قسم کے غیر قانونی کام پولیس کی سرپرستی کے بغیر نہیں ہو سکتے۔" شارق نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈی ایس پی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ بنگلے کی تلاشی کے دوران تقریباً ڈھائی من ہیروئن اور بڑی مقدار میں اسلحہ برآمد ہوا تھا۔ فائرنگ کی اطلاع پا کر مقامی پولیس کی ایک موبائل اس وقت وہاں پہنچی تھی جب یہ چھاپہ مار پارٹی وہاں سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔ موبائل میں اس تھانے کا انچارج انسپکٹر بھی تھا۔

"کیا ہوا سر؟ یہ..... یہ سب کیا ہوا..." انسپکٹر نے ڈی ایس پی کو سلیوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں' تم جاؤ آرام کرو۔" ڈی ایس پی نے جواب دیا۔

ملزمان اور ضبط شدہ اسلحہ اور ہیروئن لے کر یہ پولیس پارٹی دوبارہ ڈی آئی جی آفس پہنچ گئی۔ سادہ لباس سب انسپکٹر کو معطل کر کے گرفتار کر لیا گیا اور تھانے کے انچارج انسپکٹر کو بھی فوری طور پر معطل کر کے لائن حاضر کر دیا گیا۔

شارق جب ڈی آئی جی آفس سے رخصت ہوا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ سہیل ہی کے پاس آیا تھا اور پھر اس رات ریسٹورنٹ بند کرنے کے بعد سہیل جب اوپر والے کمرے میں آیا تو شارق نے بتایا کہ آج اس نے کیا کیا تھا۔

"تم اپنا راستہ دشوار سے دشوار تر کر رہے ہو۔" سہیل نے کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ شیرا پہلوان کو یہ پتہ نہیں چلے گا کہ اس کارروائی میں کس کا ہاتھ تھا؟ یہی ڈی ایس پی خود اسے بتائے گا کہ اس کے خلاف یہ کارروائی کس کے اشارے پر کی گئی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" شارق نے کہا۔ "اگر میں یہ شکایت اس ڈی ایس پی کے پاس لے جاتا تو شاید وہ شیرا پہلوان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے بجائے مجھے ہی بند کر دیتا۔"

"شیرا پہلوان جیسے لوگ اتنے بے بس نہیں ہوتے جتنا تم سمجھتے ہو۔" سہیل نے کہا۔ "ڈھائی من ہیروئن اور چند رائفلوں کی ضبطی سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہ نقصان تو وہ ایک دن میں پورا کر لے گا۔ اور یہ بات بھی نوٹ کر لو کہ پولیس اس کے خلاف بار بار کارروائی نہیں کرے گی۔ شیرا پہلوان جیسے لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ ان کی پہنچ بہت اوپر تک ہوتی ہے۔ یہ چھوٹا موٹا نقصان ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کے خلاف اس کارروائی کے نتائج ایک دو دن میں تمہارے سامنے آ جائیں گے۔"

"میں جانتا ہوں۔" شارق نے کہا۔ "نتائج خواہ کچھ بھی نکلیں میں نے شیرا پہلوان کے خلاف محاذ کھول دیا ہے اور میرا یہ محاذ صرف شیرا پہلوان کے خلاف نہیں ہر اس شخص کے خلاف ہے جو اس غیر قانونی کاروبار میں مصروف ہے۔ دولت کے یہ پجاری ہماری نوجوان نسل کو مفلوج کر رہے ہیں۔ ان کے خون میں زہر گھول رہے ہیں۔ اگر میں نے اس قسم کے کسی گروہ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا ہے تو اس کا مقصد دولت کمانا نہیں' ایسے لوگوں کا خاتمہ کرنا ہے۔ اگر پولیس ان لوگوں کے خلاف کارروائی نہیں کرے گی تو میں ان کے خلاف اپنی لڑائی جاری رکھوں گا۔"

"تم اکیلے کیا کر لو گے۔" سہیل نے کہا۔ "قدم قدم پر ایسے لوگ موجود ہیں جو....."

"میں ایسے لوگوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں گا۔" شارق نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ تم میرے ساتھ ہو۔ تمہاری طرح اور بھی بہت سے لوگ میرا ساتھ دیں گے۔"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ اس طرح برائی کا خاتمہ ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہے۔" سہیل نے گہرا سانس لیا۔

"اگر ہر شخص یہی سوچتا رہے کہ برائی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا تو برائی کا خاتمہ واقعی نہیں ہو سکے گا۔" شارق نے کہا۔ "برائی کا خاتمہ صرف سوچنے سے نہیں ہو گا۔ اس کے لئے عمل کی ضرورت ہے۔ آج میں نے عملی قدم اٹھایا ہے۔ کل کوئی اور بھی آگے آئے گا۔ یہ بدمعاش' غنڈے' اسمگلر اور ڈاکو ہم سے زیادہ طاقتور نہیں ہیں۔ ہم نے اپنے دلوں اور اپنے ذہنوں پر ان کا خوف طاری کر رکھا ہے۔ ہمیں اپنے دل و دماغ سے یہ خوف جھٹک دینا ہو گا۔ ہمیں ان انسان نما درندوں کا مقابلہ کرنا ہو گا جو ہماری بوٹیاں نوچ رہے ہیں۔"

"تم سمجھتے ہو کہ لوگ تمہارا ساتھ دیں گے؟" سہیل نے کہا۔

"اگر کوئی میرا ساتھ نہیں بھی دے گا تو میں اکیلا ہی یہ جنگ جاری رکھوں گا۔" شارق نے پرعزم لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" سہیل نے کہا۔ "تم اپنی یہ جنگ جاری رکھنا لیکن ماں جی اور رضیہ کو اس جنگ سے دور ہی رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی تمہاری اس جنگ کی لپیٹ میں آ جائیں اور اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تم کیا کر رہے ہو تو شاید....."

"انہیں پتہ نہیں چلے گا۔" شارق نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ ایک دوست کی شراکت میں کاروبار شروع کر دیا ہے اور مجھے اکثر شہر سے باہر جانا پڑے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کے ہاں کم سے کم جاؤں تاکہ میرے ذریعے کوئی ان تک نہ پہنچ پائے۔"

"یہ تم نے عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے۔" سہیل نے کہا۔

وہ مزید کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر سہیل پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ صوفے پر لیٹے لیٹے سو گیا شارق بھی کرسی سے اٹھ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ جب سے شارق یہاں آنے لگا تھا سہیل نے اس کے لئے اپنا پلنگ خالی کر دیا تھا۔ وہ خود کبھی قالین پر سو جاتا اور کبھی صوفے پر۔ شارق کچھ دیر تک صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ سہیل کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ شیرا پہلوان کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگے گی کہ اس کارروائی کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ وہ شارق کی تلاش میں زمین و آسمان ایک کر دیگا۔ مگر شارق کے دل میں اب اس کا کوئی خوف نہیں رہا تھا۔ چھانگا اس کے ساتھ تھا۔ چھانگا اس کے لئے ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کو اغوا کر سکتا ہے تو وہ شیرا

پہلوان سے ٹکرانے سے بھی نہیں ہچکچائے گا اور حقیقت یہ تھی کہ شیرا پہلوان ہی سے ٹکرا کے لئے چھانگا نے اسے اپنے ساتھ ملایا تھا۔ وہ اس کا کاروباری رقیب تھا اور اس سے کوئی حساب کتاب برابر کرنا چاہتا تھا۔

صبح کا اخبار دلچسپ خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ شیرا پہلوان کے منشیات کے اڈے پر چھاپے خبر چار کالمی سرخی سے چھپی تھی۔ اخبار نے اس خبر کے حوالے سے اداریہ بھی لکھا تھا اور ا چھاپے کو لاہور میں کسی بڑی مچھلی کے خلاف پہلی کارروائی قرار دیا تھا۔ جبکہ اس سے پہلے پولیس کی کارروائی ہمیشہ منشیات کے خوردہ فروشوں تک ہی محدود رہی تھی۔

اسی اخبار میں ڈی ایس پی کے بارے میں بھی خبر تھی جسے دو دن پہلے اسلحہ کے زور پر اغوا گیا تھا اور ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق اس ڈی ایس پی بھی کسی ایسے ہی گروہ نے اغوا کیا تھا۔ اس کی تلاش میں پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی گزشتہ رات جن مقامات پر چھاپے مارے گئے تھے ان میں مزنگ میں چھانگے کا اڈہ بھی شامل لیکن پولیس کو وہاں سے کچھ نہیں ملا تھا اور نہ ہی ڈی ایس پی کا سراغ ملا تھا۔

شارق نے وہ پورا دن بھی ہوٹل کے کمرے ہی میں گزارا تھا۔ رات دس بجے کے قریب ریسٹورنٹ سے نکلا اور رکشہ پر بیٹھ کر سیدھا چھانگا کے اڈے پر پہنچ گیا۔ چھانگا اس وقت موجود اور اس کا بزنس بھی جاری تھا۔

"آؤ شارق باؤ' کیسے ہو؟" چھانگا نے کہا۔

"ٹھیک ہوں' سناؤ تمہارا کیا حال ہے۔" شارق نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "سنا کل یہاں کچھ مہمان آئے تھے؟"

"میں تمہارا مطلب سمجھ گیا شارق باؤ۔" چھانگا نے کہا۔ "ایسے مہمان تو آتے ہی رہتے ہیں اور ہمیں ان کے آنے کی خبر پہلے ہی سے ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہم ان کے استقبال کے لئے ہم تیار ہی رہتے ہیں۔"

شارق کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہاں بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ وہ چھانگا گاہک تھا۔ چھانگا نے اسے جلد ہی چلتا کر دیا۔

"تم کچھ کہنا چاہتے تھے شارق باؤ؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے شارق کی طرف دیکھا۔

"کل رات شیرا پہلوان کے ساتھ کیسی رہی؟" شارق بولا۔

"مزہ ہی آ گیا۔" چھانگا نے کہا۔ "لیکن حیرت ہے کہ پولیس نے اس کے اڈے پر چھاپہ کیسے مار دیا۔ وہ تو ڈی ایس پی کو پانچ لاکھ روپے مہینہ دیتا ہے۔"

"وہ چھاپہ اس علاقے کی پولیس نے نہیں مارا تھا۔ اس کارروائی کے لئے ایک خصوصی چھاپہ مار ٹیم تشکیل دی گئی تھی اور اس ٹیم میں اس علاقے کا ایک بھی پولیس والا شامل نہیں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس علاقے کی پولیس کو تو پتہ ہی اس وقت چلا تھا جب چھاپا مار ٹیم واپس جا رہی تھی۔" شارق نے کہا۔

"تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتہ چلا شارق باؤ؟" چھانگا نے اسے گھورا۔

"اس طرح کہ میں اس چھاپہ مار ٹیم کے ساتھ تھا۔" شارق نے بتایا۔

"کیا؟" چھانگا حیرت سے اچھل پڑا۔ "تم....یعنی تم...."

"ہاں چھانگے۔" شارق نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے تفصیل سے اس کارروائی کے بارے میں بتانے لگا۔

"خوش کیتا ای شارق باؤ۔" چھانگا نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اور پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "بڑا کام کر دکھایا شارق باؤ۔ وہ سالا اب کہیں کونے میں چھپا بیٹھا اپنے زخم چاٹ رہا ہو گا۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا ہو گا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ اس تھانے کی پولیس تو اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔"

"میرا خیال ہے کہ تم شیرا پہلوان کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔" شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسے یہ جاننے میں دیر نہیں لگے گی کہ اس کے خلاف اس ساری کارروائی میں کس کا ہاتھ تھا کیونکہ جس ڈی ایس پی کی نگرانی میں چھاپہ مارا گیا تھا اس کا تعلق اسی علاقے سے تھا اور تمہارے کہنے کے مطابق شیرا پہلوان ہر مہینے اس ڈی ایس پی کو لاکھوں روپے مہینہ بھتہ دیتا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو یار۔" چھانگا نے کہا۔ "اور ہو سکتا ہے اسے پتہ چل بھی گیا ہو۔"

"کیا شیرا پہلوان کو یہ معلوم ہے کہ میں تمہارے پاس ہوں؟" شارق نے پوچھا۔

"ہاں شارق باؤ۔" چھانگا نے کہا۔ "اسے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری رہائی سے پہلے میں نے جیل میں تم سے ملاقات کی تھی۔"

"تو ایسی صورت میں تمہیں اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہو گی۔"

"ارے وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" چھانگا نے کہا۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ وہ میری طرف آئے۔ اب تمہارے ہوتے ہوئے اس کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے میں تو اور بھی مزہ آئے گا۔"

"ہاں' مزہ تو آئے گا۔" شارق نے کہا۔

شارق اس رات وہیں رہ گیا تھا۔ وہی ایک کمرہ اس کے لئے مخصوص ہو گیا تھا جہاں وہ پہلی

رات کو سویا تھا۔ رات بارہ بجے جب چھانگا نے اپنا کاروبار بند کیا تو وہ دونوں مزار والے تہہ خانے میں چلے گئے تھے جہاں وہ ڈی ایس پی بندھا ہوا تھا۔ اسے تین دن سے کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ وہ بہت ہی ابتر حالت میں تھا۔ اس پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔

"پانی... خدا کے لئے مجھے ایک گھونٹ پانی دے دو۔" وہ شارق اور چھانگا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیوں نہیں۔" شارق بولا۔ "تمہیں پانی ضرور دیا جائے گا مگر ابھی نہیں' کل صبح.... تمہیں پانی بھی دیا جائے گا اور کھانا بھی۔"

"مجھے چھوڑ دو۔" ڈی ایس پی گھگھیایا۔

"ہاں ہاں تمہیں چھوڑ بھی دیا جائے گا۔ لیکن کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم نے کتنے بے گناہوں کو پکڑ کر کسی جرم کے بغیر انہیں سلاخوں کے پیچھے بند کیا تھا۔ کتنے گھر اجاڑے ہیں اب تک تم نے۔ تم نے تو کئی بے گناہوں کو لمبے لمبے عرصوں کے لئے جیلوں میں بھجوایا تھا۔ تمہیں تو ابھی صرف تیسرا ہی دن ہے۔ ابھی سے گھبرا گئے۔" شارق نے کہا۔

"اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

"بہت خوب۔" شارق نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اس وقت تو تم کوئی بھی وعدہ کر سکتے ہو لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم تمہاری بات پر یقین کر لیں گے۔ اب یہاں سے تمہاری لاش ہی باہر جا گی۔"

ڈی ایس پی چیختا چلاتا رہا مگر شارق یا چھانگا پر اس کے چیخنے چلانے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے تہہ خانے میں چھوڑ کر باہر آ گئے۔

اسی رات شارق اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا شارق گڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس نے اپنے اوپر جھکے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ جیرا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" شارق نے بدحواس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شیرا پہلوان اور اس کے آدمی ہمارے اڈے کو گھیرے میں لے رہے ہیں۔" جیرا نے کہا۔

"جلدی سے اٹھ کر باہر آ جاؤ اور یہ سنبھال لو۔" اس نے ایک کلاشنکوف رائفل اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ "میگزین بھرا ہوا ہے اور رائفل آٹومیٹک ہے۔ اب تم جلدی سے باہر آ جاؤ۔"

جیرا بڑی تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ شارق نے بھی کمرے سے باہر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے جیسے ہی کمرے سے باہر قدم رکھا طویلے کے پچھلی طرف ایک مکان

چھت سے پہلی گولی چلائی گئی۔ شارق اس وقت کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے آنے والی روشنی میں تھا اور گولی اسی پر چلائی گئی تھی لیکن وہ بال بال بچ گیا تھا۔ گولی اس کے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی تھی۔ شارق نے تاریکی میں ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ اس پہلے فائر کے ساتھ ہی چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ چھانگا کے آدمیوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی۔

"شارق باؤ' ادھر آ جاؤ۔"

یہ آواز چھانگا کی تھی جو دائیں طرف سے آئی تھی۔ شارق ایک لمحہ کو اپنی جگہ پر بے حس و حرکت رہا پھر اس نے آواز کی سمت چھلانگ لگا دی۔ چھانگا ایک تانگے کے پیچھے کھڑا تھا۔ فائرنگ کی آوازوں سے تانگے کے قریب بندھے ہوئے گھوڑے بدک کر ہنہناتے ہوئے اچھل کود کر رہے تھے۔ ایک گھوڑے نے اپنی رسی تڑوا لی تھی اور ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔

دفعتاً" ایک انسانی چیخ سنائی دی۔ وہ چھانگا کا آدمی تھا جو ایک طرف دوڑتے ہوئے گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ دوسری گولی اس گھوڑے کو لگی جو ہنہناتا ہوا ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔

"چھانگے!" اچانک فضا میں شیرا پہلوان کی آواز سنائی دی۔ "تم چاروں طرف سے ہمارے گھیرے میں ہو۔ ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ تم لوگوں کو بھون کر رکھ دیں۔ لیکن اگر تم شارق باؤ کو ہمارے حوالے کر دو تو ہم واپس چلے جائیں گے۔ میرا اور تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں صرف شارق کو اپنے قبضے میں لینا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہاری طرح یار مار نہیں ہوں شیرا پہلوان۔" چھانگا نے چیخ کر جواب دیا۔ "شارق باؤ میرا دوست ہے اور تم جانتے ہو کہ میں دوستوں کے لئے جان تو دے سکتا ہوں لیکن ان سے غداری نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر تم بھی مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ آج تم لوگ میرے گھیرے سے بچ کر نہیں نکل سکو گے۔" شیرا پہلوان نے چیخ کر کہا اور اس کے ساتھ ہی فائرنگ میں تیزی آ گئی۔

"شارق باؤ۔" چھانگا نے سرگوشی کی۔ "میں بزدل نہیں ہوں۔ ہمارے پاس اسلحہ کی بھی کمی نہیں ہے لیکن ہم اس وقت چاروں طرف سے گھیرے میں ہیں۔ میں اپنے آدمیوں کو مروانا نہیں چاہتا۔ بہتر یہی ہے کہ ہم یہاں سے نکل چلیں۔"

"لیکن وہ چاروں طرف سے فائرنگ کر رہے ہیں اس طویلے سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔" شارق نے کہا۔

"جو شخص اس قسم کے کام کرتا ہے وہ اپنے بچاؤ کے راستے بھی رکھتا ہے۔" چھانگا نے کہا اور

اس کا بازو پکڑ کر ٹانگوں کی آڑ لیتا ایک طرف بڑھ گیا۔

"جیرے!" اس نے ایک تانگے کے پیچھے کھڑے ہوئے جیرے کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ "ہم یہاں ان لوگوں کو روکے ہوئے ہیں تم شاکر اور فرزند کو ساتھ لے جا کر وہ راستہ کھولو... جلدی کرو۔"

جیرا فائرنگ کرتا ہوا ایک طرف دوڑنے لگا۔ شارق اور چھانگا بدستور کھڑے فائرنگ کر رہے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد فضا میں سیٹی کی آواز سنائی دی۔

"شارق باؤ! تم مزار کے پچھلی طرف نکلے کے ساتھ والی دیوار کے قریب چلے جاؤ۔ جیرا وہاں تمہارا منتظر ہو گا۔ چھانگا نے سرگوشی کی۔

شارق فائرنگ کرتا ہوا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ایک گولی اس سے صرف دو فٹ آگے زمین پر لگی۔ دھول اور لید اڑ کر شارق کے منہ پر پڑی۔ شارق نے طویلہ کے پچھلی طرف مکان کی چھت کی طرف دیکھا جہاں سے گولی چلائی گئی تھی۔ اس نے مکان کی چھت کی طرف برسٹ مار دیا اور بڑی تیزی سے رینگتا ہوا سامنے پڑے ہوئے مردہ گھوڑے کی آڑ میں پہنچ گیا۔ ایک لمحہ وہاں رکا اور پھر اٹھ کر تیزی سے مزار کی طرف دوڑنے لگا۔ چھت سے چلائی جانے والی گولیاں اس کا تعاقب کرتی رہیں لیکن وہ ان گولیوں سے محفوظ ہی رہا۔ مزار کے پیچھے کی طرف پہنچ کے قریب رک کر وہ متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لیکن اس طرف گہری تاریکی تھی اور اسے کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"شارق باؤ... اس طرف..."

جیرے کی سرگوشی سن کر وہ اس طرف مڑ گیا۔ پچھلی طرف تقریباً دس فٹ کے فاصلے باؤنڈری وال تھی۔ پرانے زمانے کی بنی ہوئی چھوٹی اینٹوں کی یہ دیوار تقریباً چار فٹ موٹی تھی جیرا جس جگہ دیوار کے قریب کھڑا تھا وہاں دیوار میں تقریباً دو فٹ چوڑا خلا نظر آ رہا تھا۔ شارق دوڑتا ہوا اس دیوار کے قریب پہنچ گیا۔

"اندر چلو۔ شارق باؤ۔ جلدی کرو۔" جیرے نے سرگوشی میں کہا۔

شارق اس خلا میں داخل ہو گیا۔ جیرا وہیں کھڑا رہا۔ تقریباً دو منٹ بعد چھانگا بھی اس خلا پہنچ گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی جیرا اور اس کے ساتھ دو آدمی اندر کی طرف دیوار کے ایک حصے دھکیلنے لگے۔ دیوار کا وہ حصہ سلائیڈنگ ڈور کی طرح اس خلا میں فٹ ہو گیا۔

باہر سے وہ دیوار اسی طرح تھی۔ چھوٹی اینٹوں کی اور کئی اینٹیں جگہ جگہ سے بھربھری ہو ٹوٹ گئی تھیں۔ باہر سے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ اس جگہ سے دیوار کا کوئی حصہ الگ ہو

ہے۔ لیکن اندر سے چار فٹ موٹی یہ دیوار کھوکھلی تھی اور دیوار کے اندر کی طرف نیچے سے تک تقریباً ایک انچ موٹی آہنی چادریں لگی ہوئی تھیں۔

خلا بند ہوتے ہی جیرے نے ٹارچ روشن کر لی اور دوسروں کو راستہ دکھاتا ہوا تیزی سے آگے نے لگا۔ شارق یہ سب کچھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

"یہ سب کچھ میں نے بڑی محنت سے بنوایا ہے شارق باؤ۔" چھانگا نے کہا۔ "وہ تہہ خانہ تو ی نظروں میں نہیں آجائے گا؟" شارق نے پوچھا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" چھانگا نے جواب دیا۔ "وہ قبر ہے اور کوئی قبر پر کسی قسم کا شک کر سکتا۔"

تقریباً بارہ فٹ آگے راستہ بند ہو گیا تھا۔ اسی جگہ مخالف سمت میں دیوار پر بہت بڑا آہنی سا لگا ہوا تھا۔ جیرا اور اس کا ایک ساتھی ہینڈل کو پوری قوت سے نیچے کی طرف دبانے لگے۔ کی آواز سن کر وہ آہنی پلیٹ کو ایک طرف دھکیلنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد یہاں بھی دیوار میں خلا سا پیدا ہو گیا۔

یہ اس مزار کے عقبی سمت کی گلی تھی جو اس وقت تاریک اور سنسان پڑی تھی۔ وہ لوگ باری اس خلا سے باہر آ گئے۔ باہر سے دیوار کو دھکیل کر خلا کو برابر کر دیا گیا اور وہ لوگ سے چلتے ہوئے سامنے والی گلی میں داخل ہو گئے۔ طویلے کی طرف سے اب بھی فائرنگ کی یں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ تعداد میں پانچ تھے جو تنگ اور سنسان گلیوں میں گھومتے ہوئے ایک مکان کے سامنے رک ۔ جیرے نے آگے بڑھ کر دروازے کی گھنٹی بجا دی۔ دوسری مرتبہ گھنٹی بجانے کے کچھ دیر بعد وازہ کھل گیا اور وہ سب لوگ اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ کھولنے والا ایک بوڑھا آدمی تھا۔ ان داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ لوگ ایک کمرے میں آ گئے۔

چھانگا کے طویلے کی طرف سے ابھی تک فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

○

تین مہینوں میں شارق نے چھانگا سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اس دوران اس نے شیرا پہلوان گروہ کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا تھا۔ کبھی وہ خود اس کے اڈے پر حملہ کرتا اور کبھی پولیس سے کرواتا۔ اس صورت حال سے تنگ آ کر شیرا پہلوان کے آدمی آہستہ آہستہ اس کا ساتھ نے چلے گئے اور بالآخر شیرا پہلوان کا گروہ اس طرح بکھر گیا جیسے کبھی اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ شیرا پہلوان بھی سرحد پار کر کے ہندوستان فرار ہو گیا تھا جہاں اس نے ایک سکھ اسمگلر کے

پاس پناہ لی تھی۔

لیکن ایک گروہ کے ختم ہو جانے سے شارق کا کام ختم نہیں ہو گیا تھا۔ ابھی تو اس ش
اور بہت سے گروہ تھے جو معصوم اور بے گناہ لوگوں میں موت بانٹ رہے تھے۔ سب سے بڑا
تو چھانگا کا تھا جس میں وہ خود بھی شامل تھا۔ اس گروہ میں رہتے ہوئے وہ دوسروں کے راز
کر رہا تھا اور اس کالے دھندے کی اونچ نیچ سے واقفیت حاصل کر رہا تھا۔ یہ معلومات ہی اس
لئے مفید ثابت ہو رہی تھیں۔

ڈی ایس پی ابھی تک شارق کے قبضے میں تھا شارق نے صرف پہلے دن اس پر ہاتھ اٹھایا
اس کے بعد اس نے کبھی اسے چھوا تک نہیں تھا۔ وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔
حالت میں اگر اس کے بیوی بچے بھی اسے دیکھ لیتے تو پہچان نہ پاتے۔ شارق اس کی وجہ سے
سال جیل میں تڑپا تھا اور اب وہ اسے سسکا سسکا کر مارنا چاہتا تھا۔

چھانگا اب شارق پر پوری طرح اعتماد کرنے لگا تھا۔ وہ کاروباری حلقوں میں جہاں بھی
شارق کو ساتھ لے جاتا۔ شارق اب اس کے نائب کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ شارق
گروہ کے کچھ ساتھی اسے پسند کرنے لگے تھے اور کچھ اس سے جلنے لگے تھے۔ جو لوگ شارق
خار کھانے لگے تھے ان میں جیرا بھی شامل تھا۔ جیرا اس معاملے میں ایک لحاظ سے حق بجانب
شارق کے آنے سے پہلے وہ چھانگا کا معتمد خاص سمجھا جاتا تھا لیکن جیسے جیسے شارق کے قدم جم
رہے تھے ویسے ویسے ہی جیرا کی اہمیت کم ہوتی جا رہی تھی۔ شارق اس صورت حال سے پو
طرح واقف تھا لیکن وہ بڑی حکمت عملی سے کام لے رہا تھا۔ وہ جیرا کو اس گروہ سے الگ کرنا
تھا۔ لیکن اس طرح کہ وہ چھانگا سے الگ ہو کر اس کے مقابلے پر آ جائے اور وہ دونوں آپس
بھڑ جائیں اس کے لئے شارق نے ایک منصوبہ بنا رکھا تھا اور اس پر عمل کرنے کے لئے موقع
تاک میں تھا۔

اس کے ساتھ ہی شارق نے اپنے بچاؤ کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ اس نے سہیل مریم
رضیہ سے اپنا تعلق چھانگا اور اس کے آدمیوں سے خفیہ ہی رکھا تھا۔ وہ سہیل کے ریسٹورنٹ
گھر جاتا تو اس بات کا بہت خیال رکھتا کہ اس کا تعاقب نہ کیا جا رہا ہو۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس
وجہ سے سہیل یا مریم وغیرہ کو کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اس
چوبرجی کے قریب ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ جہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ یہاں
عام طور پر شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی آتا اور مکان سے نکلتا بھی شام کے اندھیرے ہی
تھا۔ پڑوسیوں سے اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے اس مکان کے بارے میں کسی

بھی علم نہیں تھا۔ اس نے بڑی رازداری سے مکان کے اندر کچھ تبدیلیاں بھی کروائی تھیں۔

جیرے کے سلسلے میں شارق جس موقع کی تلاش میں تھا بالآخر وہ موقع اسے مل ہی گیا۔ جیرا
رات باغبانپورہ کے نکا پہلوان کے لئے مال لے کر گیا تھا۔ چھانگا کے کچھ گاہک ایسے بھی تھے
جہاں چھانگا کے آدمی خود مال پہنچاتے تھے۔ نکا پہلوان بھی ان میں سے ایک تھا۔ نکا پہلوان کا اڈہ
بھی باغبانپورہ میں تانگوں کا ایک طویلہ ہی تھا۔

سنگھ پورہ سے باغبانپورہ کی طرف جانے والی سڑک حق نواز روڈ پر ایک طرف چھوٹا سا
قبرستان تھا اور اس کے سامنے دکانیں۔ تانگوں کا وہ طویلہ بھی انہی دوکانوں کے بیچ میں تھا۔ اس کا
بیرونی راستہ حویلی نما گیٹ کی طرح تھا۔ لکڑی کا ایک بھاری پھاٹک بھی تھا لیکن وہ پھاٹک ہمیشہ کھلا
رہتا تھا۔ اس کی چولوں میں اور اس کے سامنے اتنی مٹی جم چکی تھی کہ پھاٹک کے بھاری
دروازوں کو ان کی جگہ سے ہلانا ممکن نہیں رہا تھا۔ پھاٹک کے اندر بہت وسیع و عریض احاطہ تھا
جس کے آخر میں تین چار رہائشی کمرے تھے۔ کسی زمانے میں اس احاطے میں پہلوانی کا اکھاڑہ ہوا
کرتا تھا لیکن جیسے جیسے کشتی میں لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی چلی گئی یہ اکھاڑہ بھی ویران ہوتا چلا گیا۔
نکا پہلوان نے بھی کشتی چھوڑ کر دو تین تانگے بنوا لئے جنہیں وہ کرائے پر دیا کرتا تھا۔ اب اس کے
پندرہ سولہ تانگے تھے۔ یہ تانگے بھی چھانگے کی طرح اس کے اصل کاروبار کی آڑ تھے۔ اس کا
اصل کام تو منشیات فروشی تھا۔ پہلے وہ کشتی سکھا کر نوجوانوں کی جان بنایا کرتا تھا اور اب وہ ان کے
خون میں ہیروئن کا زہر گھول کر ان کی جان جلا رہا تھا۔

نکا پہلوان ہفتہ دس دن میں صرف ایک مرتبہ چھانگے ہی سے مال لیتا تھا۔ اور یہ مال اسے خود
چھانگا کا کوئی آدمی پہنچایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شارق بھی یہ خدمت انجام دے چکا تھا۔ ویسے عام
طور پر ایسے گاہکوں کو مال پہنچانے اور رقم وصول کرنے کی ذمے داری جیرا کے سپرد تھی۔

اس رات بھی جیرا' نکا پہلوان کے لئے مال لے کر جانے والا تھا۔ مال دے کر اسے تقریباً دو
لاکھ کی رقم بھی وصول کرنی تھی۔ شارق کو پروگرام کا علم ہو گیا تھا اس لئے وہ جیرا سے تقریباً آدھا
گھنٹہ پہلے وہاں سے نکل گیا تھا۔ اسے جس موقع کی تلاش تھی وہ اسے مل گیا تھا۔

جس وقت شارق' سنگھ پورہ کی سڑک پر گھاٹی کے قریب رکشہ سے اترا اس وقت رات کے
بارہ بج رہے تھے۔ موڑ پر چائے کا چھوٹا سا ریسٹورنٹ کھلا ہوا تھا۔ یہ ریسٹورنٹ ایک دکان پر
مشتمل تھا۔ دو تین لکڑی کے بینچ اندر بچھے ہوئے تھے اور دو تین بینچ نما میزیں اور چند کرسیاں
دکان کے سامنے بچھی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں پر دو تین گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹیپ ریکارڈر پر
لوچھی آواز میں لتا کا گانا چل رہا تھا۔

شارق رکشے سے اتر کر سیدھا آگے سنگھ پورہ کی طرف چلا گیا اور تقریباً سو گز آگے جا کر دائیں طرف کی گلی میں مڑ گیا۔ اس گلی میں دائیں طرف کے چند مکانوں کے بعد قبرستان شر ہو جاتا تھا۔ اسی قبرستان کی دوسری دیوار حق نواز روڈ کی طرف تھی۔ شارق قبرستان میں داخل گیا۔

قبرستان میں تاریکی اور سناٹا تھا۔ اکا دکا درخت بھی تھے جن سے ماحول کچھ اور وحشت ہ ہو گیا تھا۔ دن کے وقت اس قبرستان میں لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی لیکن رات کو کوئی ا ہی یہاں آنے کی جرات کر سکتا تھا۔

شارق درختوں اور قبروں کی آڑ لیتا ہوا بازار کی سمت والی دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ دیوار ساتھ ہی باہر کی طرف تقریباً تین فٹ چوڑا گندا نالا تھا۔ قبرستان والی سائیڈ پر کوئی دکان وغیرہ تھی البتہ سڑک کے دوسری طرف دوکانیں تھیں جو اس وقت بند پڑی تھیں۔ اس سڑک اسٹریٹ لائٹس موجود تو تھیں لیکن کسی کھمبے پر کوئی بلب نہیں جل رہا تھا جس کی وجہ سے سڑک وہ حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دائیں طرف تقریباً سو گز کے فاصلے پر موڑ پر واقع چائے کی دکان تھی جس کے قریب شارق رکشہ سے اترا تھا۔ بائیں طرف ذرا آگے باقاعدہ بازار شروع جاتا تھا مگر اس وقت اس طرف بھی سناٹا تھا۔

قبرستان آبادی کے بیچ میں تھا۔ اس کے سامنے والے رخ پر یہ ویران سڑک تھی اور تین اطراف میں مکان اور گلیاں۔ شارق قبرستان کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے قریب اس جگہ پر رک گیا جہاں سامنے ہی اس احاطے کا پھاٹک تھا جس کے اندر متعدد تانگے کھڑے تھے اور احا کے آخر میں کسی کمرے کی کھڑکی سے مدہم سی روشنی جھلک رہی تھی۔

جس جگہ شارق دیوار کی آڑ میں کھڑا تھا وہاں بیری کا ایک اونچا درخت بھی تھا اسی درخت وجہ سے اس جگہ تاریکی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ شارق درخت کے نیچے دیوار کی آڑ میں سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد ایک خالی تانگہ احاطے کے پھاٹک میں داخل شارق نے ایک اور آدمی کو بھی پھاٹک کے اندر کی طرف کہیں سے نکلتے دیکھا تھا۔ تانگہ ذرا جا کر رک گیا اور کوچوان نیچے اتر کر گھوڑی کو کھولنے لگا۔ شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تانگہ کرائے پر لیا گیا تھا اور کوچوان اپنی دہاڑی پوری کرنے کے بعد تانگہ واپس چھوڑنے آیا اور وہ دوسرا آدمی جو احاطے میں کسی طرف سے برآمد ہوا تھا غالباً اس احاطے کا محافظ تھا اور اس کے پاس کسی قسم کا اسلحہ بھی موجود ہوگا۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آوازیں تو تک پہنچ رہی تھیں لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ چند منٹ بعد کوچوان احاطے

کر ایک طرف چلا گیا۔

ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ ایک رکشہ کی آواز سن کر شارق نے چائے کی دکان والے موڑ کی طرف دیکھا رکشہ اسی طرف سے آ رہا تھا۔ شارق کی نظریں رکشے پر مرکوز تھیں جو بالآخر احاطے کے پھاٹک کے سامنے آکر رک گیا۔ دو آدمی نیچے اترے اور رکشہ آگے چلا گیا۔

تاریکی ہونے کے باوجود شارق نے قد و قامت اور چال سے ان دونوں آدمیوں کو پہچان لیا۔ ان میں ایک جیرا تھا اور دوسرا شاکر۔ وہ دونوں احاطے میں داخل ہو گئے۔ احاطے کے اندر وہ پراسرار محافظ ایک بار پھر سامنے آگیا تھا۔ جیرا اور شاکر کچھ دیر اس پراسرار محافظ کے پاس رکے اور پھر آگے بڑھ گئے۔

شارق گہری نظروں سے احاطے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر چہرے پر باندھ لیا تھا اور پستول بھی اس کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ اس نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ بے حد خطرناک تھا۔ اس میں اس کی جان بھی جا سکتی تھی اور اگر جان بچ بھی جائے تو ناکامی کی صورت میں اس کا راز فاش ہو سکتا تھا۔ لیکن اس نے بہرحال یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا اس کے لئے اس قسم کا خطرہ مول لئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

تقریباً بیس منٹ بعد جیرا اور شاکر احاطے سے باہر آ گئے۔ سڑک پر کھڑے ہو کر انہوں نے ادھر ادھر دیکھا پھر جیرے کی آواز سنائی دی۔

"تم ہی نے تو اسے کہا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد آنا۔ وہ آگے چوک پر چلا گیا ہو گا۔ چلو اس موڑ پر چائے کی دکان پر بیٹھتے ہیں آ جائے گا وہ بھی....." یہ شاکر کی آواز تھی۔ وہ ابھی چند قدم آگے بڑھے تھے کہ شارق قبرستان کی دیوار کود کر اچانک ہی ان کے سامنے آگیا۔ ایک نقاب پوش کو اچانک اس طرح سامنے دیکھ کر وہ دونوں کسی قدر بدحواس ہو گئے تھے۔

"رک جاؤ۔" شارق ان دونوں کو پستول کی زد پر لیتے ہوئے غرایا۔ "اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ گولی مار دوں گا۔"

"کک....کون ہو تم؟" شاکر ہکلایا۔

"تمہاری موت.....ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" شارق نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ اس کی آواز بدلی ہوئی تھی۔ "اور یہ تھیلا مجھے دے دو۔" اس نے جیرے کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے کے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں' میں یہ تھیلا تمہیں نہیں دے سکتا۔" جیرا دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

شارق نے آگے بڑھ کر اچانک ہی پستول کی نال اس کے منہ پر ماری۔ چوٹ رخسار کی ہڈی

پر لگی تھی۔ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑایا۔ شارق نے اس کے ہاتھ سے تھیلا جھپ
لیا۔ اس دوران وہ ایک لمحہ کو شاکر کی طرف سے غافل ہوا تھا۔ شاکر نے اس موقع سے فائ
اٹھاتے ہوئے شارق کی پنڈلی پر ٹھوکر مار دی۔

ہڈی پر لگنے والی چوٹ خاصی تکلیف دہ تھی۔ شارق کراہتے ہوئے لڑکھڑایا۔ لیکن اس
سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس دوران جیرے کو اپنی جیب سے پستول نکالنے کا موقع مل گیا
اس نے گولی چلا دی لیکن شارق نے بڑی پھرتی سے شاکر کو گرفت میں لے کر آگے دھکیل دیا تھا
گولی شاکر کے پیٹ میں لگی۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔

شارق نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیرے کے پستول والے ہاتھ پر ٹھوکر مار دی۔
پستول جیرے کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ شارق کی دوسری ٹھوکر جیرے کے پیٹ پر لگ
تھی۔ وہ چیخ کر دوہرا ہو گیا۔

فائر اور چیخوں کی آواز سن کر احاطے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ شارق
سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ نکا پہلوان کا محافظ تھا جو دوڑتا ہوا باہر آ رہا تھا۔ اسی لمحہ بائیں طرف
سے رکشہ بھی آتا ہوا دکھائی دیا۔

شارق کے لئے وہاں رکنا اب خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس نے قبرستان کی طرف دوڑ
دی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں تھیلا۔ وہ قبرستان کی شکستہ دیوار کے
قریب پہنچا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔

"رک جاؤ' ورنہ گولی مار دوں گا۔"

یہ احاطے کے محافظ کی آواز تھی۔ شارق نے مڑ کر آواز کی سمت فائر کر دیا۔ مقصد ان لوگو
کو اپنے تعاقب سے روکنا تھا۔ فائر کرتے ہی اس نے ٹوٹی ہوئی دیوار پر چڑھ کر قبرستان میں چھلانگ
لگا دی تھی۔ یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے مگر شارق گولیوں سے محفوظ رہا۔ وہ قبروں میں دوڑ
ہوا دائیں طرف کی دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ یہ دیوار تقریباً چھ فٹ اونچی تھی مگر شارق کو اس
چڑھنے اور دوسری طرف کودنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ دیوار سے کود کر دوڑ
ہوا گلی میں گھس گیا۔ یہ گلی اسے دوبارہ اسی سڑک پر لے آئی تھی۔ پہلوان والا احاطہ بائیں طرف
تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ وہاں دو آدمی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ رکشہ آگے جانے کے
بجائے مڑ کر واپس جا چکا تھا۔ قبرستان میں ایک بار پھر فائر کی آواز سنائی دی۔ شارق کو اندازہ لگنے
میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ جیرا اور نکا پہلوان کا آدمی اسے قبرستان میں تلاش کر رہے

شارق چند لمحے گلی کے موڑ پر دکان کی آڑ میں کھڑا رہا پھر آڑ سے نکل کر سامنے والی گلی کی طرف دوڑا۔

"وہ رہا.....اس طرف۔"

ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی فائر ہوا مگر شارق سامنے والی گلی میں داخل ہو چکا تھا۔ اسے سڑک پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ بھی رکنے کے بجائے تنگ اور تاریک گلیوں میں دوڑتا رہا۔

قدموں کی آواز اب بہت پیچھے رہ کر معدوم ہو چکی تھی۔ شارق ان گلیوں میں دوڑتا رہا۔ بھول بھلیوں کی طرح یہ گلیاں خاصی پر پیچ تھیں۔ شارق کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ کسی گلی میں ان لوگوں سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ برف خانے کے ساتھ والی گلی سے نکل کر جی ٹی روڈ پر پہنچ گیا۔ برف خانے کے سامنے مہردا ہوٹل تھا۔ اگرچہ ایک بجے سے اوپر کا وقت ہو چکا تھا مگر ہوٹل کھلا ہوا تھا۔ ہوٹل کے سامنے کرسیوں پر پانچ چھ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ پان سگریٹ کا کیبن بھی کھلا ہوا تھا اور ایک تانگہ بھی سڑک کے کنارے پر کھڑا تھا۔

شارق سڑک پر آنے کے بجائے عمارتوں کی تاریکی کی آڑ لیتا ہوا بائیں طرف چلنے لگا۔ اس نے چہرے سے رومال ہٹا لیا تھا اور پستول بھی جیب میں ڈال لیا تھا۔ ہوٹل سے ذرا آگے ٹیلی فون ایکس چینج کی بلڈنگ تھی۔ کافی آگے جا کر شارق سڑک پار کر کے ٹیلی فون ایکس چینج والی بلڈنگ کے ساتھ والی گلی میں داخل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس وقت یہی اس کے لئے محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ دوسری مرتبہ گھنٹی بجانے کے بعد دروازہ کھلا۔ وہ شاہد تھا جو شارق کو دیکھ کر کچھ حیران بھی ہوا تھا۔ شاہد سوتے میں سے اٹھا تھا۔ مریم اور رضیہ بھی سو چکی تھیں مگر گھنٹی کی آواز سن کر مریم جاگ گئی تھی۔

"شارق بیٹر۔" وہ شارق کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟"

"فیصل آباد سے آ رہا ہوں ماں جی۔" شارق نے جواب دیا۔ "میں تو گیارہ بجے پہنچ جاتا مگر ٹرین لیٹ ہو گئی تھی۔ میری وجہ سے آپ کی نیند بھی خراب ہوئی۔"

"تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو جیسے کسی اجنبی گھر میں آئے ہو۔" مریم نے کہا جو چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ "کھانا کھایا ہے یا نہیں؟"

"کھانا تو کھا چکا ہوں ماں جی' چائے پیوں گا۔" شارق نے کہا۔ "آپ جا کر سو جایئے۔ شاہد بنا

دے گا چائے۔"

"نہیں بیٹا' چائے میں بنا دیتی ہوں۔" مریم کہتے ہوئے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

شارق اپنے کمرے میں آ گیا۔ شاہد بھی مریم کے ساتھ باورچی خانے میں چلا گیا تھا۔ شارق دروازہ بند کر کے کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ جیرا سے چھینا ہوا کپڑے کا تھیلا اس نے پلنگ پر رکھ دیا تھا اور پستول تکیئے کے نیچے۔ کپڑے تبدیل کر کے اس نے تھیلا کھول کر دیکھا۔ اس میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ اس کے اندازے کے مطابق یہ رقم دو لاکھ کے لگ بھگ ضرور رہی ہو گی۔ اس نے رقم دوبارہ تھیلے میں ڈال دی اور دروازہ کھول دیا۔ اس کے صرف ایک منٹ بعد شاہد چائے لے کر اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ہی مریم بھی تھی۔

"جاؤ.... تم جا کر سو جاؤ۔" شارق نے شاہد کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے کہا۔ شاہد کمرے سے چلا گیا۔

"فیصل آباد کیا لینے گئے تھے؟" مریم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک ضروری کام تھا ماں جی۔" شارق نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "یہ رقم آپ سنبھال کر رکھ لیجئے جب ضرورت پڑے گی تو آپ سے لے لوں گا۔" اس نے پلنگ پر پڑا ہوا تھیلا اٹھا مریم کی طرف بڑھا دیا۔

مریم نے تھیلے میں بھرے ہوئے نوٹوں کے بنڈل دیکھے مگر رقم کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ شارق خاموشی سے چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ مریم گھریلو امور کے بارے میں باتیں کر رہی تھی۔ شارق نے کپ خالی کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا تو مریم کپ اٹھاتے ہوئے کرسی سے اٹھ گئی۔

"اب سو جاؤ بیٹا' رات بہت ہو چکی ہے۔"

"جی ماں جی۔" شارق نے جواب دیا۔

مریم کے جانے کے بعد شارق بستر پر لیٹا آج کے واقعہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے چھانگا کے گروہ کی شکست و ریخت کے سلسلے میں پہلا قدم اٹھا لیا تھا۔ شاکر کے پیٹ میں گولی لگی تھی' پتہ نہیں وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا لیکن شارق کے اس اقدام کے نتیجہ میں بہت سے ایسے واقعات رونما ہونے والے تھے جن کے بارے میں چھانگا یا نکا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ شارق کو یقین تھا کہ جیرا نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ اس نے ڈکیتی کا تاثر دینے کی کوشش کی تھی۔ اس واقعہ سے چھانگا کو یہ تاثر بھی دیا جا سکتا تھا کہ یہ واردات نکا پہلوان کے آدمیوں نے کی تھی۔ کیونکہ وہی لوگ جانتے تھے کہ جیرا اور شاکر ایک خطیر رقم لے کر اس کے اڈے سے نکل رہے تھے۔

دوسری طرف چھانگا کو یہ تاثر بھی دیا جا سکتا تھا کہ یہ ڈرامہ جیرا ہی نے نکا پہلوان کے کسی آدمی کے ساتھ مل کر رچایا تھا تاکہ وہ اس رقم کو ہضم کر سکے۔ جیرا' چھانگا کا قابل اعتماد ساتھی تھا مگر کسی کی نیت بدلتے دیر تو نہیں لگتی۔ اس طرح نہ صرف چھانگا اور نکا پہلوان کے تعلقات بگڑ سکتے تھے بلکہ جیرا پر سے چھانگا کا اعتماد اٹھ سکتا تھا۔ اور شارق چاہتا بھی یہی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے منفی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ جیرا کوئی انتقامی کارروائی کر سکتا تھا۔

شارق یہی سب کچھ سوچتے ہوئے نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اسے صبح آٹھ بجے رضیہ نے جگایا تھا وہ چائے کا کپ لئے پلنگ کے قریب کھڑی تھی۔

"میں آدھے گھنٹے سے آپ کو جگا رہی ہوں مگر آپ تو گدھے گھوڑے سب کچھ بیچ کر سو رہے تھے۔ دوسری دفعہ بنائی ہے چائے میں نے۔" رضیہ نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"رات کو تقریباً ڈیڑھ بجے تو آیا تھا۔ اور پھر تھکا ہوا بھی تھا۔" شارق کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ جب وہ کلی وغیرہ کر کے باتھ روم سے واپس آیا تو کمرے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ رضیہ پلنگ کے قریب کھڑی تھی اور اسکے ہاتھ میں پستول تھا جسے وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"یہ کیا ہے بھیا؟" وہ شارق کی طرف دیکھ کر ہکلائی۔

"ارے.... اسے رکھ دو.... کہیں ٹرائیگر نہ دب جائے۔" شارق نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ "تم نے یہ کیوں اٹھا لیا تھا؟"

"بستر کی چادر درست کرنے لگی تھی تو یہ تکیئے کے نیچے سے گر پڑا تھا۔" رضیہ نے کہا۔ "مگر آپ کے پاس یہ پستول....." وہ الجھی ہوئی نگاہوں سے شارق کی طرف دیکھنے لگی۔

"کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔" شارق نے پستول دوبارہ تکیئے کے نیچے رکھ دیا۔ "میرا بزنس ایسا ہے۔ بڑی بڑی رقموں کا لین دین رہتا ہے اور آج کل کے حالات تم جانتی ہو۔ یہ پستول میں نے اپنی حفاظت کے لئے رکھا ہوا ہے۔"

شارق پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ رضیہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر کھونٹی پر ٹنگے ہوئے اس کے کپڑے اتار لئے اور جیبوں میں سے رقم اور دوسری چیزیں نکال کر تکیئے کے نیچے رکھ دیں ان میں چابیوں کا گچھا بھی تھا۔

"یہ چابیاں کیسی ہیں؟" رضیہ نے پوچھا۔

"دفتر کی چابیاں ہیں۔" شارق نے جواب دیا۔ "مگر آج تم میری جیبوں کی تلاشی کیوں لے رہی ہو؟"

"تلاشی نہیں لے رہی' کپڑے دھونے ہیں۔" رضیہ نے جواب دیا اور کپڑے لے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ شارق خاموشی سے بیٹھا چائے پیتا رہا۔

ساڑھے نو بجے شارق ناشتہ کر رہا تھا کہ شاہد آ گیا۔ وہ سبزی گوشت وغیرہ لینے کے لئے باغبانپورہ بازار گیا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی وہ خبر سنائی جو شارق سننا چاہتا تھا۔

"رات کو بازار میں فائرنگ ہوئی تھی۔" شاہد نے کہا۔ "ہیروئن بیچنے والوں کی دو پارٹیاں آپس میں ٹکرا گئی تھیں۔ ایک آدمی مارا گیا اور دو کو بعد میں پولیس پکڑ کر لے گئی۔ نکا پہلوان پولیس کے ہاتھ نہیں آیا وہی فساد کی جڑ ہے۔ اس کا بہت بڑا اڈہ ہے ہیروئن کا۔"

"ایسے لوگ نہیں پکڑے جاتے۔" شارق نے کہا۔ "پکڑے اور مارے تو ان کے کارندے جاتے ہیں اور وہ خود محفوظ رہتے ہیں۔"

"یہی تو اصل لوگ ہوتے ہیں' پکڑے کیوں نہیں جاتے؟" شاہد نے کہا۔

"اگر یہ اصل لوگ پکڑے جائیں تو پولیس کا دھندہ کیسے چلے گا۔" شارق نے جواب دیا۔

"ہاں' یہ بھی ٹھیک ہے۔" شاہد بولا۔ "یہی لوگ تو پولیس کی کمائی کا ذریعہ ہیں۔ اگر پولیس انہی کو پکڑ لے تو ان کا دھندہ کیسے چلے گا۔ لیکن شارق بھائی پولیس کو کوئی نہیں پکڑ سکتا؟"

"یہ تو بادشاہ لوگ ہیں۔ ان پر بھلا کون ہاتھ ڈال سکتا ہے۔" شارق نے کہا۔

"اے شاہد.... تم کیا باتیں لے بیٹھے ہو۔ چلو اپنا کام کرو۔ جاؤ یہاں سے۔ جب دیکھو فضول باتیں کرتا رہتا ہے۔" رضیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اماں کہاں ہیں رضیہ؟" شارق نے پوچھا۔

"پڑوسیوں کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔" رضیہ نے جواب دیا۔

شارق خاموش رہا۔ ناشتے کے بعد بھی وہ دیر تک رضیہ سے باتیں کرتا رہا۔ اس دوران مریم بھی آ گئی۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد شارق گھر سے نکل گیا۔ جب وہ مزنگ' چھاپے کے اڈے پر پہنچا تو وہاں سناٹا تھا صرف ایک آدمی موجود تھا جو ایک گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ وہ بظاہر تانگہ چلاتا تھا مگر چھانگے کا ہی آدمی تھا۔ وہ شارق کو دیکھتے ہی بولا۔

"شارق باؤ رفوچکر ہو جاؤ یہاں سے!"

"کیا بات ہے' چھانگا کہاں ہے؟" شارق نے پوچھا۔

"چھانگا لکشمی والے اڈے پر ہے۔ باقی آدمی بھی ادھر ادھر ہو گئے ہیں۔ آدھی رات کے بعد سے صبح گیارہ بجے تک پولیس دو مرتبہ یہاں چھاپہ مار چکی ہے۔" اس شخص نے کہا۔

"کیوں' کیا معاملہ ہے؟" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں نہیں پتہ؟" اس شخص نے شارق کو گھورا۔

"نہیں۔" شارق نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کل رات جیرا اور شاکر' نکا پہلوان کو مال دینے گئے تھے۔ وہ رقم لے کر نکے پہلوان کے طویلے سے باہر نکلے تھے کہ کسی نے ان پر حملہ کر کے رقم چھین لی۔ ان میں مقابلہ بھی ہوا تھا۔ شاکر اس آدمی کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ جیرا اور نکے پہلوان کا ایک آدمی پولیس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ جیرے کو تو سارے زمانے کی پولیس جانتی ہے۔ ان کو پتہ ہے کہ وہ چھانگے کا آدمی ہے۔ صبح چار بجے پولیس نے یہاں چھاپہ مارا تھا مگر چھانگے کو پہلے ہی پتہ چل گیا تھا وہ رفوچکر ہو گیا۔ گیارہ بجے پولیس نے پھر چھاپہ مارا تھا۔"

"کیا ایسا بھی کوئی جی دار ہو سکتا ہے جو چھانگا کے آدمیوں سے رقم چھین لے۔" شارق بولا۔

"چھانگے کو شک ہے کہ یہ حرکت نکا پہلوان کے آدمیوں نے کی ہو گی۔ اس واقعہ کے بعد سے وہ خود بھی غائب ہو گیا ہے۔ مگر چھانگا اسے چھوڑے گا نہیں۔" اس شخص نے کہا۔

شارق دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیرے ہی نے باہر کے کسی آدمی کے ساتھ مل کر یہ پروگرام بنایا ہو۔ یہ دولت بہت بری چیز ہے۔" شارق بولا۔

"نہیں باؤ شارق۔" کوچوان نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "جیرا ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو بچپن ہی سے چھانگے کے پاس ہے تمہارے آنے سے پہلے چھانگے کا تو سارا حساب کتاب ہی اس کے پاس تھا۔"

"ہو سکتا ہے میری وجہ سے اس کے دل میں کوئی بات آ گئی ہو۔" شارق نے کہا۔

"تمہاری یا کسی اور کی وجہ سے جیرے کے دل میں کوئی بات آ تو سکتی ہے مگر وہ ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔" کوچوان نے کہا۔

شارق کوئی جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا دوڑتا ہوا طویلے میں آ گیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"چاچا!" اس نے کوچوان کے قریب آ کر کہا۔ "پولیس کا ٹرک ادھر آ رہا ہے۔ چوک پر ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے وہیں رکا ہوا ہے۔"

"شارق باؤ.... اب تیرہو جا یہاں سے۔" کوچوان نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شارق تقریباً دوڑتا ہوا طویلہ کے پھاٹک کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ گلی میں

موٹروں کی ورکشاپس پر کام ہو رہا تھا۔ وہ پھاٹک سے نکل کر مخالف سمت میں چلنے لگا۔ تقریباً پچاس گز آگے بائیں طرف کی ایک تنگ سی گلی میں گھوم رہا تھا کہ ورکشاپس والی گلی کے دوسری طرف پولیس کا ایک ٹرک گلی میں داخل ہوتا نظر آیا۔ شارق تیزی سے گلی میں مڑ گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دوسری گلی میں گھوم کر چوک پر نکل آیا۔ اس نے چوک پر بھی رکنے کی حماقت نہیں کی بلکہ ایک رکشے میں بیٹھ کر چوبرجی کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس وقت وہ بال بال بچا تھا۔ اگر وہ لڑکا آ کر پولیس کی آمد کی اطلاع نہ دیتا تو شارق اس وقت پولیس کے ہاتھ لگ چکا ہوتا!

شارق نے چوبرجی چوک پر رکشہ چھوڑ دیا۔ ٹہلتے ہوئے انداز میں ایک دو دکانوں سے کچھ چیزیں خریدیں اور شام نگر میں اپنے کرائے کے مکان میں آ گیا۔ اس وقت گلی میں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ انہوں نے شارق کو مکان کا دروازہ کھولتے ہوئے دیکھا ضرور تھا مگر اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

شارق کئی روز بعد یہاں آیا تھا۔ فرنیچر پر گرد کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس نے بستر کی چادر اٹھا کر جھاڑی اور ایک میلا کپڑا لے کر فرنیچر اور دیگر چیزوں کی صفائی کرنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے چائے بنائی اور کپ لے کر لاؤنج میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ ایک بار پھر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔

رات آٹھ بجے وہ اس مکان سے نکلا اور لکشمی چوک پہنچ گیا۔ لکشمی کی رونق اس وقت عروج پر تھی۔ تکا کباب، کڑاہی گوشت اور بالٹی گوشت جیسی کھانے پینے کی دکانوں کے سامنے دور دور تک میز کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ زندہ دلان لاہور ناؤ و نوش میں مصروف تھے۔ بیشتر سینما ہال لکشمی چوک سے ملحق ایبٹ روڈ اور میکلوڈ روڈ پر تھے اور بہت سی فلم کمپنیوں کے دفتر بھی لکشمی چوک پر ہی تھے۔ فلمی ہیرو بننے کے شوقین نوجوان عجیب و غریب حلیے بنائے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے کہ شاید ادھر سے گزرتے ہوئے کسی ہدایت کار یا فلمساز کی نظروں میں آ جائیں۔

شارق نے رکشہ لکشمی چوک پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں پر کھڑا رہا اور پھر ٹہلتا ہوا نسبت روڈ کی طرف چل دیا۔ تقریباً دو سو گز آگے بائیں طرف ایک موٹر ورکشاپ تھا۔ اس وقت نو بج چکے تھے۔ ورکشاپ کا بڑا پھاٹک بند تھا البتہ چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر کمپاؤنڈ میں بلب کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ورکشاپ کے باہر بھی دو تین گاڑیوں کے ڈھانچے پڑے ہوئے تھے۔

شارق چھوٹے دروازے سے ورکشاپ میں داخل ہو گیا مگر اس نے ابھی دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ ایک لمبا تڑنگا آدمی نجانے کہاں سے نکل کر سامنے آ گیا۔

"کیا بات ہے باؤ جی، ورکشاپ بند ہو چکا ہے۔" اس آدمی نے شارق کو گھورتے ہوئے کہا۔

اس کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ کسرتی جسم اور بڑی بڑی مونچھیں، سر پر پولکا ڈاٹس والا سلکی مفلر لپٹا ہوا تھا۔ یہ مفلر لنڈا بازار میں دو دو روپے میں عام مل جاتے تھے۔ شارق نے اکثر تانگے، ٹھیلے والوں، چھابڑی والوں اور دادا گیری کرنے والے تھرڈ ریٹ غنڈوں کو اس قسم کے مفلر سروں پر لپیٹے دیکھا تھا۔

"مجھے چھانگے سے ملنا ہے۔ وہ یہاں آیا ہوا ہے۔" شارق نے جواب دیا۔

"کون چھانگا؟ یہاں تو کوئی چھانگا نہیں ہے۔ یہ ورکشاپ ہے باؤ جی کوئی گھر تو نہیں ہے نا جو آپ کسی سے ملنے آئے ہو۔" اس شخص نے کہا۔

"تم مجھے نہیں جانتے۔" شارق نے اسے گھورا۔ "اگر تم چھانگا کو نہیں جانتے تو ماجھے گجر کو جا کر بتاؤ کہ شارق آیا ہے۔"

"شارق....!" وہ شخص اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "نام تو سنا ہوا لگ رہا ہے۔ آؤ میرے ساتھ..... مگر ایک منٹ رک جاؤ۔" وہ شخص شارق کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس کے لباس کو دونوں ہاتھوں سے تھپتھپانے لگا اور پھر اس نے شارق کی جیب سے پستول نکال لیا۔

"یہ تمہیں واپس مل جائے گا۔" اس نے پستول اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

خاصا لمبا چوڑا ورکشاپ تھا۔ کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ تمام مرمت طلب گاڑیاں تھیں جو لوگ یہاں چھوڑ گئے تھے۔ کمپاؤنڈ کے آخر میں تین کمرے تھے۔ ایک کمرہ اسٹور روم تھا جہاں کام میں استعمال ہونے والے اوزار اور ریکس میں کچھ اسپیئر پارٹس سجے ہوئے تھے۔ دوسرا کمرہ ورکشاپ کے مینیجر کا تھا اور تیسرا کمرہ ڈریسنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں ورکشاپ میں کام کرنے والے کاریگر اور مکینک وغیرہ لباس تبدیل کرتے تھے اور دوپہر کا کھانا بھی اسی کمرے میں بیٹھ کر کھاتے تھے۔

وہ آدمی شارق کو لے کر دفتر والے کمرے میں آ گیا جہاں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ میز پر بعض دیگر چیزوں کے علاوہ ٹیلی فون بھی رکھا ہوا تھا۔ دیواروں پر مختلف ماڈل کی خوبصورت کاروں کے بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ آہنی الماری ایستادہ تھی۔

شارق الماری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ چھانگا کے ساتھ دو مرتبہ یہاں آ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس دفتر کے نیچے ایک وسیع تہہ خانہ تھا اور اسے اس تہہ خانے کا راستہ بھی معلوم تھا۔ وہ لمبے تڑنگے آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے فون کا ریسیور اٹھا لیا تھا اور سات کا ہندسہ ڈائل کر رہا تھا۔

یہ ورکشاپ ماجھا گجر کا تھا۔ اس کا تعلق بنیادی طور پر دودھ بیچنے والے خاندان سے تھا۔ کئی

سال پہلے اس احاطے میں اس کا بھینسوں کا باڑہ ہوا کرتا تھا۔ ماجھا گجر اپنے بیٹے کو پڑھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا مگر اس نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا۔ بیٹے کی دلچسپی دیکھتے ہوئے ماجھا گجر نے اسے موٹروں کے ایک ورکشاپ میں ڈال دیا۔ وہ کئی سال تک ایک مشہور کمپنی کے ورکشاپ میں کام سیکھتا رہا اور بالآخر اس کا شمار شہر کے چند ایسے گنے چنے مکینکس میں ہونے لگا جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ مردہ انجن میں بھی جان ڈال دیتے ہیں۔

اس دوران ماجھا گجر کے تعلقات کچھ ایسے لوگوں سے ہو گئے جو منشیات کا بزنس کرتے تھے۔ ماجھا گجر کے پاس اگرچہ پیسے کی کمی نہیں تھی لیکن دولت کے لالچ نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور وہ باڑے میں دودھ کے ساتھ منشیات بھی بیچنے لگا۔

کئی سال بعد جب اس کے بیٹے نے کہا کہ وہ اپنا ذاتی ورکشاپ کھولنا چاہتا ہے تو ماجھا گجر کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ موٹر ورکشاپ کے لئے یہ بہترین جگہ تھی۔ چھانگا کے مشورے سے اس نے تمام بھینسیں گاؤں کے باڑے میں منتقل کر دیں اور یہاں ورکشاپ بنانے کی تیاری شروع ہو گئی۔ ماجھا گجر اور چھانگا میں بڑی گہری دوستی تھی۔ دفتر کی عمارت کے نیچے یہ تہہ خانہ چھانگا نے اپنی نگرانی میں بنوایا تھا۔

جب ماجھا گجر کے بیٹے نے یہاں اپنا ورکشاپ شروع کیا تو اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ماجھے گجر نے بھی یہاں اپنا بزنس شروع کر دیا۔ ورکشاپ چھ بجے بند ہو جاتا تھا اس کے بعد ماجھا گجر کا بزنس شروع ہو جاتا جو آدھی رات تک جاری رہتا۔

کل رات باغبانپورہ میں رونما ہونے والے واقعہ کے بعد پولیس نے اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے منشیات فروشوں کے مختلف اڈوں پر چھاپے مارنا شروع کر دیئے تھے۔ اگر شاکر قتل نہ ہوتا تو شاید پولیس اتنی سرگرم نہ ہوتی۔ ان چھاپوں سے بچنے کے لئے شہر کے تقریباً تمام ہی بڑے منشیات فروشوں نے وقتی طور پر اپنے اڈے بند کر دیئے تھے اور خود ادھر ادھر چلے گئے تھے۔

ماجھے گجر کا یہ اڈہ بھی اگرچہ پولیس کی نظروں میں تھا مگر اس پر کبھی چھاپہ نہیں پڑا تھا۔ چھانگا اس اڈے کو محفوظ سمجھ کر ہی یہاں چلا آیا تھا۔ شارق اچھی طرح جانتا تھا کہ پولیس کی سرگرمیاں ایک دو روز سے آگے نہیں بڑھیں گی۔ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو موت کے ان سوداگروں کا کام پھر شروع ہو جائے گا۔

شارق مڑ کر اس لمبے تڑنگے آدمی کی طرف دیکھنے لگا جو فون پر کہہ رہا تھا۔

"وہ آیا ہے جی.... کیا نام ہے اس کا شارق باؤ.... ہاں جی.... ہاں جی.... اچھا جی.... میں ابھی بھیج دیتا ہوں جی۔" اس نے ریسیور رکھ دیا اور سامنے والی دیوار کے قریب آہنی الماری کے سامنے

ہو گیا۔ اس نے الماری کھولی۔ اس کے ایک خانے میں رسید بکیں' ایک خانے میں کچھ فائلیں باقی خانوں میں بعض گاڑیوں کے قیمتی اسپیئر پارٹس کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ اس شخص نے ی کا تجوری والا خانہ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا اور اس کے آخر میں لگی ہوئی ایک کیل کو ٹٹول کر ی طرف کھینچا اور ہاتھ باہر نکال لیا۔ دوسرے ہی لمحہ الماری اپنی جگہ پر گھوم گئی۔

الماری کے گھوم جانے سے فرش میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا۔ اس خلا کے اندر تنگ سی یاں تھیں اور سیڑھیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔

"جاؤ جی.... شارق باؤ جی۔" اس شخص نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"میرا پستول۔" شارق نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس شخص نے جیب سے پستول نکال کر شارق کے ہاتھ میں تھما دیا۔ شارق نے پستول پتلون جیب میں ٹھونسا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے اوپر دیکھا۔ الماری جگہ پر آ گئی تھی اور فرش کا وہ خلا بند ہو چکا تھا۔

تہہ خانہ خاصا وسیع تھا۔ اس میں تین چار کمرے تھے۔ شارق نے آخری سیڑھی سے نیچے رکھا ہی تھا کہ دائیں طرف دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر نکل کر شارق کی دیکھنے لگا۔ اس نے شارق کو اشارہ کیا' شارق اسی طرف بڑھ گیا۔

کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور قیمتی ے تھے۔ درمیان میں ایک کافی ٹیبل رکھی ہوئی تھی اور اس میز پر شراب کی دو بوتلیں اور چار ں نظر آ رہے تھے۔ دونوں بوتلیں آدھی آدھی تھیں اور گلاسوں میں بھی تھوڑی تھوڑی ب موجود تھی۔ کمرے میں آدمی بھی چار ہی تھے۔ ایک وہ جس نے دروازہ کھولا تھا۔ دوسرا تیسرا ماجھا گجر اور چوتھے کا نام اکبر تھا جو عام طور پر اکو کے نام سے مشہور تھا۔ وہ گڑھی شاہو عاش تھا اور اپنے علاقے میں منشیات کا سب سے بڑا بیوپاری وہی تھا۔ شارق ایک مرتبہ پہلے چھانگا کے ساتھ اس سے مل چکا تھا۔

"آؤ شارق باؤ.... بڑی عمر ہے تمہاری۔" ماجھا گجر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی دیر پہلے تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ چھانگے کو فکر تھی کہ کہیں تم دھوکے میں پولیس کے ہتھے جاؤ۔"

"شارق اب اتنا کمزور نہیں رہا کہ پولیس اس پر ہاتھ ڈال سکے۔" شارق نے صوفے پر بیٹھتے کہا۔ "چند مہینے پہلے شارق واقعی بہت کمزور تھا۔ پولیس کے لئے ایک کھلونا تھا۔ لیکن اب ے پیچھے آپ جیسے لوگوں کی طاقت ہے۔"

"او خوش کیتا ای شارق باؤ۔" ماجھا گجر بولا۔ "ہو جائے اسی خوشی میں ایک....."

"نہیں۔" شارق نے ہاتھ اٹھا دیا۔ "میں شراب نہیں پیتا۔ ایسی چیزوں سے دور ہی رہتا ہوں۔ آپ لوگ اپنا شغل جاری رکھیں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی نا شارق باؤ۔" ماجھے گجر نے اٹھلا کر کہا۔

"مجھے مجبور نہ کرو بھائی۔" شارق نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا پھر چھانگا کی طرف ہوئے بولا۔ "کل رات کیا ہوا تھا؟ میں آج دوپہر اڈے پر گیا تھا۔ مجھے شوکے نے بتایا تھا۔ وقت پولیس نے بھی چھاپہ مارا تھا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ چند سیکنڈ پہلے ہی مجھے پولیس کی اطلاع مل گئی تھی اور میں وہاں سے نکل گیا تھا۔"

"کیا بتاؤں شارق باؤ۔" چھانگا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "بات کچھ سمجھ میں آئی۔ نکے پہلوان سے برسوں سے لین دین ہے۔ پہلے کبھی کوئی ایسی بات ہوئی نہیں تھی۔"

"کیا تمہارے خیال میں رقم چھیننے کے لئے جیرے اور شاکر پر حملہ نکے پہلوان کے آدمی نے کیا ہو گا؟" شارق نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"ویسے شک تو اسی پر ہے کیونکہ وہ آج کل رقم کے معاملے میں کچھ ٹوٹا ہوا ہے۔ ڈیڑھ تو ماجھے گجر کا نکلتا ہے اس کی طرف۔ دو مہینے ہو گئے وہ دینے کا نام ہی نہیں لیتا۔ چند روز پہلے اسی لئے اس کی طرف گیا تھا کہ اس کو سمجھا سکوں کہ اگر یکمشت ادائیگی نہیں کر سکتا تو تھوڑی کر کے اس کی رقم دے دے۔ ہم بھی تو پشاور والوں کو نقد ادائیگی کر کے مال اٹھاتے وہ تو ہمارے ساتھ ایک روپے کا ادھار نہیں کرتے۔ نکے پہلوان پر شک کی دوسری وجہ یہ وہ غائب ہو گیا ہے اور اس نے ابھی تک ہم میں سے کسی سے رابطہ نہیں کیا۔"

"رابطہ نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ پولیس کے خوف سے کہیں چھپا ہو۔" شارق نے کہا۔ "جیسے تم لوگ یہاں چھپے بیٹھے ہو۔"

"وہ دوسرے طریقے سے بھی ہم سے رابطہ قائم کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ کا مطلب ہے کہ اس کے دل میں چور ہے۔" ماجھا گجر نے کہا۔

"کیا جیرا ایسا نہیں کر سکتا۔" شارق بولا۔ "میرا مطلب ہے اس نے کسی اور کے ساتھ یہ سازی پلاننگ کی ہو۔"

"نہیں' شارق باؤ۔" چھانگا نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ میرے ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے۔ لا روپے اس کی تحویل میں رہے ہیں کبھی اس نے ایک پائی کا ہیر پھیر نہیں کیا۔ وہ ایسا کر سکتا۔"

"تو تمہارا شک نکے پر ہی ہے۔" شارق بولا۔

"نکا پہلوان سامنے آئے تو معاملے کی کچھ وضاحت ہو۔" چھانگا نے جواب دیا۔

"جیرے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" شارق نے پوچھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ پہلے ہمیں درمیان کے ایک آدمی کے ذریعے پولیس کا پیغام ملا ہے۔" چھانگا واب دیا۔ "ان کا پانچ لاکھ کا مطالبہ ہے۔"

"کمال ہے۔" شارق بولا۔ "آدمی بھی ہمارا مارا گیا۔ پکڑا بھی ہمارا آدمی گیا اور پانچ لاکھ کا بھی ہم سے۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے شارق باؤ۔" چھانگا نے کہا۔ "تمہیں تو خود اس کا تجربہ ہے۔ عمر قید کی سزا کر آئے ہو اور اس کے بعد بھی تمہارے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے تم جانتے ہو۔ اگر یہ والے ایسا نہ کریں تو ان کی جائیدادیں کہاں سے بنیں؟ ان کی اولادیں ولایت اور امریکہ کے ں میں کیسے تعلیم حاصل کریں۔ ان کی عورتیں زیورات سے کیسے لدی پھندی رہیں۔ وہ اور ماڈل ٹاؤن کی شاندار کوٹھیوں میں کیسے رہیں۔ قیمتی اور چم چماتی کاروں میں کیسے ؟ دیر میرے! پولیس میں لوگ قوم کی خدمت کے لئے نہیں آتے۔ یہ تو پیسہ بنانے آتے ہ..... اور پیسہ بنانے کے طریقے ان کو آتے ہیں۔"

"تو کیا تم پانچ لاکھ دے دو گے؟" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پانچ لاکھ کا مطالبہ دونوں پارٹیوں سے ہے۔" چھانگا نے کہا۔ "ڈھائی لاکھ مجھ سے اور ڈھائی ئے پہلوان سے۔ اسی لئے تو ہم چاہتے ہیں کہ نکے پہلوان سے رابطہ ہو تو اس سے بات کی

اگر وہ پہلے ہی پھانک ہو رہا ہے تو ڈھائی لاکھ کہاں سے دے گا؟" شارق بولا۔

سے کہیں نہ کہیں سے تو یہ بندوبست کرنا ہی پڑے گا ورنہ اس کا بندہ بھی ایسا پکڑا گیا ہے کے اندر باہر کے سارے راز جانتا ہے۔ اگر نکے پہلوان نے اپنے اس بندے کو نہ چھڑایا تو ں نہیں بچ سکے گا۔"

وہ لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ماجھے گجر نے ریسیور اٹھا لیا۔ وہ نکے کی کال تھی۔ اس نے فون کا ریسیور چھانگے کی طرف بڑھا دیا۔ چھانگا تقریباً دس منٹ تک باتیں کرتا رہا آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے' ہم آ رہے ہیں۔ ایک گھنٹہ تو لگ جائے گا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا اور باری کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "چلو بھئی دوستو۔ وہ حاجی لنگے کے گھر ہمارا انتظار

کر رہا ہے۔"

"بات کیا ہوئی اس سے؟" اکو بدمعاش نے پوچھا۔

"بات تو وہیں چل کر ہو گی۔" چھانگا کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ سب لوگ کمرے سے نکل آئے۔ چند منٹ بعد وہ اوپر دفتر والے کمرے میں موجود اور پھر وہ دفتر سے نکل کر کمپاؤنڈ میں کھڑی ہوئی گاڑیوں کے گرد گھومتے ہوئے گیٹ کے قر کھڑی ہوئی ایک سفید کار کے قریب رک گئے۔ اسی دوران لمبا تڑنگا آدمی بھی کہیں سے نکل سامنے آگیا۔

"گیٹ کھول اوئے!" ماجھا گجر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' پھر اس شخص سے مخاط ہوا جس نے تہہ خانے میں شارق کا استقبال کیا تھا۔ "جیلے پتر! تو آج آرام کر..... ہم یہاں وا نہیں آئیں گے۔"

"اچھا جی!" جیلے نے مختصر سا جواب دیا۔

ماجھا گجر کار کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ چھانگا اس کے ساتھ والی سیٹ بیٹھا تھا۔ شارق اور اکو بدمعاش پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ بھاری مونچھوں والے لمبے تڑنگے آدمی گیٹ کھول دیا۔ ماجھے گجر نے انجن اسٹارٹ کر کے ریورس میں گاڑی کو گیٹ سے نکالا اور سڑک آتے ہی اس کا رخ لکشمی چوک کی طرف موڑ دیا۔

ساڑھے دس بجے تھے۔ لکشمی چوک کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ماجھے گجر نے گاڑ ایبٹ روڈ پر موڑ دی۔ اس سڑک پر دونوں طرف لاتعداد سینما ہاؤس تھے۔ پورا علاقہ رنگ برنگ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ بیشتر سینماؤں کے انٹرول ہوئے تھے۔ سڑک پر مرغ چھولے' نان کباب اور ایسی ہی چیزیں بیچنے والے ٹھیلوں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ کار ایبٹ روڈ سے نکل کر شملہ پہاڑ کے گرد گھومتی ہوئی کانونٹ اسکول کے سامنے سے ہوتی ہوئی گڑھی شاہو کے پل کی طرف نکل اور جی ٹی روڈ پر دائیں سمت باغبانپورہ کی طرف مڑ گئی۔

حاجی لنگے کا مکان داروغہ والا میں تھا۔ باغبانپورہ اور شالامار باغ کے سامنے سے ہوتے ہو کار تیز رفتاری سے جی ٹی روڈ پر دوڑتی رہی اور بالآخر اس کی رفتار کم ہو گئی۔ بائیں طرف سڑ سے ذرا ہٹ کر وسیع و عریض کوٹھیاں تھیں۔

"دھیان رکھنا یار۔" ماجھا گجر نے چھانگا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہیں ہم آگے ہی نکل جائیں۔"

"کوٹھی ابھی آگے ہے۔" چھانگا نے جواب دیا اور کوٹھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ بعض کوٹھ

ی گیٹوں پر بلب جل رہے تھے اور بعض تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ "بس..... وہ آگے والی ٹھی ہے۔" چھانگا نے اشارہ کیا۔

ماجھے گجر نے کار کوٹھی کے گیٹ کی طرف موڑ دی اور ساتھ ہی ہارن بجا دیا۔ کار گیٹ کے ے رکی' ایک آدمی نے چھوٹے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا اور پھر گیٹ کھول دیا۔ ماجھا ر کار کو اندر لیتا چلا گیا۔

بہت بڑی کوٹھی تھی۔ وسیع و عریض لان تھا جس میں تین چار جگہ پولز پر فینسی شیڈز والی ں جل رہی تھیں۔ پورچ میں دو گاڑیاں پہلے ہی سے کھڑی تھیں۔ ماجھا گجر نے اپنی کار ان کے ے روک کر انجن بند کر دیا۔ ٹھیک اسی لمحے حاجی لنگے کا ایک نوکر برآمدے میں نمودار ہوا۔ یہ کار سے اترے تو نوکر انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ بہت وسیع اور عالی شان ڈرائنگ م تھا۔ سامنے ہی صوفوں پر نکا پہلوان اور حاجی لنگا بیٹھے ہوئے تھے۔

حاجی لنگا کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ چھوٹی سفید داڑھی؛ درمیانہ قد اور قدرے ی بھرکم جسم۔ اسے دیکھ کر کسی نیک آدمی کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا لیکن حاجی لنگا کا شمار ایسے ں میں ہوتا تھا جو ملک کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھے۔ وہ اسمگلر تھا' اناج' گھی' تیل اور دیگر ائے خورد و نوش اور سونا بڑی مقدار میں بھارت اسمگل کرتا تھا۔ ایک مرتبہ سرحدی محافظوں تصادم ہو گیا تھا۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی وہ فرار ہونے میں کامیاب تو ہو گیا تھا مگر اس ٹانگ کو روگ لگ گیا تھا۔ ٹانگ کا زخم ٹھیک ہونے کے بعد وہ لنگڑا کر چلنے لگا تھا۔ اسی اہٹ کی وجہ سے وہ حاجی لنگا کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

نکا پہلوان اور حاجی لنگا نے اٹھ کر ان لوگوں کا استقبال کیا۔

"اوئے یہ کیا حرکت کی ہے تم نے؟" چھانگے نے نکا پہلوان کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر ں پیسوں کی ضرورت تھی تو مجھے کہتا۔ دو لاکھ..... چار لاکھ..... دس لاکھ..... جتنی رقم چاہئے تھی سے لے لیتا۔ لیکن یہ تم نے بہت بری حرکت کی ہے۔ میرا ایک بندہ مروا دیا اور دوسرے کو کروا دیا۔ تو تو بڑا یار مار نکلا اوئے نکے پہلوان...."

"میں نے کچھ نہیں کیا چھانگے۔" نکا پہلوان نے جواب دیا۔ "اور تمہارا بندہ بھی تمہارے ے ہی کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ یہ شکر کرو کہ میرے آدمی نے شاکر کے قتل کے سلسلے میں ابھی ے کا نام نہیں لیا ورنہ اس کے خلاف قتل کا پرچہ کٹ چکا ہوتا۔"

چھانگے کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ چند لمحے عجیب سی نظروں سے نکا پہلوان کی طرف دیکھتا رہا پھر

"پھر وہ کون تھا جس نے میرے آدمیوں پر حملہ کر کے رقم چھینی تھی؟"

"اگر یہ معلوم ہوتا تو ہمارے آدمی اندر نہ ہوتے۔" نکا پہلوان نے جواب دیا۔

ان دونوں میں دیر تک گلے شکوے ہوتے رہے اور بالآخر چھانگے کو یقین ہو گیا کہ جیرا سے رقم چھیننے کے لئے حملہ نکا پہلوان کے کسی آدمی نے نہیں کیا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ پولیس نے ان دونوں کے لئے پانچ لاکھ مانگے ہیں؟" چانگا نے کہا۔

"ہاں.... مجھے حاجی کے ذریعے یہ پیغام مل گیا ہے۔" نکا پہلوان نے جواب دیا۔ "ان دونو باہر لانے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ ہم دونوں تباہ ہو جائیں پولیس ان سے ہمارے بارے میں ایک ایک بات اگلوا لے گی۔"

"پھر تو ڈھائی لاکھ کہاں سے دے گا؟" چھانگا نے اسے گھورا۔

"یہ رقم حاجی مجھے قرض دے گا۔" نکا پہلوان نے کہتے ہوئے حاجی کی طرف دیکھا۔

"نکا پہلوان آج کل اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کر سکے۔" لنگے نے کہا۔ "اس کی طرف سے رقم میں دے دوں گا۔ بعد میں اس سے رقم وصول کر لو تم اگر تیار ہو تو میں انسپکٹر کو یہیں پر بلوا لوں تاکہ یہ معاملہ ختم ہو جائے۔"

"رقم کا بندوبست تو کل ہی ہو گا۔ اس وقت کہاں سے آئے گی اتنی بڑی رقم۔" چھانگا جواب دیا۔

"رقم کا بندوبست تو کل ہی ہو گا لیکن اس وقت معاملہ تو طے ہو جائے۔" حاجی نے کہا۔

"ٹھیک ہے' بلا لو اسے۔ یہ قصہ بھی ختم ہو ہی جائے۔" چھانگا نے جواب دیا۔

حاجی لنگا فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھ تقریباً پندرہ منٹ تک فون پر بات کرتا رہا پھر ریسیور رکھ دیا اور باری باری ان کی طرف ہوئے بولا۔

"وہ آ رہا ہے' ذرا احتیاط سے بات کرنی ہو گی۔ ایسا نہ ہو کہ بنا بنایا معاملہ بگڑ جائے۔ نکے...." وہ نکا پہلوان کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم یہی کہو گے کہ اس رات تم اپنے اڈے پر نہیں تھے۔ باقی معاملہ میں سنبھال لوں گا اور چھانگے تم..." اب وہ چھانگے کی طرف گھوم گیا۔ مقتول شاکر سے تم اپنا کوئی تعلق ظاہر نہیں کرو گے۔"

"ٹھیک ہے۔ جس طرح تم کہتے ہو ویسا ہی ہو گا۔" چھانگے نے جواب دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ایک پولیس آفیسر پہنچ گیا۔ وہ وردی میں تھا اور اکیلا ہی تھا۔ آدھے گھنٹے تک ان میں گرما گرم بحث ہوتی رہی۔

"تم لوگوں کو اندازہ نہیں کہ ہم پر کتنا دباؤ پڑ رہا ہے۔" پولیس آفیسر کہہ رہا تھا۔ "اخبارات پر کھل کر الزام لگا رہے ہیں کہ ہم جرائم پیشہ لوگوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ ہم نے تم لوگوں کو ناجائز دھندوں کی چھوٹ دے رکھی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم لوگ قتل غارت کرتے پھرو۔ ارے خدا کے بندو' خاموشی سے اپنا کام کرتے رہو اور ہمیں بھی نوکری کرنے دو۔"

"پہلے کبھی ایسا ہوا ہے۔" چھانگے نے کہا۔ "یہ حرکت ہمارے آدمیوں نے نہیں کی وہ کوئی اور کا آدمی تھا۔"

"اب چھوڑو ان باتوں کو۔" حاجی لنگا نے کہا۔ "ان کے بندے کب چھوڑ رہے ہو؟"

"ان کے بندے کل صبح سویرے چھوڑ دیئے جائیں گے لیکن...." پولیس آفیسر خاموش ہو کر کسی کی طرف دیکھنے لگا۔

"رقم تمہیں کل شام سے پہلے پہلے مل جائے گی۔ یہ میری ذمے داری ہے۔" حاجی نے کہا۔

"دیکھ لو حاجی۔" پولیس آفیسر بولا۔

"کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔" حاجی لنگا نے کہا۔ "لیکن تمہیں بھی اس بات کی ضمانت دینا ہو گی کہ ان دونوں کے خلاف بعد میں بھی کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔"

"ابھی تک اس واقعہ کی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی اس لئے ان کے خلاف کسی کارروائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ "کم از کم اس کیس میں تو ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔ یہ میرا وعدہ ہے لیکن اگر انہوں نے کوئی اور حرکت کی تو ایسی صورت میں....."

"اب تمہیں شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" حاجی لنگا نے اس کی بات کاٹ دی۔

شارق خاموش بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ لوگ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ پولیس جرائم پیشہ لوگوں کی سرپرستی کرتی ہے۔ یہاں معاملہ ایک قتل کا تھا۔ وہ مقتول کو بھی جانتا تھا اور قاتل کو بھی۔ یہ معاملہ کس قدر آسانی سے طے ہو گیا تھا۔ پولیس آفیسر کی مٹھی گرم کر دی گئی تھی اور وہ اس سارے معاملے کو فراموش کر دینے کو تیار ہو گیا تھا۔ شارق جانتا تھا کہ خانہ پری کے لئے کسی بے گناہ کو پکڑ کر قاتل کی حیثیت سے عدالت کے سامنے پیش کر دیا جائے گا اور اس کے خلاف استغاثہ کا کیس اتنا مضبوط ہو گا کہ وہ بیچارہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ اسے یا تو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جائے گا یا زندگی بھر کے لئے آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جائے گا۔

معاملہ طے ہو جانے کے بعد جب وہ لوگ وہاں سے نکلے تو ایک بج چکا تھا۔ پولیس آفیسران

سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ ماجھا گجر نے شارق اور چھانگا کو مزنگ چوک پر اتار دیا اور اکو بدمعاش کو ساتھ لے کر اچھرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

"شارق باؤ!" چھانگا نے اپنے طویلہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "اس مہمان کا کیا کرنا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اسے ختم کر کے کہیں پھینک دیں۔"

"چلو دیکھتے ہیں اسے بھی۔" شارق نے جواب دیا۔

طویلے میں اس وقت دو آدمی تھے۔ چھانگا شارق کو لے کر مزار کے تہہ خانے میں آ ڈی ایس پی ستون سے بندھا ہوا تھا۔ اس کا سر سینے پر جھکا ہوا تھا۔ شارق نے بالوں سے پکڑ اس کا سر اوپر اٹھایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چونک گیا۔ اس نے ڈی ایس پی کے سینے پر ہاتھ نبض ٹٹول کر دیکھی' پھر سیدھا ہو کر چھانگا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ تو ختم ہو چکا ہے!"

"چلو اچھا ہوا۔" چھانگا نے جواب دیا۔ "خس کم جہاں پاک۔ اس کی لاش کو بوری میں کر ابھی باہر پھنکوا دینی چاہئے۔ وہ کالی بوری پڑی ہے۔ تم اس کی لاش کو بوری میں ڈالو میں او کر تانگہ تیار کرواتا ہوں۔"

چھانگا اوپر جانے کے لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ شارق نے رسیاں کھول کر لاش کو کر ایک طرف ہٹایا اور پھر اسے بوری میں ٹھونسنے لگا۔ اس نے لاش کو بوری میں ڈال کر اس منہ سُتلی سے باندھ دیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد چھانگا واپس آ گیا۔ وہ دونوں بوری اٹھا کر تہہ خا سے باہر آ گئے۔

چھانگے کا آدمی تانگہ تیار کر چکا تھا۔ شارق نے بوری سیٹوں کے نیچے ٹھونس دی۔ یعقو نامی کوچوان نے اس کے آگے گھوڑے کے دانے والی بوری اور پٹھے اس طرح رکھ دیئے کہ لا کی بوری چھپ گئی۔ یعقوب نے اپنی سیٹ سنبھال لی اور شارق پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

تانگہ گلی سے نکل کر مین روڈ پر آنے کے بجائے چھوٹی سڑکوں پر چلتا رہا۔ وہاں سے تق ایک میل کے فاصلے پر ایک بہت بڑا چھپڑ تھا۔ شارق کا خیال تھا کہ وہ لاش والی بوری کو چھپڑ کنارے پر پھینک کر آ جائیں گے۔

انہوں نے تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ آگے ایک چھوٹا سا چوک تھا۔ تانگہ چو پر پہنچا ہی تھا کہ دو پولیس والے اچانک ہی کہیں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں۔ وہ دونوں سڑک کے بیچ میں آ کر تانگے کو رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ شا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یعقوب نے تانگہ روک لیا۔ شارق اپنی سیٹ پر بے حس و حر

بیٹھا پولیس والوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی تھی۔

○

"اوئے!" ایک پولیس والا قریب آتے ہوئے بولا۔ "کون ہو تم؟ کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

"خیر ہو سنتری بادشاہ کی۔" کوچوان یعقوب نے کہا۔ "ٹیشن جا رہے ہیں سنتری بادشاہ۔"

"اوئے یہ ٹیشن کا راستہ ہے؟" کانسٹیبل بولا۔ "تم تو دوسری طرف جا رہے ہو۔"

"یہ باؤ مجھے چوک سے لے کر آیا ہے جی' گھر سے سامان اور سواریاں لینی ہیں۔" یعقوب نے جواب دیا۔

"اور یہ نیچے کیا بھرا ہوا ہے؟" دوسرا کانسٹیبل سیٹ کے نیچے جھانکنے لگا۔

"گھوڑی کے لئے بوری میں دانا اور پھٹے ہیں جی۔" یعقوب نے کہا۔

شارق کے دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی۔ وہ کن انکھیوں سے اس کانسٹیبل کی طرف دیکھ رہا تھا جو آگے ہی رکھی ہوئی دانے کی بوری کو ٹٹول رہا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر اس کانسٹیبل نے ہاتھ مزید آگے بڑھا کر دوسری بوری کو ٹٹول لیا تو وہ دونوں بچ نہیں سکیں گے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ فرار کے امکانات کا جائزہ لینے لگا۔

"تم بھی تو کچھ بولو باؤ' کہاں جانا ہے؟" کانسٹیبل نے شارق کو گھورا۔

"ساڑھے چار بجے والی ٹرین سے جانا ہے۔ تم لوگ ہمارا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔" شارق نے کہا۔

"ہمیں تھانے کے سامنے اتار دو پھر جہاں مرضی چلے جانا۔" وہ کانسٹیبل کہتے ہوئے شارق کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دوسرا کانسٹیبل اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"ہمیں دیر ہو جائے گی سنتری بادشاہ۔ تم جانتے ہو اسٹیشن یہاں سے کتنی دور ہے۔" شارق نے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔

"ابھی تو تین بجے ہیں باؤ جی۔" کانسٹیبل کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہمارا تو پانچ منٹ کا راستہ ہے۔"

یعقوب نے شارق کی طرف دیکھا۔ شارق نے سر ہلا دیا۔

"چل یار پہلے انہیں چھوڑ دے۔" وہ بولا۔

تانگہ چوک پر دائیں طرف مڑ گیا۔ تھانہ وہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ شارق ت محتاط انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بہرحال یہ طے کر لیا تھا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو سب سے

پہلے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کانسٹیبل کی رائفل پر ہاتھ ڈالے گا۔

وہ ایک عجیب صورت حال سے دوچار تھا۔ سیٹوں کے نیچے ایک پولیس آفیسر کی لاش پڑی تھی اور تانگے میں اس کے ساتھ دو پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے۔ مزید ستم یہ کہ یہ تانگہ تھانے کی طرف جا رہا تھا.... اسے ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد تانگہ تھانے کے سامنے رکا۔ وہ دونوں پولیس والے نیچے اتر گئے اور شکریہ ادا کئے بغیر تھانے کے گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ یعقوب نے گھوڑی کو ہانک دیا۔ شارق کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ تھانے سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر دوسری سڑک پر گھومتے ہی یعقوب نے تانگہ روک لیا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔

"شارق باؤ!" وہ شارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میری مانو تو بوری کو یہیں پھینک کر جان چھڑاؤ اس سے۔"

"ٹھیک ہے' اس درخت کے نیچے پھینک دیتے ہیں۔" شارق کہتے ہوئے نیچے اتر آیا۔

انہوں نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیٹوں کے نیچے سے بوری نکالی اور اسے سڑک کے کنارے پیپل کے درخت کے نیچے ڈال دیا۔ تانگے کی طرف بڑھتے ہوئے شارق نے مڑ کر دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے بوری نے حرکت کی ہو لیکن وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر تیزی سے چلتا ہو تانگے پر سوار ہو گیا۔ یعقوب نے گھوڑی کو ہانک دیا۔

جب وہ طویلے میں واپس پہنچے تو پونے چار بج رہے تھے۔ چھانگا اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔

"پھینک آئے؟"

"ہاں' پھینک آئے۔ شارق نے اس کی قریب دری پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن بال بال بچ گئے۔ قسمت اچھی تھی بچ گئے ورنہ دھر لئے جاتے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر تفصیل سے راستے میں پیش آنے والے واقعہ کی تفصیل بتانے لگا۔

وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک باتیں کرتے رہے پھر وہیں لیٹ کر سو گئے۔ شارق جب بیدار ہوا دوپہر ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر حوض پر آ گیا۔ نلکے سے منہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو چھانگے سے سا ہو گیا۔ وہ مزار والے گنبد سے نکل رہا تھا۔

"جیرا آ گیا یا نہیں؟" شارق نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"جیرا تو آ گیا ہے شارق باؤ لیکن ایک اور عجیب خبر سنی ہے۔" چھانگا بولا۔

"کیسی خبر؟" شارق نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ ڈی ایس پی جسے تم مردہ سمجھ کر رات کو پھینک آئے تھے زندہ ہے۔" چھانگا بولا۔

"کیا؟" شارق اس طرح اچھلا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"ہاں' یہ درست ہے۔ چھانگا نے جواب دیا۔ "مجھے یہ اطلاع ایک گھنٹہ پہلے ملی ہے۔ صبح چھ بجے کسی راہ گیر نے سڑک کے کنارے درخت کے نیچے بوری پڑی دیکھ کر اسے کھولا تو اس میں ایک پولیس آفیسر کو دیکھ کر چونک گیا۔ پہلے تو وہ بھی اسے مردہ ہی سمجھا تھا مگر اس کے جسم میں حرکت دیکھ کر راہ گیر نے اسے بوری سے نکال لیا اور تھانے میں اطلاع کر دی۔ ڈی ایس پی اس وقت میو ہسپتال میں ہے۔ وہ زندہ ہے لیکن بے ہوش پڑا ہے۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ....."

"اس کی زندگی ہماری موت کا پیغام بن سکتی ہے۔" چھانگا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم فکر مت کرو چھانگا۔" شارق بولا۔ "وہ کوئی بیان دینے کے لئے زندہ نہیں رہے گا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"تمہیں یہ اطلاع کیسے ملی تھی؟"

"پورے شہر میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔" چھانگا نے جواب دیا۔ "پولیس کے محکمہ میں تو جیسے بھونچال آ گیا ہے۔ تم تو سو رہے تھے۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے علاقے کا انسپکٹر آیا تھا۔ وہ پوچھ گچھ کر کے گیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ فوری طور پر ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن بہتر ہو گا کہ آج کا دن ہم یہاں سے دور ہی رہیں۔" شارق نے کہا۔

"اس کے بعد کیا ہو گا؟" چھانگا نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جو کچھ بھی ہو گا تمہیں کل پتہ چل جائے گا۔" شارق نے کہا۔ "اچھا' میں جا رہا ہوں۔ کل رات ماجھے گجر کے ڈیرے پر ملاقات ہو گی۔"

چھانگا کے ڈیرے سے نکل کر شارق نے مزنگ چوک کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور وہاں سے سیدھا میو ہسپتال پہنچ گیا۔ اسے یہ معلوم کرنے میں دیر نہیں لگی کہ ڈی ایس پی کو ایک اسپیشل روم میں رکھا گیا تھا اور دروازے پر ایک مسلح سنتری موجود تھا۔ شارق چلتے چلتے سنتری کے پاس رک گیا۔

"کیوں سنتری بادشاہ۔ اس اسپیشل روم میں کوئی وزیر یا سرکاری افسر زیر علاج ہے جو تم یہاں پہرہ دے رہے ہو؟"

"نہیں، ہمارا ایک ڈی ایس پی ہے جسے کئی روز پہلے اغوا کیا گیا تھا۔ وہ لوگ اسے ادھ موا کر کے آج صبح ایک ویران سڑک پر پھینک گئے۔" کانسٹیبل نے کہا۔

"یہ جرائم پیشہ لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں۔" شارق نے کہا۔ "ڈی ایس پی نے بتایا نہیں کہ وہ کون لوگ تھے؟ پکڑے نہیں گئے؟"

"ڈی ایس پی صاحب کو جب سے یہاں لایا گیا ہے بے ہوش پڑے ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ زندہ نہیں بچ سکیں گے۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"ان کے گھر والے تو بہت پریشان ہوں گے۔" شارق بولا۔

"پریشانی کی تو بات ہے نا۔" کانسٹیبل نے کہا۔ "کسی کو ملنے بھی نہیں دیا جاتا۔ مل کر کریں گے بھی کیا۔ صاحب تو ہوش میں ہی نہیں ہیں۔"

"اچھا بھائی۔" شارق راہداری میں ایک ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر بولا اور مزید کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اگر ڈاکٹر اکیلا ہوتا تو وہ اس طرح کھسکنے کی کوشش نہ کرتا۔ ڈاکٹر کے پیچھے ایک انسپکٹر بھی چلا آ رہا تھا۔

شارق ہسپتال سے نکل کر ایک سرجیکل اسٹور پر آ گیا۔ یہاں اس نے ضرورت کی چند چیزیں خریدیں۔ ایک اور دوکان سے زیرو پوائنٹ کا چشمہ خریدا اور گھومتا ٹہلتا ہوا سہیل کے ریسٹورنٹ والے فلیٹ میں آ گیا۔

رات ایک بجے وہ سہیل کے فلیٹ سے نکل آیا۔ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا وہ ہسپتال روڈ پر آ گیا۔ میو ہسپتال کے گیٹ کی طرف اس وقت بھی رونق نظر آ رہی تھی۔ ایک دو چھوٹے ریسٹورنٹ اور چند میڈیکل اسٹور کھلے ہوئے تھے مگر شارق مین گیٹ کی طرف جانے کے بجائے ہسپتال روڈ کی طرف واقع چھوٹے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ اس طرف وسیع و عریض لان تھا۔ کچھ لوگ گھاس پر سو رہے تھے اور بعض لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا کوئی عزیز یا رشتہ دار علاج کے لئے ہسپتال میں داخل تھا۔

شارق دیوار کے ساتھ بائیں طرف مڑ گیا۔ دیوار کے ساتھ اندر کی طرف شیشم کے درخت تھے۔ وہ ایک درخت کے نیچے رک گیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھیلے میں سے سفید لیب کوٹ نکال لیا۔ سفید شیشے والی عینک آنکھوں پر لگائی اور اسٹیتھوسکوپ گردن پر لٹکا لیا۔ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا پھر مطمئن ہو کر پتلون کی جیب سے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکال لی۔ اس تھیلی میں نقلی ہٹلر کٹ مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے مونچھیں ہونٹ پر چپکا کر اسپرنگ ناک میں پھنسا لیا۔ خالی تھیلا درخت کے نیچے ایک طرف پھینک دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہسپتال کی عمارت کی طرف چلنے لگا۔

کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا یہ ہسپتال کئی بلاکس پر مشتمل ہے۔ شارق مختلف بلاکوں میں سے ہوتا ہوا اس بلاک میں آ گیا جس کے ایک حصے میں اسپیشل رومز تھے۔ شارق جلنے سے ایک ڈاکٹر ہی لگ رہا تھا۔ اس وقت رات کے پونے دو بج رہے تھے۔ ہسپتال کے تمام بلاکس پر گہرا سکوت طاری تھا۔ اسے اب تک صرف دو نرسیں ملی تھیں ان میں سے ایک نرس ایسی تھی جس نے گہری نظروں سے شارق کی طرف دیکھا تھا جبکہ دوسری نرس توجہ دیئے بغیر قریب سے گزر گئی تھی۔

شارق جب اسپیشل رومز والی راہداری میں پہنچا تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ ڈی ایس پی والے کمرے کے سامنے کرسی پر اس وقت ایک اور کانسٹیبل بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کی رائفل گھٹنوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ شارق نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ گڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ غیر ارادی طور پر پیشانی پر پہنچ گیا۔ دل کی دھڑکن بے قابو ہونے کے باوجود شارق کے ہونٹوں پر خفیف سی سکراہٹ تھی۔

"سٹاف نرس آئی تھی؟" شارق نے لہجے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"نن.... نہیں جناب۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"دروازہ کھولو۔" شارق نے کہا۔

"جی جناب۔" کانسٹیبل نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

شارق اندر داخل ہوا تو کانسٹیبل نے بھی اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہونا چاہا مگر شارق نے اسے روک دیا۔

"تم یہیں رکو۔ مریض ڈسٹرب ہو گا۔"

اندر داخل ہو کر شارق ایک لمحہ کو رکا۔ اس نے دروازہ بھیڑ دیا اور پھر بڑی احتیاط اور آہستگی سے دروازے کی کنڈی لگا دی اور بڑی تیزی سے بیڈ کے قریب پہنچ گیا۔ ڈی ایس پی کے لباس میں بیڈ پر پڑا تھا۔ وہ واقعی ہڈیوں کا ڈھانچہ لگ رہا تھا۔ بیڈ کے ساتھ ہی اسٹینڈ پر گلوکوز کی بوتل ٹنگی ہوئی تھی۔ گلوکوز ٹیوب کے ذریعے اس کے جسم میں منتقل ہو رہا تھا۔ شارق چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ڈی ایس پی کے بازو میں لگی ہوئی گلوکوز کی سوئی نکال دی۔ ٹیوب اسٹینڈ کے ساتھ جھولنے لگی۔ سوئی سے گلوکوز کے قطرے فرش پر ٹپکنے لگے۔

شارق نے سفید کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سرنج نکال لی۔ سوئی پر کیپ لگا ہوا تھا۔ اس نے کیپ اتار کر بستر پر ہی ڈال دیا اور سرنج کا پلنجر پیچھے کھینچ لیا۔ سرنج میں تقریباً دو سی سی پانی بھرا ہوا تھا۔ پلنجر پیچھے کھینچنے سے اس میں ہوا بھر گئی۔

شارق ڈی ایس پی پر جھک گیا۔ اس کا بازو بالکل ایسا تھا جیسے ہڈی پر کھال منڈھی ہوئی ہو۔ اس نے بڑی مشکل سے وہ نس تلاش کی جہاں پہلے گلوکوز کی سوئی لگی ہوئی تھی۔ اس نے نس میں ٹھیک اسی جگہ سرنج کی سوئی داخل کر دی اور پلنجر کو آہستہ آہستہ آگے دبانے لگا۔

چند سیکنڈ بعد اس نے سوئی باہر کھینچ لی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ ہوا کی ننھی سی گولی جو اس نے ڈی ایس پی کے جسم میں داخل کی تھی وہ خون کے ساتھ گردش کرتی ہوئی جب دل تک پہنچے گی تو دل کی دھڑکن خاموش ہو جائے گی۔ ڈی ایس پی کبھی ہوش میں نہیں آ سکے گا اور پولیس کبھی یہ نہیں جان سکے گی کہ اسے اغوا کرنے والے اور پھر بوری میں بند کر کے سڑک پر پھینکنے والے کون تھے۔

شارق اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سرنج کو دیکھ رہا تھا کہ باہر قدموں کی آواز سنائی دی جو دروازے کے سامنے آ کر رک گئی پھر یوں لگا جیسے دروازہ کھولنے کے لئے ہینڈل پر دباؤ ڈالا گیا ہو۔ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروزے کی کنڈی لگی ہوئی تھی۔

"اے.... اندر کون ہے؟ دروازہ کھولو!" باہر سے ایک بھاری آواز سنائی دی اور پھر دروازہ دھڑدھڑایا جانے لگا۔

شارق کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے سرنج بستر پر پھینک دی پھر کوٹ اتار کر ایک طرف پھینکا اور عقبی کھڑکی کی طرف لپکا' کھڑکی بند تھی۔ اس نے کھڑکی کی چٹخنی کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ دروازہ اب اور زور زور سے دھڑدھڑایا جا رہا تھا۔ شارق نے گلے میں لٹکا ہوا اسٹیتھوسکوپ اتار کر پھینک دیا اور اچک کر کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ گیا۔ دروازے پر اب شاید کندھے سے ٹکریں ماری جا رہی تھیں۔

اس بلاک کے پچھلی طرف لان تھا اور لان کے دوسری طرف دوسرا بلاک تھا۔ شارق نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی اور لان میں دوڑنے لگا۔ دوڑتے ہوئے اس نے عینک اور مونچھیں بھی اتار کر پھینک دی تیں۔ وہ دوسرے بلاک سے ابھی چند گز کے فاصلے پر تھا کہ دھڑ کی زور دار آواز سنائی دی۔ شاید کمرے کا دروازہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہی ایک آواز سنائی دی۔

"وہ جا رہا ہے.... پکڑو' جانے نہ پائے۔"

شارق نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک آدمی کھڑکی پر چڑھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے دوڑ کر بلاک کے دوسری طرف گھوم گیا۔ اس بلاک کے دوسری طرف بھی وسیع لان تھا۔ اس کے ساتھ ہی پختہ سڑک تھی جو دائیں بائیں چلی گئی تھیں۔ بائیں طرف ہسپتال روڈ والا مین گیٹ تھا اور دائیں طرف یہ سڑک ایک دوسرے گیٹ سے ہوتی ہوئی نیلا گنبد کی طرف چلی گئی تھی۔ شارق دائیں

طرف دوڑنے لگا۔ لان کے ساتھ مختلف بلاکس تھے ایڈمنسٹریشن بلاک بھی اسی طرف تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتا رہا۔ پورے ہسپتال میں پکڑو پکڑو کا شور مچ رہا تھا۔ شارق اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر وہ پکڑا گیا تو زندہ نہیں بچے گا لیکن وہ تاریکی اور عمارتوں کی آڑ میں دوڑتا ہوا نیلا گنبد پہنچ گیا۔

نیلا گنبد لاہور میں سائیکلوں اور ان سے متعلقہ اسپیئرپارٹس کی سب سے بڑی مارکیٹ تھی۔ دن کے وقت تو یہاں چلنے کو راستہ نہیں ملتا تھا لیکن اس وقت یہاں سناٹا طاری تھا۔ شور کی آوازیں اب بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ وہ لوگ شاید اسے ہسپتال کی حدود میں ہی تلاش کر رہے تھے۔

اس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ وفعتاً" بازار کے چوکیدار کی سیٹی کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔ آواز اگرچہ ساتھ والی گلی سے آئی تھی لیکن شارق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ چوکیدار کچھ ہی دیر بعد اس طرف پہنچنے والا تھا۔ وہ متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر ایک دکان کے سامنے تختے کے نیچے گھس گیا۔ دوسری مرتبہ چوکیدار کی سیٹی کی آواز بہت قریب سے سنائی دی تھی۔

شارق تختے کے نیچے بالکل آخر میں دیوار کے ساتھ سمٹا اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سڑک کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ چوکیدار نے سائیکل اس دکان کے عین سامنے سڑک پر روک لی۔ اس نے ایک پیر زمین پر ٹکا لیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑا سیٹیاں بجاتا رہا پھر سائیکل آگے بڑھ گئی۔ چوکیدار کی سیٹیوں کی آواز بدستور دور ہوتی چلی گئی۔

شارق تختے کے نیچے سے نکل آیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دائیں طرف چلنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ مال روڈ پر کافی ہاؤس کے سامنے آ گیا۔ کافی ہاؤس کھلا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک رکشہ' ایک ٹیکسی اور دو تین کاریں اور موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔ شارق نے کافی ہاؤس کا دراوزہ کھول کر اس طرح اندر جھانکا جیسے کسی کی تلاش ہو۔ اندر پانچ چھ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ وہ ادیب یا شاعر تھے جنہیں اپنی گھروں کی فکر نہیں ہوتی۔ یہ لوگ ایک کپ چائے پر رات بھر بیٹھے ادب اور شاعری کے موضوع پر بحث کر سکتے تھے اور حقیقت یہ تھی کہ کافی ہاؤس کی رونق بھی انہیں ادیبوں اور شاعروں کے دم سے تھی۔ شارق اندر داخل ہونے کے بجائے مڑ کر رکشے کی طرف آ گیا۔

"کیوں بھئی چلنے کا موڈ ہے؟" اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اپنی سیٹ پر اس طرح نیم دراز بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے پیر باہر لٹکے ہوئے تھے۔

"بیٹھئے صاحب جی' کہاں جانا ہے آپ کو؟" ڈرائیور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"چوبرجی۔" شارق کہتے ہوئے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

رکشہ اسٹارٹ ہو کر حرکت میں آ گیا۔ چوبرجی پہنچنے میں اسے دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ شارق چوک پر ہی رکشے سے اتر گیا اور ڈرائیور کو پیسے دے کر پیدل چلتا ہوا شام نگر کی طرف مڑ گیا۔ مزید دس منٹ بعد وہ اپنی اس خفیہ پناہ گاہ میں موجود تھا جس کے بارے میں ابھی تک کسی اور کو پتہ نہیں چلا تھا۔

بیڈ روم میں آ کر وہ کپڑے بدلے بغیر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ موجودہ صورت حال کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے اپنے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ اس خطرناک راستے پر اتنا دور نکل آیا تھا کہ اب واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب تو اس نے اپنے ہاتھ بھی خون سے رنگ لئے تھے اور خون کا یہ رنگ اتنا پکا تھا جو کبھی نہیں اتر سکتا تھا۔

شارق یہی سب کچھ سوچتے ہوئے رات کے آخری پہر تک جاگتا رہا اور پھر جب پو پھٹ رہی تھی تو اس کی پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکنے لگیں۔ دنیا والے رات بھر کی نیند پوری کرنے کے بعد جاگ رہے تھے اور شارق نیند کی آغوش میں جا رہا تھا۔

شارق دو دن تک اپنے مکان تک محدود رہا۔ ضرورت کی ہر چیز گھر میں موجود تھی۔ اسے صرف تندور سے روٹی لینے کے لئے رات کو گھر سے باہر جانا پڑتا تھا۔ دوسرے دن وہ اخبار بھی لے آیا تھا۔ اخبار سے پتہ چلا کہ پولیس بڑی سرگرمی سے اس نقلی ڈاکٹر کو تلاش کر رہی ہے جس نے زہریلا انجکشن لگا کر ڈی ایس پی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ہسپتال کے ڈاکٹر اس زہریلے انجکشن کے بارے میں ابھی کوئی رائے قائم نہیں کر سکے تھے کیونکہ ابھی تک ڈی ایس پی کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا تھا۔

پولیس نے اس کانسٹیبل کو گرفتار کر لیا تھا جو رات کو ہسپتال میں ڈی ایس پی کے کمرے کے سامنے ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اخبارات نے اس کانسٹیبل کا بیان اور اس کا بتایا ہوا نقلی ڈاکٹر کا حلیہ بھی شائع کیا تھا۔ گوری رنگت' دراز قامت' صحت مند جسم' آنکھوں پر عینک' ہٹلر کٹ مونچھیں اور سیاہ بال جو سادگی سے پیچھے کی طرف بنے ہوئے تھے۔ ہسپتال میں اس حلئے کا کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔

اخبار نے دن کو کمرے کے سامنے ڈیوٹی دینے والے پولیس کانسٹیبل کا بیان بھی شائع کیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق دوپہر کے لگ بھگ ایک خوبرو نوجوان اس سے ڈی ایس پی کے بارے میں پوچھتا رہا تھا۔ اس نے اس نوجوان کا جو حلیہ بتایا تھا وہ اس نقلی ڈاکٹر سے بالکل مختلف تھا۔

پولیس کو اس کمرے سے سرنج' لیب کوٹ اور کھڑکی کے قریب اسٹیتھوسکوپ اور پچھلی طرف لان میں ایک عینک بھی پڑی ہوئی مل گئی تھی۔ پولیس نے یہ تمام چیزیں اپنے قبضے میں لے لی

اور فنگر پرنٹس حاصل کرنے کے لئے انہیں ماہرین کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ پولیس کے ترجمان نے اخباری نمائندوں کو بیان دیتے ہوئے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ یہ پراسرار ڈاکٹر انہی کا ساتھی ہو سکتا ہے جنہوں نے کئی روز پہلے ڈی ایس پی کو اغوا کیا تھا۔ فنگر پرنٹس کی رپورٹ ملنے کے بعد پولیس کی لسٹ پر موجود مشتبہ افراد کو چیک کیا جائے گا۔

شارق نے اخبار ایک طرف ڈال دیا۔ اس کے لئے تشویش کی بات صرف ایک تھی۔ فنگر پرنٹس.... وہ پولیس کے ریکارڈ پر تھا۔ اگر فنگر پرنٹس سے اس کا نام سامنے آ گیا تو پولیس اسے بھی ڈھونڈ نکالے گی۔ زیر زمین دنیا کا تقریباً ہر شخص اسے جانتا تھا۔ منشیات فروشوں اور جرائم پیشہ افراد کے گروہوں میں ایسے آدمی بھی موجود تھے جو پولیس کے لئے مخبری کا کام بھی کرتے تھے اور سب ہی لوگ جانتے تھے کہ وہ چھانگا کے گروہ میں شامل تھا۔ پولیس کو اس تک پہنچنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔

تیسری رات شارق چھانگا کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ اس وقت گیارہ بجے تھے اور چھانگا اکیلا ہی تھا وہ شارق کو دیکھتے ہی اپنا بزنس جیرے کے سپرد کر کے شارق کے ساتھ دوسرے کمرے میں

"تم نے تو کمال کر دیا شارق باؤ۔" چھانگا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "پولیس تم نے ایسا چکر دیا ہے کہ پورا محکمہ گھن چکر بن کر رہ گیا ہے۔ اب وہ لوگ قیامت تک یہ پتہ نہیں لگا سکیں گے کہ اس ڈی ایس پی کو اغوا کس نے کیا تھا اور پھر ہسپتال میں ڈاکٹر بن کر قتل کس نے کیا تھا۔ بھئی یہی فرق ہوتا ہے ہم جیسے جاہلوں اور تم جیسے پڑھے لکھے لوگوں میں۔ میں نے اس روز جب یہ خبر سنی کہ ڈی ایس پی زندہ ہے تو میرے تو حواس گم ہو گئے تھے۔ کچھ تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گا۔ میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ باقی زندگی جیل ہی میں گزرے گی لیکن تم..... تم نے تو کمال ہی کر دیا۔"

"جیل جانے کے امکانات ابھی موجود ہیں۔" شارق نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟" چھانگا نے اسے گھورا۔

"اگر اغوا یا قتل ہونے والا کوئی عام آدمی ہوتا تو پولیس والے اس کیس کا فائل کہیں رکھ کر بھول جاتے۔ مگر وہ ایک ڈی ایس پی تھا۔ پولیس کا ایک اعلیٰ آفیسر۔ یہ محکمہ اسے آسانی سے نہیں بھولے گا۔ قاتل کا سراغ لگانے کے لئے وہ زمین آسمان ایک کر ڈالیں گے۔" شارق نے جواب

"میں ان پولیس والوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" چھانگا نے کہا۔ "دو چار دن سرگرمی

دکھائیں گے اور پھر ان کا جوش و خروش ٹھنڈا ہو جائے گا۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ا
احتیاط کی ضرورت ہے۔"

"احتیاط۔" شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ میں پولیس کے ریکارڈ
ہوں۔ میری حماقت سے پولیس والوں کو آگے بڑھنے کا ایک راستہ مل گیا ہے۔"

"کیا راستہ؟" چھانگا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میری حماقت سے سرنج' کوٹ' اسٹیتھوسکوپ اور عینک پولیس کو مل گئی ہے۔ یہ چیزیں ڈ
پرنٹس کے ماہرین کو بھیج دی گئی ہیں۔ رپورٹ ملنے کے بعد وہ لوگ ذرا سی محنت سے پولیس
ریکارڈ سے یہ پتہ چلا سکتے ہیں کہ انگلیوں کے یہ نشان کس کے ہیں اور پھر ہر تھانے میں میر
تصویر لگی ہوئی نظر آئے گی۔" شارق نے کہا۔

"پولیس والے اتنی محنت نہیں کرتے۔" چھانگا بولا۔ "لیکن اگر تمہارے دل میں کچھ ایسا
خوف ہے تو چند روز کے لئے شہر سے باہر چلے جاؤ۔ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو واپس آ جانا۔"

"اور اگر میری تصویر اخبارات کو جاری کر دی گئی تو پورے ملک میں میری تلاش شروع
جائے گی۔" شارق نے جواب دیا۔

"تم واقعی ڈر گئے ہو شارق بابو۔" چھانگا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
ایسا کرو کہ چند روز کے لئے فیصل آباد چلے جاؤ۔ حمیدے کے پاس۔ تم حمیدے سے تو مل چکے
نا! میرا نام لینا۔ وہ تمہارا خیال رکھے گا اور اپنا حلیہ شلیہ ذرا بدل لو تاکہ کوئی پہچان نہ سکے۔"

چھانگا کا مشورہ معقول تھا۔ شارق چند لمحے سوچتا رہا پھر اس کے مشورے پر عمل کرنے ہی
مناسب سمجھا۔

"کوئی رقم شقم چاہئے تو لے لو۔" چھانگے نے کہا۔ "ویسے ضرورت پڑنے پر تم حمیدے
بھی میرے نام پر جتنی رقم چاہو لے سکتے ہو۔ میرا اور اس کا حساب چلتا ہی رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل صبح ہی فیصل آباد چلا جاؤں گا۔" شارق نے کہا۔

چھانگے نے قمیص کے نیچے شلوار کی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"یہاں کے حالات جیسے ہی ٹھیک ہوں گے میں تمہیں پیغام بھجوا دوں گا۔" وہ اس
کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "اور گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔
نہیں ہونے دوں گا تمہیں۔"

کچھ ہی دیر بعد شارق چھانگے کے ڈیرے سے نکل آیا۔ وہ مزنگ چوک سے رکشے میں بیٹھ
سیدھا باغبانپورہ پہنچ گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ بیل بجانے پر دروازہ شاہد

کھولا تھا لیکن مریم اور رضیہ بھی آواز سن کر جاگ گئی تھیں۔ ان میں سے کسی نے بھی نہیں
چھا کہ وہ اس وقت کہاں سے آیا ہے۔ وہ اس کے کئی روز غائب رہنے اور بے وقت آمد و رفت
عادی ہو چکی تھیں۔

"ماں جی میں چند روز کے لئے کراچی جا رہا ہوں۔" شارق نے مریم کی طرف دیکھتے ہوئے
"ہو سکتا ہے اس مرتبہ کئی روز لگ جائیں۔ آپ لوگ پریشان مت ہوئیے گا۔"

"میرا دھیان تو ہر وقت تمہاری ہی طرف رہتا ہے بیٹا۔" مریم نے کہا۔ "کوئی اور کام شروع
ں نہیں کر دیتے کہ آرام سے ایک جگہ ٹک کر بیٹھ سکو۔"

"اب جو کام شروع کر رکھا ہے اسے سمیٹنا بڑا مشکل ہے ماں جی!" شارق نے جواب دیا۔ پھر
ضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرا بریف کیس کہاں ہے' اس میں میرے دو تین جوڑے
پڑے رکھ دو۔"

"کب جا رہے ہیں آپ؟" رضیہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"صبح سویرے نکل جاؤں گا۔" شارق نے جواب دیا۔

"صبح آپ کو بریف کیس تیار ملے گا۔" رضیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر رضیہ اور مریم اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شارق نے
ازہ بند کر لیا اور پتلون کی جیب سے پستول نکال کر الماری کے سیف والے خانے میں رکھ دیا
بستر پر لیٹ گیا۔

صبح چھ بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کچن کی طرف سے برتنوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ
رے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ اسی وقت رضیہ بھی اپنے کمرے سے نکل آئی۔

"میں آپ ہی کو جگانے کے لئے آ رہی تھی۔" رضہ نے کہا۔ "آپ منہ ہاتھ دھو لیں۔ شاہد
ستہ تیار کر رہا ہے۔ میں آپ کے کپڑے بریف کیس میں رکھ دیتی ہوں۔"

شارق باتھ روم میں چلا گیا۔ جب وہ باہر نکلا تو شاہد نے کچن سے آواز لگائی۔

"ناشتہ آپ کے کمرے ہی میں لے آؤں بھائی؟"

"ہاں لے آؤ۔" شارق کہتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

رضیہ اس کے تین چار جوڑے بریف کیس میں رکھ چکی تھی۔ وہ باتھ روم سے جا کر اس کا
ُوتھ برش اور پیسٹ وغیرہ بھی لے آئی اسی دوران شاہد ناشتہ لے آیا۔ شارق پلنگ پر بیٹھ کر ناشتہ
نے لگا۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس نے رضیہ کو کمرے سے نکال دیا اور دروازہ بند کر کے لباس
بدل کرنے لگا اور پھر سات بجے کے لگ بھگ وہ مریم اور رضیہ سے رخصت ہو کر گھر سے نکل

آیا۔ گلیوں سے نکل کر جی ٹی روڈ پر آتے ہی اسے تانگہ مل گیا۔ تانگے میں چار سواریاں پہلے ہی سے بیٹھی ہوئی تھیں اور کوچوان ٹیشن ٹیشن کی آواز لگا رہا تھا۔

جی ٹی روڈ پر اسٹیشن کے عقبی سمت سیڑھیوں کے سامنے وہ تانگے سے اتر گیا اور پل عبور کر کے وہ اسٹیشن کے سامنے والے رخ پر آ گیا۔ وہ بریف کیس ہاتھ میں لٹکائے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسٹیشن کے سامنے جی ٹی ایس کے اڈے کی طرف بڑھ گیا۔

فیصل آباد کی ایک بس اس وقت اڈے سے نکل رہی تھی۔ بس بھری ہوئی تھی۔ دوسری بس آدھے گھنٹے بعد روانہ ہونے والی تھی۔ شارق ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور بکنگ ونڈو کے سامنے مسافروں کی لائن لگتے دیکھ کر وہ بھی اٹھ کر لائین میں کھڑا ہو گیا۔ اسی دوران دو پولیس والے ٹہلتے ہوئے اس طرف نکل آئے۔ وہ اس طرح نظریں گھما گھما کر لوگوں کو دیکھ رہے تھے جیسی کسی شکار کی تلاش ہو۔ ان میں سے ایک نے شارق کی طرف دیکھا۔ شارق نے ایک دم منہ پھیر لیا۔ اس کے دل میں چور تھا۔ خوف کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں سرایت کر گئی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے ان پولیس والوں کو اسی کی تلاش ہو۔ اس نے دو دن سے شیو نہیں بنایا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن وہ اپنے آپ کو مشتبہ سمجھنے پر مجبور ہو رہا تھا۔

شارق کے آگے تقریباً اسی کی عمر کا ایک دیہاتی سا نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے دھوتی اور ململ کا کرتا پہن رکھا تھا۔ پیروں میں سیاہ کمیشن تھی۔ چہرے سے وہ دیہاتی کوئی شریف آدمی ہی لگتا تھا۔ اس نے بھی اٹیچی کیس نما سیاہ رنگ کا پرانا سا بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔

"اوئے.....ادھر آؤ نا تم۔" ایک پولیس والے نے اس دیہاتی نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں.....کیا بات ہے؟" دیہاتی نوجوان نے کانسٹیبل کو گھورا۔

"ادھر آؤ نا۔ بتاتا ہوں کیا بات ہے....." کانسٹیبل نے کہتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ لیا اور لائن سے نکال کر ایک طرف لے گیا۔ لائن میں کھڑے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ پولیس والے اسے بکنگ آفس کے پچھلی طرف لے گئے۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ دیہاتی نوجوان واپس آ گیا۔

"کیا بات ہے؟ یہ لوگ کیوں لے گئے تھے تمہیں؟" شارق نے پوچھا۔

"ایسے ہی' جگا ٹیکس وصول کرتے پھر رہے ہیں۔" نوجوان نے ناگوار سے لہجے میں جواب دیا۔ "جرائم پیشہ لوگوں سے تو ان کی ہوا سکڑتی ہے اور شریف لوگوں کو پریشان کرتے ہیں۔"

"یہی تو ہماری بدقسمتی ہے۔" لائن میں آگے کھڑا ہوا ایک آدمی بولا۔ "ہمارے ہاں تو لوگ

ہیں میں بھرتی ہی لوٹ مار کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔"

ان پولیس والوں کو دوبارہ اس طرف آتے دیکھ کر لوگ خاموش ہو گئے۔ پس پشت تو بہت کہا جا سکتا تھا لیکن سامنے بولنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ شارق نے ایک بار پھر منہ پھیر لیا۔ وہ کانسٹیبل جس نے پہلی مرتبہ شارق کو دیکھا تھا اس کے قریب آ گیا۔ شارق کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کہیں اس کی تلاش شروع تو نہیں ہو گئی۔

"تم بار بار منہ کیوں چھپا رہے ہو۔ میری طرف دیکھو! ذرا چہرہ تو کراؤ....." کانسٹیبل نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں کوئی چور ہوں نہ ڈاکو اور نہ پینڈو۔" شارق نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "لوگوں کو اس طرح پریشان کرتے ہوئے شرم آنا چاہئے تمہیں۔"

"دیکھ اوئے باؤ۔" پولیس والے نے اسے گھورا۔ "گرم ہونے کی ضرورت نہیں۔ لے جا کر اندر کر دوں گا تو ساری گرمی نکل جائے گی۔ سمجھے۔"

"چلو....ذرا تمہاری تھانیداری بھی دیکھ لوں۔ تمہاری پیٹی نہ اتروا دی تو نام بدل دینا۔" شارق کا لہجہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔

پولیس والے کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ شارق کا یہ نفسیاتی حربہ کامیاب رہا تھا۔ پولیس والا اس کے لہجے سے بدک گیا تھا۔ لائن میں آگے کھڑے ہوئے ایک شخص نے قریب آ کر شارق کا بازو پکڑ لیا۔

"چھوڑو یار کن حرامخوروں کے منہ لگ رہے ہو ان کا تو کام ہی یہ ہے۔"

"آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس کی پٹی اتروا دوں گا اور پھر یہ منتیں کرتا پھرے گا۔" شارق پولیس والے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اب چھوڑ بھی دے باؤ۔" دوسرے پولیس والے نے کہا۔ "اسے کئی مرتبہ سمجھایا ہے کہ بشر دیکھ کر بات کیا کرے....پر یہ بھی کیا کرے۔ سرکار جو تنخواہ دیتی ہے اس سے تو گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔"

"فٹ پاتھ پر چادر بچھا لیا کرو خرچ پورا ہو جایا کرے گا۔" لائن میں سے کسی نے کہا۔

پولیس والوں نے گھور کر اس شخص کی طرف دیکھا جس نے یہ جملہ کہا تھا پھر وہ خاموشی سے اسے کھسک کر اس طرف چلے گئے جہاں سیالکوٹ کی بس کھڑی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد فیصل آباد کے لئے بس اسٹینڈ پر آ گئی اور اس کے ساتھ ہی بکنگ ونڈو

کھل گئی۔ لوگ ٹکٹیں لے لے کر بس میں سوار ہونے لگے۔ چند ہی منٹ میں بس بھر گ
شارق کے ساتھ والی صرف ایک سیٹ خالی تھی اور پھر ایک عورت بس میں داخل ہوئی
دروازے کے قریب ہی رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بس میں عورتیں بھی تھیں۔ لیکن کوئی
سیٹ نہیں تھی جہاں وہ عورت کسی عورت کے ساتھ بیٹھ سکتی۔ صرف شارق کے ساتھ والی
سیٹ ہی خالی تھی۔ وہ عورت گہرا سانس لیتی ہوئی اس طرف آ گئی۔

"اگر آپ اس طرف آ جائیں تو میں کھڑکی کی طرف بیٹھ جاتی ہوں۔" وہ عورت شارق
سیٹ کے قریب رک کر بولی۔

"او.... ضرور...." شارق نے کہتے ہوئے اس عورت کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر پینتیس
لگ بھگ رہی ہو گی۔ قدرے دراز قامت' بھرپور جسم اور چہرے کے دلکش نقوش۔ کانوں
آویزے اور سیاہ ریشمی بال جو ایک چٹیا کی صورت میں کمر تک لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے ہلکے
رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور دوپٹہ گلے کا ہار بنا ہوا تھا۔ اسکے ہاتھ میں سفری بیگ تھا جو اس
اوپر شیلف پر رکھ دیا۔ شارق سیٹ سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ عورت سمٹ کر کھڑکی کے ساتھ
گئی اور شارق اس کے ساتھ اس طرح بیٹھا کہ ان دونوں کے درمیان چند انچ کا فاصلہ تھا۔
کے لباس سے اٹھنے والی بھینی بھینی مہک شارق پر سحر سا طاری کر رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد بس اسٹارٹ ہو کر اڈے سے نکل آئی اور شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہو
راوی کے پل پر آ گئی۔ اس سے آگے شاہدرہ کے اسٹاپ پر ایک منٹ کو رکی اور پھر شیخوپورہ
پر دوڑنے لگی۔

بس کو لگنے والے ہلکے ہلکے جھٹکوں کی وجہ سے شارق اور اس عورت کے درمیان چند انچ
فاصلہ بھی مٹ گیا۔ یہ دو آدمیوں کی سیٹ تھی اور بیچ میں فاصلہ رکھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ شرو
میں تو سمٹنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے یہ کوشش بھی ترک کر دی۔ ان دونوں کے کند
ملے ہوئے تھے اس کے جسم کے لمس سے شارق اپنے آپ میں عجیب سنسنی کی سی کیفیت محسو
کر رہا تھا۔ کبھی تو اس کے دل کی دھڑکن اس قدر تیز ہو جاتی کہ شارق کو یہ خوف لاحق ہو
کہ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ اس کی دھڑکن کی آواز نہ سن لیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر ان میں بات چیت شروع ہو گئی۔

سڑک کے دونوں طرف بڑی بڑی فیکٹریاں اور کارخانے تھے اور اس عورت کو اس بات
افسوس ہو رہا تھا کہ لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی جگہ شور مچاتے اور سیاہ دھواں اگلتے ہوئے کارخانو
نے لے لی تھی۔

اس کا نام ثمینہ تھا۔ وہ لاہور کی رہنے والی تھی اور فیصل آباد کے گورنمنٹ کالج میں لیکچرار
ی۔ وہ اپنی کزن کی شادی کے سلسلے میں دس دن کے لئے لاہور آئی ہوئی تھی اور اب واپس جا
ہی تھی لیکن شارق نے اس سے نہیں پوچھا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں۔ شارق نے
نا نام ریحان بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ ایک دوست سے ملنے کے لئے فیصل آباد جا رہا ہے۔

بس شیخوپورہ اور شاہ کوٹ کے اڈوں پر مختصر وقفوں کے لئے رکتی ہوئی گیارہ بجے کے قریب
بل آباد ریلوے اسٹیشن کے قریب جی ٹی ایس کے اڈے پر رک گئی۔ مسافر اپنا اپنا سامان لے کر
رنے لگے۔ شارق نے اوپر والے شیلف سے ثمینہ کا سفری بیگ اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا اور
اپنا بریف کیس بھی اتار لیا۔ وہ بس سے اتر آئے۔ ثمینہ نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا
ور ایک تانگے پر بیٹھ گئی۔ تانگے پر مزید مسافروں کی گنجائش نہیں تھی ورنہ شارق بھی بیٹھ جاتا۔

ڈھائی تین گھنٹوں کے ساتھ نے شارق کے سینے میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ اسے افسوس ہوا
تھا کہ یہ سفر اتنی جلدی ختم ہو گیا اور ثمینہ اپنا اتا پتہ بتائے بغیر اس طرح چلی گئی تھی جیسے کوئی
تعلق ہی نہ رہا ہو.... شارق اپنے اس خیال پر خود ہی ہنس دیا۔ ان میں تعلق ہی کیا تھا' وہ تو ایک
بس کے مسافر تھے۔ وقت گزارنے کے لئے ان میں باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ منزل پر پہنچ کر
ان کے راستے الگ ہو گئے تھے لیکن شارق کو حیرت تھی کہ وہ ثمینہ کے بارے میں ایسا کیوں سوچ
رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا تانگے کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں
ہو گیا۔

شارق پہلی مرتبہ فیصل آباد آیا تھا۔ چھانگے نے اسے بتایا تھا کہ وہ منروا سینما کے قریب نہر
کے پل کے ساتھ صادق کے پان سگریٹ کے کھوکھے سے حمیدے کے بارے میں پوچھ لے۔ وہ
اسے حمیدے کے ڈیرے پر پہنچا دے گا۔ لیکن شارق کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ منروا سینما کس
طرف ہے۔

بس کے تمام مسافر جا چکے تھے۔ ایک طرف شٹل کاک برقعے والی ایک عورت اور دو بچے
بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے قریب ہی لوہے کا ایک ٹرنک اور ایک ٹوکری رکھی ہوئی تھی۔ ایک ادھیڑ
عمر آدمی ان سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ انہیں شاید کسی بس پر سوار
ہونا تھا۔ سامنے ایک خالی تانگہ کھڑا تھا۔ شارق تانگے کے قریب آ گیا۔

"کہاں جانا ہے باؤ جی!" تانگے والے نے پوچھا۔

"منروا سینما۔" شارق نے جواب دیا۔

"بیٹھو' لے چلتا ہوں۔ ادھر کی سواریاں مل گئیں تو ٹھیک ہے ورنہ سالم تانگہ...."

"چلو... سالم ہی چلو۔" شارق کہتے ہوئے تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

تانگہ سرکلر روڈ پر ہوتا ہوا جھنگ بازار کے اختتام پر نہر کے پل کے پاس رک گیا۔

"وہ منروا سینما ہے باؤ جی۔" تانگے والے نے نہر کے پار سینما کی طرف اشارہ کیا۔

شارق تانگے والے کو پیسے دے کر اتر آیا اور بریف کیس ہاتھ میں لٹکائے نہر کے پل کی طرف چلنے لگا۔ یہ نہر پندرہ بیس فٹ چوڑی تھی۔ گہری زیادہ نہیں تھی۔ اس کے کنارے پختہ اینٹوں کے تھے۔ نہر میں گائے بھینسیں بھی نہا رہی تھیں اور بچے اور آدمی بھی۔ پل کے دونوں طرف منڈیروں پر چھابڑی والوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ پل کے دوسری طرف دائیں سمت نہر کے بالکل سامنے منروا سینما تھا اور بائیں طرف دکانیں اور ہوٹل وغیرہ تھے۔ غلام محمد آباد کی طرف جانے کے لئے تانگوں کا اڈہ بھی تھا۔ پل سے چند گز آگے ساتھ ساتھ دو ہوٹل تھے جن کے پیچھے کچی آبادی تھی اور اس کے پیچھے اناج کے بڑے بڑے گودام تھے۔ ہوٹلوں کے سامنے پھلوں اور کھانے پینے کی اشیاء کے چھابڑے اور ٹھیلے تھے۔ سڑک سے اڑنے والی دھول وغیرہ سے بچاؤ کا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ دونوں ہوٹلوں کے سامنے پان سگریٹ کے کھوکھے بھی تھے۔ شارق پہلے کھوکھے کے سامنے رک گیا جہاں گیارہ بارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا دکانداری کر رہا تھا۔

"صادق کا کھوکھا یہی ہے؟" شارق نے لڑکے سے پوچھا۔

"وہ آگے والا کھوکھا ہے۔" لڑکے نے اشارہ کیا۔

شارق اس اگلے کھوکھے پر چلا گیا۔ وہاں تیس بتیس سال کی عمر کا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ چھوٹی نوکدار سیاہ داڑھی، ماتھے پر محراب اور سر پر دھاگے سے بنی ہوئی سفید ٹوپی۔ اس کا یہ حلیہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھنے کا عادی ہے۔ لاہور میں دو مرتبہ صادق سے ملاقات ہو چکی تھی۔ شارق اسے اچھی طرح پہچانتا تھا مگر یہ صادق نہیں تھا۔

"صادق کہاں ہے؟" شارق نے پوچھا۔

"وہ تو گھر پر ہے جی۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟" داڑھی والے نے اسے گھورا۔

"لاہور سے آیا ہوں۔ صادق کو اطلاع بھجوا دو کہ چھانگے کا آدمی آیا ہے۔" شارق نے کہا۔

داڑھی والے نے ایک بار پھر سر تا پا اس کا جائزہ لیا اور پھر ہوٹل کی طرف منہ کر کے کسی کو آواز دی۔ اسی وقت میلے سے لباس میں ایک لڑکا آ گیا۔ اس کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے اور الجھے ہوئے تھے۔

"اوئے کاکے!" داڑھی والی نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چاچا سے جا کر کہہ لاہور سے پروہنا آیا ہے۔ چھانگے نے بھیجا ہے۔"

لڑکے نے ایک نظر شارق کی طرف دیکھا اور پھر ہوٹل کے ساتھ ہی ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی صادق بھی تھا۔ شارق نے اسے دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ صادق بڑی گرمجوشی سے اس سے ملا تھا۔

"او ست بسم اللہ... جی آیاں نوں..." اس نے اظہار خلوص کے طور پر شارق سے معانقہ بھی کر ڈالا۔ "آؤ جی گھر چلتے ہیں۔" اس نے کہا' پھر لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اوئے کاکے دو فسٹ کلاس چائے لے کر آؤ۔"

شارق اس کے ساتھ گلی میں داخل ہو گیا۔ تنگ اور گندی سی دو تین گلیاں گھومنے کے بعد وہ ایک کچے مکان میں داخل ہو گئے۔ مکان کے جس کمرے میں وہ داخل ہوئے تھے وہ بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ پانچ چھ کرسیاں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں درمیان میں ایک میز بھی رکھی ہوئی تھی جس پر کپڑا بچھا ہوا تھا۔ کرسیوں کے کشنز پر کڑھائی کی ہوئی تھی۔

"بیٹھو شارق باؤ۔" صادق نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

شارق کرسی پر بیٹھ گیا۔ بریف کیس اس نے اپنے قریب ہی فرش پر رکھ لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد لڑکا بھی چائے لے کر آ گیا۔

"لو شارق باؤ' چائے پیو۔" صادق نے ایک کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ خاموشی سے چائے کی چسکیاں لیتے رہے پھر صادق نے پوچھا۔ "کیسے آنا ہوا شارق باؤ؟"

"لاہور میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے یار..." شارق نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔ "چھانگا نے کہا کہ چند روز کے لئے تمہارے پاس چلا جاؤں۔ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو واپس چلا جاؤں گا۔"

"کوئی بات نہیں شارق باؤ۔ ہم لوگوں کی زندگی میں ایسی اونچ نیچ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ جب تک چاہو یہاں رہ سکتے ہو۔" صادق نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "جیرے والے کیس کا کیا ہوا؟ اس دن لاہور میں گیا تھا تو پتہ چلا تھا کہ جیرے کو پولیس نے پکڑ لیا ہے اور شاکر بھی مارا گیا ہے۔ چھانگا سے تو میری ملاقات ہی نہیں ہو سکی تھی اس روز۔"

"جیرا تین چار دن پہلے ہی چھوٹ کر آ گیا تھا۔ پولیس نے پیسہ لے کر اس کے خلاف کیس ختم کر دیا ہے۔" شارق نے جواب دیا۔

"چلو اچھا ہوا۔" صادق نے کہا۔ "پولیس سے ہم جیسے لوگوں کی آنکھ مچولی تو ہوتی ہی رہتی

ہے اس پکڑ دھکڑ کے بغیر نہ تو پولیس کا گزارا ہوتا ہے نہ ہمارا۔"

"تمہارا دھندہ کیسا چل رہا ہے؟" شارق نے پوچھا۔

"ایک دم فسٹ کلاس۔" صادق نے جواب دیا۔ "یہاں چھ بڑی پارٹیاں یہ بزنس کر رہی ہیں۔ تمہاری دعا سے تمہارے اس بھائی کا بڑا ٹیکا ہے یہاں۔ آدھا شہر اپنا مرید ہے۔"

شارق چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے صادق کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ گٹھا ہوا جسم' مضبوط ہاتھ پیر' بڑی بڑی سرخ آنکھیں اور تلوار کٹ مونچھیں' سر گنجا تھا۔ وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے سر پر استرا پھروانے کا عادی تھا۔ صادق مشرقی پنجاب کے شہر ہوشیار پور کا رہنے والا تھا بلکہ یہ کہنا بہتر ہو گا کہ اس کے ماں باپ ہوشیار پور سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ صحن کی طرف سے کبھی کبھی باتوں کی آواز سنائی دے جاتی۔ ان آوازوں میں دو عورتوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ان آوازوں سے شارق نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ایک عورت بوڑھی تھی اور دوسری جوان۔ تقریباً ایک بجے کے لگ بھگ کسی نے بیٹھک کا اندرونی دروازہ کھٹکھٹایا۔ صادق اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے آنے میں تین چار منٹ لگے تھے۔

"روٹی تیار ہے شارق باؤ' آؤ ہاتھ دھو لو۔" صادق نے کہا۔

شارق اسکے ساتھ صحن میں آ گیا۔ خاصا وسیع و عریض پختہ صحن تھا۔ ایک طرف کھرا بنا ہوا تھا اور پانی کا ڈرم رکھا ہوا تھا۔ شارق نے ڈرم کی ٹونٹی کھول کر ہاتھ دھوئے اور بیٹھک میں واپس آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد صادق نے میز پر کھانا لگا دیا۔

"بھئی اس وقت تو جو کچھ ہے وہی کھانا پڑے گا۔" صادق بولا۔

"ہر چیز خدا کی نعمت ہے۔ کسی چیز سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔" شارق نے جواب دیا۔

وہ دونوں کھانا کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد صادق نے برتن اٹھا کر اندر پہنچا دیئے۔

"شارق باؤ' اگر تم آرام کرنا چاہو تو ساتھ والے کمرے مین جا کر لیٹ جاؤ۔ آؤ میں تمہیں کمرہ دکھا دوں۔" صادق نے کہا۔

"میں یہیں دری پر لیٹ جاؤں گا۔ اندر خواتین کو بلا وجہ تکلیف ہو گی۔" شارق بولا۔

"خواتین کون ہیں' میری بوڑھی ماں ہے اور بھتیجی ہے۔ وہ تم سے پردہ تو نہیں کریں گی۔" صادق نے کہا۔

وہ دونوں بیٹھک سے نکل کر صحن میں آ گئے۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو شارق ٹھٹک کر رک گیا۔ کمرے میں دو چارپائیاں تھیں۔ ایک پر سفید

کھیس بچھا ہوا تھا اور پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی دوسری چارپائی پر کھیس بچھا رہی تھی۔ وہ شارق کو دیکھ کر شرما سی گئی۔ اس نے چادر بچھا کر تکیہ رکھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

"یہ میری بھتیجی ہے نجمہ۔" صادق نے کہا۔ "تین سال پہلے پولیس نے اس کے باپ کو پکڑ لیا تھا اور تھانے میں تشدد کر کے اسے ہلاک کر ڈالا۔ مرنے کے بعد اس کے جسم میں دو گولیاں اتار دی گئیں اور لاش کو سڑک پر ڈال کر یہ مشہور کر دیا کہ وہ ایک خطرناک ڈاکو تھا جو پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ صدمے کی تاب نہ لا کر میری بھابھی کا بھی ہارٹ فیل ہو گیا۔ یہ دونوں بہن بھائی میرے ہی پاس رہتے ہیں۔ پان کے کھوکھے پر داڑھی والا جو لڑکا بیٹھا ہوا تھا وہ میرا بھتیجا ہے۔ اس کا نام اشرف ہے۔"

شارق کی چہرے پر افسردگی سی چھا گئی۔ وہ جہاں بھی گیا تھا اس نے پولیس کے ظلم اور جبر و تشدد کی ایسی ہی داستانیں سنی تھیں۔ وہ جن لوگوں سے ملا تھا وہ تمام جرائم پیشہ تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے جرائم کی یہ زندگی ورثے میں ملی ہو یا شوقیہ طور پر ذلت و رسوائی کا یہ راستہ اپنایا ہو۔ انہیں مجرم بنانے میں پولیس کا ہاتھ تھا۔ وہ خود ایک زندہ مثال کی حیثیت سے موجود تھا۔ وہ بڑی عزت و شرافت کی زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن پولیس نے اسے یہ خطرناک راستہ اپنانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"یار شارق باؤ۔" صادق نے دوسری چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔ "سنا ہے تو پڑھا لکھا ہے.... بی اے کیا ہے تم نے.... تم تو کسی دفتر میں افسر بن سکتے تھے پھر یہ گھناؤنا دھندہ کیوں شروع کر دیا تم نے۔ تعلیم تو روشنی پھیلاتی ہے۔ تم گناہوں کے اندھیرے میں کیسے آ گئے؟"

"پولیس کی مہربانی سے۔" شارق نے جواب دیا۔ "یہ درست ہے کہ علم کی روشنی انسان کو سیدھا راستہ دکھاتی ہے لیکن پولیس نے اندھیروں میں دھکیل دیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے اپنی کہانی سنانے لگا۔

"پاکستان میں یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔" صادق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے بھی ایف اے کیا ہے۔ میرا باپ بھی مجھے بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا لیکن قانون کے ان محافظوں نے میرے باپ کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ اس کا ذہنی توازن ماؤف ہو گیا ایک دن وہ گھر سے نکلا تو لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ آج تک اس کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ زندہ ہے یا کہیں مر کھپ گیا اور پھر میرے بڑے بھائی کو بھی پولیس نے مار ڈالا۔ میرے سینے میں آج بھی انتقام کا لاوا کھول رہا ہے اور میرے انتقام کی یہ آگ اس وقت تک ٹھنڈی نہیں ہو گی جب تک میں ایک ایک کو ٹھکانے نہیں لگا دیتا۔"

شارق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ قانون کے محافظوں کی بات ہو رہی تھی۔ جنہیں عوام کی عزت و آبرو اور جان و مال کے تحفظ کے لئے رکھا گیا تھا مگر قانون کے یہ محافظ عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے اور انہیں ذلیل و رسوا کر رہے تھے۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے دفعتاً شارق کے ذہن میں سلمان ایڈووکیٹ کا نام ابھر آیا۔

"یہاں پیپلز کالونی کہاں ہے؟" شارق نے پوچھا۔

"کوہ نور مل کے سامنے ہے۔ کسی سے ملنا ہے؟" صادق بولا۔

"ہاں۔" شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "سلمان ایڈووکیٹ..... میری بربادی کا اصل ذمے دار وہی ہے۔ اس نے میرے ماں باپ کو قتل کروایا تھا۔ انسپکٹر کو رشوت دے کر مجھے چودہ سال کے لئے جیل بھجوانے والا بھی وہی تھا۔ میرے مکان کو بھی اسی نے آگ لگوائی تھی اور آتش زدگی کے الزام میں مجھے دوبارہ اندر کروانے کی کوشش بھی اسی نے کی تھی۔ وہ لاہور سے بھاگ کر یہاں آگیا ہے۔ سنا ہے پیپلز کالونی میں رحمانیہ مسجد کے قریب کہیں رہتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں' تلاش کر لیں گے اسے۔" صادق نے جواب دیا۔ "مجھے بھی ایک آدمی کی تلاش ہے۔ میں جب تک اسے جہنم رسید نہیں کر دوں گا اس وقت تک مجھے بھی چین نہیں آئے گا۔"

وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شارق اونگھنے لگا تھا اور پھر جلد ہی وہ سو گیا۔

اس کی آنکھ چھ بجے کھلی تھی۔ اس نے اٹھ کر صحن میں ڈرم سے منہ ہاتھ دھویا اور صادق کے ساتھ گھر سے نکل کر کھوکے کے ساتھ والے ہوٹل میں آ گئے۔ انہوں نے چائے پی اور دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اسی دوران دو تین آدمی صادق کے پاس آئے اور دھیمے لہجے میں کچھ باتیں کر کے چلے گئے۔

شام ہو چکی تھی۔ دکانوں اور ہوٹلوں کی بتیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ سینما کا میٹنی شو ختم ہو چکا تھا۔ چھ بجے والے شو کے لئے سینما کے سامنے رش لگا ہوا تھا۔ سینما کی وجہ سے یہاں بڑی رونق تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رونق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور آدمی صادق کے پاس آگیا۔ وہ لمبا تڑنگا سا آدمی تھا۔ شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا اور سر کے بالوں میں مہندی کا رنگ تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر شارق کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کوئی پولیس والا تھا۔ صادق سے باتیں کرتے ہوئے وہ بار بار شارق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ آدمی واپس چلا گیا۔

"یہ پولیس کا آدمی تھا؟" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے صادق کی طرف دیکھا۔

"ہاں' یہ حرام خور پریشان کرتے ہی رہتے ہیں۔ تھانیدار نے بلایا ہے۔ حالانکہ ہمارا یہ علاقہ ان کے تھانے میں نہیں ہے۔ وہ سامنے تھانہ دیکھ رہے ہو؟" اس نے نہر کے پار تھانے کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ "اس تھانے کی حدود نہر کے اس طرف ہے۔ لیکن یہ لوگ یہاں آ کر بھی لوگوں کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔" وہ دونوں کچھ دیر تک بیٹھے رہے پھر صادق اٹھ گیا۔ "اچھا شارق باؤ' میں تھانیدار کی بات سن آؤں۔ تم چاہو تو سیر سپاٹا کر آؤ۔ جھنگ بازار سے سیدھے چلے جاؤ گے تو گھنٹہ گھر پہنچ جاؤ گے۔ بڑی رونق والی جگہ ہے۔"

وہ دونوں ہوٹل سے نکل آئے۔ نہر کا پل پار کر کے صادق تو تھانے کی طرف چلا گیا اور شارق جھنگ بازار کی طرف بڑھ گیا۔ اس بازار میں زیادہ تر کریانے کی دکانیں تھیں۔ دکان داروں نے سڑک تک اپنا سامان پھیلا رکھا تھا۔ سبزی فروشوں نے بھی سڑک گھیر رکھی تھی۔ بعض جگہوں پر تو پیدل چلنے کا بھی راستہ نہیں تھا۔ ہر طرف گندگی کے ڈھیر نظر آ رہے تھے۔ انسانوں کے ساتھ بکریاں اور گائیں بھی آزادی سے ٹہلتی پھر رہی تھیں۔

شارق گھنٹہ گھر کے چوک پر آ کر رک گیا۔ وہ بڑی دلچسپی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ چوک کے وسط میں بہت وسیع و عریض چبوترہ تھا جس کے درمیان گھنٹہ گھر کی بلند عمارت تھی۔ گھنٹہ گھر کے آٹھ اطراف میں بازار تھے۔ دوکانوں کے سامنے مرکزی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ گھنٹہ گھر کے چبوترے پر خوانچے والوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ کہیں کیکر کی مسواکیں بیچنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ کہیں دہی بڑے والوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ کہیں کانوں سے میل نکالنے والے بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں مالشئے دریاں بچھائے بیٹھے تھے۔

انگریزی سرکار نے لائل پور برطانیہ کے جھنڈے یونین جیک کے نقشے پر بسایا تھا۔ لیکن اب اس میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اس کا نام بھی لائل پور سے فیصل آباد ہو گیا تھا۔ پان کی دکانوں' کھیر کی اور چائے کی دکانوں کے سامنے شہر کے منچلے جمع تھے۔

شارق تقریباً دو گھنٹوں تک مختلف بازاروں میں گھومتا رہا اور پھر کچہری بازار کے موڑ پر کھڑا ہو گیا جہاں دو بک اسٹال تھے۔ ان اسٹالوں پر اخبارات اور جرائد کے علاوہ عریاں اور نیم عریاں ڈائجسٹ والی کتابیں بھی سجی ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کو سیلوفین کی تھیلیوں میں اس طرح لپیٹ کر رکھا گیا تھا جیسے وہ انمول ہوں اور ان کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

ساڑھے دس بج چکے تھے۔ گھنٹہ گھر کی رونق عروج پر تھی۔ شارق ٹہلتا ہوا واپس آنے لگا۔ جھنگ بازار میں بیشتر سبزیوں اور پھلوں والے اپنی دوکانیں بڑھا چکے تھے۔ اور اب جگہ جگہ سڑے گلے پھلوں اور بوسیدہ سبزیوں کے ایسے ڈھیر نظر آ رہے تھے جن سے بڑی ناگوار بو اٹھ رہی تھی۔

چند گائیں اور بھینسیں اب زیادہ آزادی سے ان ڈھیروں پر منہ مار رہی تھیں۔

شارق جب واپس پہنچا تو صادق ہوٹل ہی میں کونے کی ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ شارق اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی آدمی آتا اور صادق سے ہاتھ ملا کر چلا جاتا۔ صادق کے پاس آنے والوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ سب کے سب نشے کے عادی تھے اور پڑیا لینے کے لئے یہاں آ رہے تھے۔ وہ صادق سے ہاتھ کسی عقیدت کی بناء پر نہیں ملاتے تھے۔ ہاتھ صادق کی طرف بڑھاتے وقت ان کی مٹھی میں نوٹ ہوتے اور جب صادق چادر میں سے ہاتھ نکال کر اس شخص سے ہاتھ ملاتا تو اس شخص کی مٹھی میں دبے ہوئے نوٹ صادق کے ہاتھ اور صادق کے ہاتھ میں دبی ہوئی پڑیا اس شخص کے ہاتھ میں منتقل ہو جاتی۔

اس وقت باتوں میں انکشاف ہوا کہ یہ ہوٹل بھی صادق ہی کا تھا جسے اس نے ٹھیکے پر دے رکھا تھا۔ شام کے بعد وہ خود بھی یہاں بیٹھ کر دھندہ کیا کرتا تھا اور اس کے کارندے بھی ادھر ادھر گھوم کر دھندہ کرتے رہتے تھے۔ صادق خود کھانا کھا چکا تھا اس نے شارق کے لئے بھی کھانا منگوا لیا۔

سینما کا آخری شو ختم ہوا تو صادق سے ہاتھ ملانے والوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہو گیا۔ شو ختم ہونے کے آدھے گھنٹے بعد صادق ہوٹل میں بیٹھا رہا پھر شارق کو لے کر گھر آ گیا۔ شارق آتے ہی بستر پر لیٹ کر اس طرح سویا کہ اسے دنیا و مافیہا کی خبر تک نہ رہی۔

تین چار روز گزر گئے۔ شارق دن بھر کمرے میں چارپائی پر لیٹا رہتا اور شام کو صادق کے ساتھ ہوٹل پر آ جاتا یا بازاروں میں گھومتا رہتا۔ اس دوران وہ لاہور سے آنے والے اخبارات کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا رہا تھا۔ ڈی ایس پی کے قتل کے بارے میں کوئی خبر اس کے نظروں سے نہیں گزری تھی۔

شارق نے کئی روز سے شیو نہیں بنایا تھا۔ داڑھی بڑھ جانے سے اس کا چہرہ کسی حد تک بدل گیا تھا۔ اس روز شام کو اس نے خط بنوا کر باقاعدہ داڑھی رکھ لی۔ داڑھی اور نوکدار مونچھیں اس کے چہرے پر بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔

صادق عام طور پر اپنا مال لاہور میں چھانگا سے لایا کرتا تھا۔ کبھی فوری ضرورت پڑ جاتی تو وہ فیصل آباد کی ایک پارٹی سے بھی مال لے لیا کرتا تھا۔ اس روز صادق کے پاس مال ختم ہو گیا تھا۔ رات کے بارہ بجے ہی وہ ہوٹل سے اٹھ گیا۔

"چل یار شارق باؤ' جناح کالونی سے تھوڑا سا مال لے آئیں اور یہ اپنی جیب میں رکھ لو۔"

صادق نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ایک پستول شارق کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیوں؟" شارق نے پستول لے کر جلدی سے پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا۔

"کالا بڑا خبیث آدمی ہے۔ حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ شاید اس کی ضرورت پڑ جائے۔" صادق نے جواب دیا۔

وہ ایک تانگے پر بیٹھ کر جناح کالونی کی طرف روانہ ہو گئے۔

چھوٹی بڑی کوٹھیوں پر مشتمل یہ رہائشی علاقہ تھا۔ کہیں کہیں دکانیں بھی تھیں۔ ایک گلی کے موڑ پر انہوں نے تانگہ چھوڑ دیا اور پیدل چلتے ہوئے دوسری گلی میں گھوم گئے اور بالآخر ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ بنگلہ نما یہ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ گیٹ کے اندر کی طرف بیٹھے ہوئی آدمی نے صادق کو شناخت کرنے کے بعد ہی انہیں اندر آنے کی اجازت دی تھی۔ وہ ایک کمرے میں آ گئے جہاں کالو کے ساتھ دو آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ اسم با مسمّٰی تھا۔ رنگ توے کی طرح کالا' مونچھیں اور سر کے بال سفید تھے۔ اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ عمر کے لحاظ سے اس کی صحت قابل رشک تھی۔ ان دونوں کو وہاں بیٹھے ابھی پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ گیٹ کا چوکیدار بدحواس سا دوڑتا ہوا اندر آ گیا۔

"کالو استاد..... بھاگو..... پولیس نے چھاپہ مار دیا ہے۔" وہ شخص چیخا۔

"پولیس کا چھاپہ! تمہارے ڈیرے پر کالو!" صادق نے حیرت سے کہا۔

"آج کل ان حرامخوروں سے میری نسل چل رہی ہے' بھاگو!" کالو چیخا۔

وہ لوگ کمرے سے نکل کر بھاگے۔ اسی دوران باہر سے فائر کی آواز سنائی دی۔ صادق اور شارق کمرے سے نکل کر عقبی کوٹھی کی طرف دوڑے۔ اس طرف کی دیوار کافی اونچی تھی۔ صادق دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا دیں۔

"شارق باؤ۔ اوپر چڑھو۔"

شارق اپنا پیر اس کے ہاتھوں پر رکھ کر اوپر چڑھ گیا۔ دوسرا پیر اس نے صادق کے کندھے پر رکھا اور اچک کر دیوار پر چڑھ گیا۔ دیوار پر لیٹ کر اس نے ہاتھ نیچے لٹکا دیا اور صادق کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر کھینچنے لگا۔ چند سیکنڈ کی جدوجہد کے بعد صادق بھی دیوار پر پہنچ گیا۔

"وہ دیوار پر..... مار دو گولی۔" ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

اسی کے ساتھ فضا میں تڑتڑاہٹ گونج اٹھی۔ ایک گولی شارق کی سر کے اوپر سے گزر گئی اور ایک صادق کے ہاتھ کے قریب دیوار پر لگی۔ دیوار کا پلستر ادھڑ کر اڑا۔ اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ فائرنگ کی آوازوں سے اس گھر والے چیخنے لگے تھے

اور جب وہ دونوں اس مکان میں کودے تو عورتوں اور بچوں کے چیخنے کی آواز تیز ہو گئی تھی۔

"شارق بھاگو' اس طرف۔" صادق چیخا اور وہ دونوں پہلو کے گلیارے میں مکان کے سامنے والے رخ کی طرف دوڑے۔ ان دونوں نے اپنے پستول نکال لئے تھے۔

وہ مکان کے سامنے والے رخ پر گیٹ کی دیوار پھاند کر گلی میں کودے ہی تھے کہ گلی کے دائیں موڑ کی طرف سے آواز سنائی دی۔

"رک جاؤ' گولی مار دوں گا۔"

وہ کسی پولیس والے کی آواز تھی۔ شارق نے آواز کی سمت گولی چلا دی۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک چیخ گونجی۔ گولی یقیناً اس پولیس والے کو لگی تھی جو چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا تھا۔ شارق دوسری طرف دوڑا لیکن اس طرف بھی ایک پولیس والا موجود تھا اور صادق پستول سے فائرنگ کر کے اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پولیس نے باقاعدہ پلاننگ کر کے چھاپہ مارا تھا۔ انہوں نے تین چار گلیوں کو گھیرے میں لے رکھا تھا تاکہ اس کے ڈیرے میں موجود دوسرے لوگ فرار نہ ہو سکیں۔

"شارق! سامنے والے مکان میں گھس جاؤ اور اس کے پچھلی طرف سے کود کر نکلنے کی کوشش کرو۔" صادق نے کہا۔

کالو کے مکان کی طرف سے مسلسل فائرنگ کی آواز آ رہی تھی۔ شارق زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ سینے کے بل سامنے والے مکان کی طرف رینگنے لگا۔ دائیں طرف سے ایک فائر ہوا۔ گولی شارق سے دو فٹ آگے زمین پر لگی۔ شارق نے دائیں طرف ایک فائر جھونک دیا اور اٹھ کر سامنے والے بنگلے کی طرف دوڑا اور اچک کر دیوار پر چڑھ گیا۔ وہ دوسری طرف کودنا ہی چاہتا تھا کہ ایک اور فائر ہوا اور اس کے ساتھ ہی شارق کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ گولی اس کی پنڈلی میں لگی تھی اور گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

شارق نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی اور اٹھ کر دوڑنے لگا۔ چند قدم بعد وہ لڑکھڑا کر گرا۔ وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک آدمی برآمدے سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ وہ صاحب خانہ تھا اور اس کے ہاتھ میں دو نالی بندوق تھی۔

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ گولی مار دوں گا۔" وہ شخص غرایا۔

شارق نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فائر کر دیا۔ گولی اس شخص کے سینے میں لگی اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ وہ شخص شارق کو نہتا سمجھا تھا اور اس کی یہی غلط فہمی اسے لے ڈوبی تھی۔ شارق نے اٹھ کر گیٹ کی طرف چھلانگ لگا دی۔ چند سیکنڈ بعد وہ آگے والی گلی میں پہنچ چکا تھا۔

ں نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔ اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور اسے ڑنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی لیکن رکنے کا مطلب بھی موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ لنگڑاتا ہوا گلیوں میں دوڑتا رہا۔ فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ صادق بھی شاید کسی طرف نکل جانے ں کامیاب ہو گیا تھا۔ کالو اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ پکڑے ئے تھے' مارے گئے تھے یا فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

شارق وہاں سے ساتویں یا آٹھویں گلی میں آ چکا تھا۔ دفعتاً" ایک طرف سے بھاری جوتوں کی واز سن کر وہ چونک گیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پولیس والے تھے جو ان کی تلاش ں گلیوں میں دوڑ رہے تھے۔ شارق نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک کوٹھی کی دیوار پھاند کر آہستگی ے اندر کود گیا۔

یہ کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ ایک کمرے کی کھڑکی سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی مگر اندر کی طرف پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک نے سے پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا۔ شارق نے اس جگہ سے جھانک کر دیکھا' یہ کوئی اسٹڈی روم ۔ ایک دیوار کے ساتھ شیلف پر کتابیں سجی ہوئی تھیں اس کے ساتھ ہی میز اور کرسی لگی ہوئی ۔ کوئی عورت کرسی پر بیٹھی میز پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی پشت شارق کی طرف تھی۔ وہ اس ورت کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ ورت کچھ پڑھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ کچھ نوٹس بھی لیتی جا رہی تھی۔

شارق چند لمحے کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا اور پھر دروازے کے سامنے آ گیا اور آہستگی سے وازہ کھٹکھٹایا۔

"کون.... کون ہے اس وقت؟" اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"دروازہ کھولئے..... خدا کے لئے دروازہ کھولئے۔ میں مر رہا ہوں۔ مجھے مدد کی ضرورت ۔" شارق نے مردہ لہجے میں کہا۔

"کون ہو بھئی' کیا ہوا تمہیں؟" اندر سے کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ شارق نے بڑی پھرتی سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا اور دروازہ کھولنے والی عورت کو پستول کی زد لے لیا۔

"منہ سے آواز نکلی تو گولی سے اڑا دوں گا۔ گھر میں کتنے لوگ ہیں؟" شارق غرایا۔

"کک.... کوئی نہیں۔" وہ عورت ہکلائی۔ خوف سے اس کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔ "مم.... میں ں ہوں۔"

"تم!" شارق کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اس کے سامنے ثمینہ کھڑی تھی۔ وہی خوبصورت عورت جس نے لاہور سے فیصل آباد
بس میں اس کے ساتھ سفر کیا تھا۔

○

"کک.... کون ہو تم....؟" ثمینہ ہکلا کر رہ گئی۔ اس کا چہرہ خوف سے دھواں ہو رہا تھا۔

"پولیس میرا پیچھا کر رہی ہے۔" شارق نے کہا۔ "یہ بتی بند کر دو اور کسی اندرونی کمرے میں
منہ سے کوئی آواز نکالنے کی کوشش مت کرنا۔"

"گھر میں کچھ نہیں ہے' نہ نقدی' نہ زیور' یہاں تمہیں چند روپوں سے زیادہ نہیں ملیں
۔" ثمینہ نے کہا۔

"مجھے نہ تو روپوں کی ضرورت ہے اور نہ زیورات کی۔" شارق بولا۔ "مجھے پناہ چاہئے' اس
تمہاری مدد کی ضرورت ہے مجھے۔ اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گی تو تمہیں کوئی نقصان
پہنچے گا۔ بصورت دیگر...." اس نے ثمینہ کے چہرے کے سامنے پستول لہرایا۔ "چلو۔ دوسرے
ے میں چلو مس ثمینہ اور بتی بند کر دو۔"

"کک.... کیا؟" ثمینہ اچھل پڑی۔ "تت.... تم میرا نام جانتے ہو...."

"اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم گرلز کالج میں لیکچرار ہو۔ یہ بتی بند کر دو اور کسی اندرونی
ے میں چلو۔" شارق نے کہا۔

ثمینہ نے سوئچ آف کر دیا۔ ایک اندرونی کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور
ی اس کمرے تک آ رہی تھی۔ ثمینہ اس کمرے میں آ گئی۔ اس کی ٹانگیں ہولے ہولے کانپ
تھیں۔ شارق بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور
ی نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" شارق نے

ثمینہ ایک کرسی پر گر گئی۔ وہ چند لمحے شارق کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

"تت.... تم کون ہو؟ تمہارا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے۔"

"ہم نے تقریباً تین گھنٹے تک بس کی ایک ہی سیٹ پر بیٹھ کر سفر کیا ہے۔ حیرت ہے تم نے
بھی تک نہیں پہچانا۔" شارق بولا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

"تت.... تم...." وہ ایک بار پھر ہکلائی اور گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "تمہارا چہرہ.... یہ داڑھی....."

"اس روز میرے چہرے پر صرف ایک دو دن کا شیو تھا اور اب یہ داڑھی میں نے حلیہ بدلنے کے لئے رکھی ہے۔" شارق نے کہا۔

"اوہ۔" ثمینہ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

"چلو اچھا ہوا تم نے مجھے پہچان تو لیا۔" شارق بولا۔ "تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا اور صورت حال بہتر ہوتے ہی میں یہاں سے نکل جاؤں گا اور....."

شارق ایک دم خاموش ہو گیا۔ باہر گلی میں بھاری قدموں اور باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دو یا دو سے زیادہ آدمی تھے۔ قدموں کی آواز رک گئی۔ مگر بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ ثمینہ کے چہرے پر خوف کے سائے گہرے ہو گئے۔

"شش... شاید.... پولیس....."

"شاید نہیں یقیناً۔" شارق نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ اس دوران دروازہ پھر دھڑدھڑایا گیا۔

"تم باہر جاؤ۔ وہ تم سے میرے بارے میں پوچھیں گے۔ اگر تم نے میری موجودگی کے بارے میں بتایا تو زندہ نہیں بچو گی۔ جاؤ.... ان پر یہ ظاہر کرنا کہ تم سو رہی تھیں۔ یہاں کوئی نہیں آیا اور تم نے کوئی آواز بھی نہیں سنی۔"

ثمینہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر کرسی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئی۔ اس کی ٹانگیں واضح طور پر کپکپا رہی تھیں۔ اس نے دروازے کے ساتھ والی کھڑکی کھول لی۔

"کک.... کون ہے؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"دروازہ کھولئے۔ ہمیں ایک خطرناک مجرم کی تلاش ہے۔ وہ قتل کر کے بھاگا ہے۔" باہر سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"قتل.... قاتل...." ثمینہ کو سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس مرتبہ تو اس کے جی میں آئی کہ دروازہ کھول کر باہر بھاگ جائے اور انہیں بتا دے کہ قاتل اس کے گھر میں چھپا ہوا ہے لیکن شارق کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔ "اگر تم نے میری موجودگی کے بارے میں بتایا تو زندہ نہیں بچو گی۔" "نہیں یہاں کوئی نہیں آیا۔ میں سو رہی تھی۔" اس نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ چہار دیواری کے باہر تین چار آدمیوں کے سر نظر آ رہے تھے۔

"خون کے دھبے آپ کے دروازے تک ہیں۔ اگر وہ مکان میں کہیں چھپ گیا ہے تو آپ کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔" ایک آدمی نے کہا۔

"خ... خون...." ثمینہ کا دل اچھل کر حلق میں آیا۔ "نہیں۔ یہاں کوئی نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی دوسری طرف نکل گیا ہو۔ میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔ گھر میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔"

باہر سے چند لمحوں تک کھسر پھسر کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر ایک آواز نے کہا۔

"میڈم! میں آپ کا پڑوسی گورایہ ہوں۔ آپ دروازہ کھول دیجئے۔ پولیس اپنا اطمینان کر لے۔ ہو سکتا ہے قاتل مکان کی چھت پر یا کہیں اور چھپا ہوا ہو۔"

ثمینہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے پیچھے موت کھڑی تھی اور سامنے قانون کے محافظ۔ وہ انہیں کہہ چکی تھی کہ یہاں کوئی نہیں آیا۔ اگر پولیس والے مکان کے اندر گھس آئے تو.... اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ شارق دروازے کے قریب ہی دروازے کی آڑ میں کھڑا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا ثمینہ کو پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ کب کمرے سے نکل کر وہاں آیا تھا۔

"باہر کا دروازہ کھول دو۔ انہیں کمرے میں مت آنے دینا۔" شارق نے سرگوشی کی۔

"ثمینہ بہن دروازہ کھول دیجئے۔ آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں موجود ہیں۔" اس کے پڑوسی گورایہ کی آواز سنائی دی۔

ثمینہ نے ایک بار پھر شارق کی طرف دیکھا۔ شارق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ثمینہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کنڈہ ہٹایا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس نے باہر کا گیٹ کھولا اور تیزی سے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر دیا اور دوبارہ کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ وہ پولیس والے اور ثمینہ کا پڑوسی گورایہ اور ایک اور آدمی گیٹ سے اندر آ گیا وہ ثمینہ کے سامنے والے گھر میں رہتا تھا۔

ایک پولیس والے کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ وہ اس کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ گھر کے پچھلے حصے کی طرف چلے گئے۔ ان کی باتوں کی آوازیں ثمینہ کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ شارق بھی پستول لئے کھڑا تھا۔ اس کے کان بھی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد پولیس والے مکان کی چھت پر تھے' ان کے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ تقریباً تین منٹ بعد پولیس والے چھت سے اتر آئے۔

"مفرور زخمی ہے۔" ایک پولیس والے نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "خون کے دھبے آپ کے مکان کے بیرونی دروازے تک ہیں' لیکن اس سے آگے کوئی سراغ نہیں مل رہا۔

ہو سکتا ہے یہاں پہنچ کر اس کے زخم سے خون بہنا بند ہو گیا ہو یا یہاں رک کر اس نے زخم
رومال وغیرہ باندھ لیا ہو اور کسی اور طرف نکل گیا ہو۔ بہرحال آپ محتاط رہئے۔ اندر کے
دروازے وغیرہ اچھی طرح بند کر لیں۔ اگر کسی مشتبہ آدمی کو دیکھیں تو ہمیں فوراً اطلاع کر دیں
اس تعاون کے لئے شکریہ۔"

پولیس والے گیٹ سے باہر نکل گئے۔ ثمینہ نے باہر جا کر گیٹ بند کیا اور کمرے میں داخل
ہو کر دھڑ سے دروازہ بند کر دیا اور ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سانس تیز ہو رہا تھا جیسے میلوں
دور سے بھاگ کر آئی ہو۔ اس نے شارق کی طرف دیکھا۔ شارق کے ہونٹوں پر خفیف سی
مسکراہٹ تھی۔

"چلے گئے۔" اس نے ثمینہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ چلے گئے۔" ثمینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن اگر انہیں یہاں
تمہاری موجودگی کا پتہ چل جاتا تو تمہارے ساتھ میں بھی...."

"میں تم پر آنچ نہ آنے دیتا۔" شارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یہیں کھڑے رہنے
کا ارادہ ہے یا کمرے میں چلو گی۔"

ثمینہ اس کمرے میں آ کر دوبارہ کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ شارق اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ قاتل
تھا اور اس نے ثمینہ کو یرغمال بنا لیا تھا۔ وہ شارق کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی صرف تین
گھنٹے کے سفر کا ساتھ رہا تھا۔ اس سفر کے دوران وہ ایک دوسرے کے نام سے واقف ہوئے تھے
ثمینہ نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ وہ لیکچرار ہے اور شارق نے بتایا تھا کہ وہ گریجویٹ ہے۔ کہیں
ملازمت نہیں کرتا اور ایک دوست سے ملنے کے لئے فیصل آباد جا رہا ہے۔

منزل پر پہنچ کر ان کے راستے جدا ہو گئے تھے۔ ثمینہ بس سے اتر کر اپنے گھر آ گئی
تھی....شارق اس وقت بسوں کے اڈے پر ہی کھڑا رہ گیا تھا اور اب ثمینہ سوچ رہی تھی کہ شارق
نے پہلے ہی سے کسی طرح اس کا گھر دیکھ لیا تھا یا اس وقت اس کا یہاں آنا محض اتفاق تھا؟
محض اتفاق ہو یا کچھ اور....صورت حال سنگین تھی۔ وہ قاتل تھا اور پولیس اس کی تلاش میں
تھی۔ وہ اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس کی نظریں سامنے
کھڑے ہوئے شارق کی ٹانگ پر پڑ گئیں۔ اس کی پینٹ پنڈلی سے نیچے پائنچے تک خون سے تر
ہو رہی تھی اور اس کا جوتا بھی خون آلود تھا۔

"اوہ! تم زخمی ہو!" ثمینہ کے خیالات کی رو ایک دم بہک گئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ
ایک خطرناک قاتل ہے اس کے سینے میں شارق کے لئے ہمدردی کے جذبات ابھر آئے۔

"ہاں' میری ٹانگ میں گولی لگی ہے۔" شارق نے جواب دیا۔ "گولی پنڈلی کا گوشت چیرتی ہوئی
نکل گئی تھی اور اب تو شاید خون بھی رسنا بند ہو گیا ہے۔"

"بیٹھو.... یہاں بیٹھو۔" ثمینہ ایک دم کرسی سے اٹھ گئی۔ "میں تمہارا زخم دیکھتی ہوں۔"

"تم!" شارق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں' میں نے فرسٹ ایڈ کا کورس کیا ہوا ہے۔ میرے پاس فرسٹ ایڈ باکس بھی ہے۔ اگر
زخم زیادہ گہرا نہ ہوا تو ڈریسنگ کر سکتی ہوں۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "یہاں بیٹھو میں یہیں فرسٹ
ایڈ باکس لے کر آتی ہوں۔"

ثمینہ جیسے ہی مڑ کر دروازے کی طرف بڑھی شارق بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ ثمینہ نے مڑ
کر اس کی طرف دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔ دوسرے کمرے میں لکڑی کی الماری کے اوپر فرسٹ ایڈ
باکس رکھا ہوا تھا۔ اس نے باکس اٹھایا اور دوبارہ اسی کمرے میں آ گئی۔ یہ دراصل اس کا بیڈ روم
تھا۔ ایک طرف سنگل بیڈ بچھا ہوا تھا اس کے قریب ہی ایک سائیڈ ٹیبل تھی جس پر ذاتی استعمال
کی دو تین چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ قریب ہی وہ کرسی پڑی تھی جس پر کچھ دیر پہلے تک ثمینہ بیٹھی
ہوئی تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" ثمینہ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "اور اسے ایک طرف رکھ دو یا جیب میں
ڈال لو۔" اس مرتبہ اس کا اشارہ پستول کی طرف تھا۔

شارق نے مسکراتے ہوئے پستول کو سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور کرسی پر بیٹھ کر اس نے پتلون کا
پائنچہ اوپر اٹھا دیا۔ زخم سے لے کر ٹخنے تک ٹانگ خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔

فرش پر سرخ رنگ کی دری بچھی ہوئی تھی۔ ثمینہ دری پر بیٹھ گئی اور فرسٹ ایڈ باکس کھول
کر اس میں سے کچھ چیزیں نکالنے لگی۔ پہلے اس نے کاٹن سے اس کے زخم کے آس پاس سے
خون صاف کیا پھر کاٹن اسپرٹ میں تر کر کے اس کا زخم صاف کرنے لگی۔

شارق کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔ اس نے جبڑے بھینچ لئے۔ اتنی تکلیف تو شاید
اسے اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب گولی لگی تھی۔ اب تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زخم میں
مرچ بھری جا رہی ہو۔ اس نے زخم سے ذرا اوپر ٹانگ کو دونوں ہاتھوں سے گرفت میں لے لیا اور
جبڑے سختی سے بھینچے رکھے۔

ثمینہ کچھ دیر تک اسپرٹ سے زخم صاف کرتی رہی پھر اس نے دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔ گولی
اگر زخم میں موجود ہوتی تو تشویش کی بات ہوتی لیکن گولی گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی اور اس
کے خیال میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔

"کچھ کھاؤ گے یا چائے پیو گے؟" ثمینہ نے پوچھا۔ اس کا خوف اب کسی حد تک دور ہو
تھا۔

"کچھ کھانے کا موڈ تو نہیں لیکن چائے ضرور پیوں گا۔" شارق نے جواب دیا۔

ثمینہ نے فرسٹ ایڈ باکس سنبھال کر الماری پر رکھا اور ہاتھ دھو کر کچن میں چلی گئی۔ برنر
گیس کا چولہا جلاتے ہوئے اس نے آہٹ پا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شارق کچن کے دروازے میں کھ
تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں پستول موجود تھا۔

"شاید تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں۔" ثمینہ نے کہا۔

"جب زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہو تو کسی پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔" شارق نے جواب دیا۔

"باتیں اچھی کر لیتے ہو۔" ثمینہ نے اسے گھورا۔ "بس کے سفر کے دوران تمہاری باتوں
نے مجھے متاثر کیا تھا اور میں تمہیں ایک شریف آدمی سمجھی تھی۔"

"میری شرافت میں تمہیں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔" شارق نے کہا۔ "کیا یہ میری شرافت
کا ثبوت نہیں کہ مجھے اس مکان میں آئے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا ہے اور میں نے تمہارے
ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی۔"

"تم ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔" ثمینہ نے اسے گھورا۔ "میں نے اگر تمہیں یہاں پناہ دی
ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں تمہاری کوئی حرکت برداشت کر لوں گی۔ عورت سب
کچھ برداشت کر سکتی ہے۔ ہر ظلم سہہ سکتی ہے لیکن اپنی طرف اٹھنے والی کوئی میلی آنکھ برداشت
نہیں کر سکتی۔"

"مجھے پناہ دینے کا شکریہ۔" شارق نے کہا۔ "لیکن میری نظروں میں میل نہیں ہے۔"

"کس کو قتل کر کے آئے ہو؟" ثمینہ نے دو کپوں میں چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"ایک پولیس والا۔" شارق نے جواب دیا۔ "میں نے ارادتاً اسے قتل نہیں کیا۔ اپنے دفاع
میں گولی چلائی تھی۔"

"پولیس بلاوجہ تو کسی پر گولی نہیں چلاتی۔" ثمینہ نے چائے کا ایک کپ اس کی طرف
بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیا جرم کیا تھا تم نے؟"

"جرم!" شارق کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ "یہی تو میرا جرم ہے کہ میں نے کوئی جرم
نہیں کیا تھا۔"

وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے۔ ثمینہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی اور شارق کرسی پر بیٹھ گیا
پستول اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

"بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" ثمینہ نے اسے گھورا۔

"ایسی باتیں شاید کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ جب مجھے اپنے ماں باپ کے قتل کے
م میں چودہ سال کے لئے جیل بھیجا گیا تھا تو اس وقت میں بھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔ لیکن اب
کچھ سمجھ چکا ہوں۔" شارق نے کہا۔

"کک.... کیا کہا تم نے۔" ثمینہ کا ہاتھ کانپ گیا۔ اگر وہ کپ کو فوراً ہی میز پر نہ رکھ دیتی تو
ے اس پر گر جاتی۔ "تت.... تم نے اپنے ماں باپ کو قتل....."

"نہیں۔" شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ "لیکن پہلی مرتبہ سزا مجھے اسی الزام میں ہوئی
۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اپنی داستان سنانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "اگر یہ سب
نہ ہوا ہوتا تو آج میں اس طرح پولیس سے چھپنے کے بجائے معاشرے کا ایک معزز شہری
۔ میں نے چوتھی کلاس کی اردو کی کتاب میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ "پولیس والا" اس مضمون
یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ پولیس شہریوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی
ہوتی ہے لیکن میرا اب تک کا تجربہ یہ ہے کہ پولیس ہی شریف آدمیوں کو چور' ڈاکو اور قاتل
ہے۔"

"مجھے تمہاری کہانی سن کر افسوس ہوا ہے۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔" ثمینہ نے کہتے ہوئے
پر آویزاں کلاک کی طرف دیکھا۔ بارہ بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ شارق کی طرف
ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے اب خطرہ ٹل چکا ہے۔ تمہیں چلے جانا چاہئے۔"

"کیا؟" شارق نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تمہارے خیال میں مجھے
حالت میں یہاں سے چلے جانا چاہئے؟"

"میں ایک شریف عورت ہوں۔" ثمینہ نے کہا۔ "اس محلے میں میری بڑی عزت ہے۔ ایک
کی حیثیت سے نہ سہی لیکن میں نہیں چاہتی کہ کوئی تمہیں یہاں دیکھ لے۔"

"اس شہر میں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔" شارق نے جواب دیا۔ "میں جس دوست سے ملنے
لئے فیصل آباد آیا تھا وہ بھی اس وقت میرے ساتھ تھا۔ اب مجھے پتہ نہیں کہ وہ پولیس
لے میں مارا گیا ہے' پکڑا گیا ہے یا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے' لیکن پولیس اس کے
ے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ اس کا ٹھکانہ بھی پولیس کی نظروں میں ہے اور میں وہاں جانے کا
مول نہیں لے سکتا۔ اس لئے جب تک یہ ہنگامہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا میں یہیں رہوں گا۔"

"کیا.... کیا مطلب؟" ثمینہ اچھل پڑی۔ اسے اپنے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس
ہی تھیں۔ ہو سکتا ہے وہ کردار کے لحاظ سے شریف آدمی ہو۔ اس کی داستان بھی درست ہو

کہ وہ مجرم نہیں تھا۔ اسے مجرم بنایا گیا ہے لیکن قانون کی نگاہ میں وہ مجرم ہی تھا اور اس وقت قتل کے الزام میں پولیس کو مطلوب تھا۔ وہ ایک ایسے اجنبی کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتی تھی۔ "نہیں، تم ایسا نہیں کرسکتے۔ تمہیں جانا ہی ہو گا۔"

"جب تک حالات سازگار نہیں ہو جاتے میں یہیں رہوں گا۔" شارق نے کہتے ہوئے میز پر سے پستول اٹھا لیا۔ "اس وقت تک تم بھی گھر سے باہر نہیں جا سکو گی اور نہ ہی تمہارے ہاں کوئی مہمان آئے گا۔ اگر کوئی آ بھی جائے تو اسے باہر ہی سے ٹرخا دو گی سمجھیں۔"

"یا الٰہی یہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔" ثمینہ کا لہجہ رو دینے والا تھا۔

"یہ مصیبت تو تمہیں برداشت کرنا ہی پڑے گی۔" شارق بولا۔ "اگر تم سونا چاہو تو اپنے بستر پر سو سکتی ہو۔ میں کمرے کے باہر کرسی پر بیٹھ کر رات گزار لوں گا۔"

"نن... نہیں۔" ثمینہ گھگھیائی۔ "خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"یہ تو تم جان ہی چکی ہو کہ میں قتل کے الزام میں پولیس کو مطلوب ہوں۔" شارق نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "اپنی جان بچانے کے لئے اگر میں ایک آدمی کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں تو دوسرا قتل کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کروں گا۔"

ثمینہ کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اب وہ اس کے چنگل میں پھنس چکی ہے اور اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی راستہ اس کے سامنے نہیں تھا۔ وہ اس لمحہ کو کوسنے لگی جب اس نے شارق کی درد بھری آواز سن کر دروازہ کھولا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ اسے ایک موقع ملا تھا۔ جب پولیس آئی تھی اور وہ دروازہ کھولنے کے لئے باہر نکلی تھی تو اس کے لئے بہترین موقع تھا۔ وہ پولیس کو مکان میں اسکی موجودگی کے بارے میں بتا دیتی تو اس وقت اسے ایسی سنگین صورت حال کا سامنا نہ ہوتا۔

شارق نے کرسی اٹھا کر کمرے کے باہر دروازے کے سامنے ڈال دی اور اطمینان سے بیٹھ گیا اور ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم چاہو تو آرام سے بستر پر سو سکتی ہو۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ثمینہ اٹھ کر دروازے کے قریب آ اس نے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن شارق نے پیر پھنسا دیا۔

"دروازہ کھلا رہے گا۔" اس نے کہا اور کرسی اٹھا کر دروازے کے بیچ میں رکھ دی۔ ثمینہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر رو دینے والے تاثرات تھے۔ ثمینہ پلنگ کی پٹی پر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ دیوار گیر کلاک نے دو بجنے کا اعلان کیا تو اس نے

سر اٹھا کر شارق کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی پر چاق و چوبند بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا جیسے نیند کا اس کی آنکھوں میں نام و نشان نہ ہو۔

نیند تو ثمینہ کی آنکھوں سے بھی کوسوں دور تھی۔ ایسی صورت حال میں اسے جلد کیسے نیند آ سکی تھی۔ اس کے گھر میں ایک قاتل موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ جوان آدمی تھا اب تک اس نے اگرچہ واقعی کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی لیکن مرد کی نیت کا کیا بھروسہ؟ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ سونا تو درکنار وہ تو اس کی موجودگی میں بستر پر لیٹ بھی نہیں سکتی تھی۔

شارق کے آنے سے پہلے ثمینہ اس کمرے میں بیٹھی صبح کلاس میں دیئے جانے والے لیکچر کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کا طریقہ کار یہی تھا۔ صبح کالج میں جن موضوعات پر لیکچر دینا ہوتے رات کو وہ ان کی اسٹڈی ضرور کرتی تھی۔ لیکن آج اس کا سارا پروگرام درہم برہم ہو گیا تھا۔ اسے شبہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ یہ خونی صبح اسے کالج بھی نہیں جانے دے گا۔

وقت کی رفتار جیسے تھم کر رہ گئی تھی۔ لمحے صدیاں بن کر بیت رہے تھے۔ وہ بار بار دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتی۔ ہر مرتبہ اسے یوں لگتا جیسے گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھنا بھول گئی ہوں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا۔

ہر طرف سناٹا اور ہو کا عالم طاری تھا۔ دیوار گیر کلاک کی ٹک ٹک کے علاوہ کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور یہ آواز بھی خاموش فضا میں بڑا پراسرار تاثر پیدا کر رہی تھی۔

ثمینہ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اسے سوتے دیکھ کر اچانک ہی ثمینہ کے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور اس نے فوراً ہی اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ بڑی آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور ننگے پیر دبے قدموں سے چلتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ شارق کرسی پر اس طرح ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا کہ راستہ رکا ہوا تھا۔

ثمینہ بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ اس نے اپنا سانس تک روک رکھا تھا اور نظریں شارق کے چہرے پر مرکوز تھیں اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے ایک پیر شارق کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کے اوپر سے دوسری طرف رکھا پھر دوسرا پیر اٹھایا۔ اس کی نظریں اب بھی شارق کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

وہ بلی کی طرح نہایت دبے قدموں دوسرے کمرے کے باہر کی طرف نکلنے والے دروازے کی طرف چلنے لگی۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر اس نے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تھا.... دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شارق کی آنکھیں اب بھی بند تھیں اور اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے مڑ کر دراوزہ کی چٹخنی پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے بڑی آہستگی سے نیچے کھینچنے لگی۔ چٹخنی آواز پیدا کئے بغیر کھل گئی۔ ثمینہ نے ایک مرتبہ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا' اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس ہینڈل میں آٹومیٹک لاک بھی تھا جسے کھولنے یا بند کرنے کے لئے اندر سے کسی چابی کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف چھوٹی سی ناب کو اوپر اٹھا کر ہینڈل گھما دینا تھا جس سے دروازہ کھل جاتا۔ اس نے ناب پر انگوٹھا رکھا اور اسے بڑی آہستگی سے اوپر اٹھانے لگی۔ ناب کھل گئی۔ اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گھمانا ہی چاہتی تھی کہ اپنے کندھے پر کسی قسم کا ہلکا سا بوجھ محسوس کر کے اچھل پڑی۔ وہ تیزی سے پیچھے مڑی' شارق اس کے سامنے کھڑا تھا۔

ثمینہ کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خوف کی شدت سے آنکھیں اس طرح پھیل گئیں جیسے اس نے موت کو اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔ اس کا منہ کھل گیا لیکن چیخ نکلنے سے پہلے ہی شارق نے ہاتھ رکھ کر اس کا منہ دبا لیا۔

"میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا رہا ہوں کوئی آواز نکلی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔" شارق کے حلق سے سانپ کی سی پھنکار نکلی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اس کے چہرے کے سامنے لہرا دیا تھا۔

شارق نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا' ثمینہ کے منہ سے اس طرح سانس خارج ہوئی جیسے غبارے سے ہوا نکلی ہو' سنسنی نے اس کے پورے بدن کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور انتہائی خوفزدہ نظروں سے شارق کی طرف دیکھنے لگی۔ شارق نے آگے بڑھ کر دروازے کی آٹو میٹک لاک کی ناب دبا دی اور چٹخنی بھی چڑھا دی۔

"ایسی کوئی حرکت تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔" شارق نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "چلو....اپنے کمرے میں جاؤ۔"

ثمینہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اسی کمرے میں آ کر بستر پر گر گئی۔

"دیکھو ثمینہ۔" شارق اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا' تین گھنٹے کا بس کا وہ سفر اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ میں زندگی میں پہلی مرتبہ کسی

عورت کے اتنا قریب بیٹھا تھا۔ تین گھنٹوں کے اس سفر کے دوران تمہارے جسم کے کسی حصے کا غیر ارادی لمس میرے دل و دماغ پر عجیب سی کیفیت طاری کئے رہا تھا۔ تم تو بس سے اتر کر پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر تانگے میں بیٹھ کر چلی گئی تھیں اور میں دیر تک وہاں کھڑا اس راستے کو تکتا رہا تھا جس طرف تانگہ گیا تھا۔

کئی روز بعد آج قسمت مجھے تمہارے سامنے لے آئی ہے۔ لیکن جس طرح تمہارے سامنے آیا ہوں اس صورت حال کے پیش نظر تم تو کیا دنیا کا کوئی بھی شخص مجھ سے نفرت کر سکتا ہے۔ ایک قاتل کو گھر میں پناہ دینا بلاشبہ خطرناک بات ہے۔ لیکن میں تم پر پہلے واضح کر چکا ہوں کہ میں فطرتاً وہ نہیں ہوں جو اس وقت تمہارے سامنے ہوں۔ میرے دل میں تمہاری بہت قدر ہے۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر تم میری موت کا سامان کرنے کی کوشش کرو تو میں آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھا رہوں۔ اب اگر تم نے اس قسم کی کوئی حرکت کی تو...." وہ خاموش ہو کر معنی خیز انداز میں پستول کو اس کے چہرے کے سامنے حرکت دینے لگا۔

"تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے' خدا کے لئے چلے جاؤ یہاں سے۔" ثمینہ نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"میں زندگی بھر تو یہاں نہیں رہ سکتا' چلا جاؤں گا۔" شارق نے جواب دیا۔ "لیکن حالات کو ذرا اس قدر تو سازگار ہونے دو کہ میں باہر نکل سکوں۔ اس وقت تک تمہیں بھی ذرا پابند ہونا پڑے گا۔ اب تم کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گی جو مجھے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دے۔"

وہ اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ ثمینہ بدستور پلنگ پر آڑھی ترچھی پڑی رہی۔ اس نے جو سوچا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا تھا۔ شارق کو کرسی پر سوتے دیکھ کر جب اس نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تھی تو اس کا خیال تھا کہ باہر نکلتے ہی وہ دروازے کو باہر سے کنڈا لگا دے گی اور پڑوسیوں کو جگا کر انہیں صورت حال سے آگاہ کر دے گی لیکن اس نے جو سوچا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اپنے ہی گھر میں قیدی بن کر رہ گئی تھی اور ایک قاتل کے رحم و کرم پر تھی۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا اور ثمینہ اپنی قسمت کو کوستی رہی۔ اس نے کئی مرتبہ شارق کی طرف دیکھا تھا اور ہر مرتبہ شارق کو جاگتے ہوئے ہی پایا تھا۔

رات کا آخری پہر بیت رہا تھا۔ رات بھر جاگتے رہنے سے ثمینہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ راتوں کو جاگی تھی' مگر وہ اور بات تھی۔ وہ اپنی مرضی سے جاگتی تھی اور کام میں مصروف رہتی تھی۔ لیکن آج کی شب بیداری مختلف نوعیت کی تھی۔ اس کے ذہن پر

خوف طاری تھا۔ عزت و آبرو کا خوف.... جان کا خوف' اس کے اعصاب میں کشیدگی تھی اور دماغ کی نسوں میں تناؤ تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔

کھڑکی سے دن کا ہلکا سا اجالا نظر آنے لگا تھا۔ رات بیت گئی تھی۔ ایک نیا دن طلوع ہونے والا تھا۔ طلوع ہونے والا ہر نیا دن زندگی کا پیغام لاتا ہے۔ مکان کے عقب میں بیری کے درخت پر چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا۔ چہچہاتی ہوئی یہ چڑیاں زندگی کا پیغام دیتے ہوئے اپنے اپنے آشیانوں سے اڑنے کے لئے پر تول رہی تھیں لیکن ثمینہ کا آشیانہ اس کے لئے قفس بن گیا تھا۔

دفعتاً" دروازہ دھڑدھڑانے کی آواز سن کر ثمینہ اچھل پڑی۔ اس کی دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی تھی۔ اس نے شارق کی طرف دیکھا۔ شارق بھی ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھ گیا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے ثمینہ کی طرف دیکھا۔

"دودھ والا ہو گا۔ وہ روزانہ اسی وقت آتا ہے۔" ثمینہ نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ چھ بجنے میں ایک دو منٹ باقی تھے۔

شارق دبے قدموں چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آ گیا' اس نے پردہ ذرا سا سرکا کر باہر جھانکا' گیٹ کی درز میں سے ایک سائیکل کھڑی ہوئی نظر آ گئی۔ وہ دودھ والا ہی تھا' شارق دوبارہ ثمینہ کے قریب آ گیا۔

"تم دودھ لینے جاؤ گی لیکن باہر کا گیٹ نہیں کھولو گی۔ اس سے کہہ دینا کہ گیٹ کی چابی نہیں مل رہی۔ دودھ تم گیٹ کے اوپر سے لو گی۔ میں اس کھڑکی کے پاس کھڑا رہوں گا۔ اگر تم نے دودھ والے کو کوئی پیغام دینے کی کوشش کی تو میرے پستول سے نکلنے والی گولی سیدھی تمہاری کھوپڑی میں لگے گی۔"

ثمینہ اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ اس نے پتیلی دھوئی اور دروازے کی طرف آ گئی شارق پستول لئے کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ ثمینہ نے اس کی طرف دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ رکی' پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پھر پتیلی گیٹ کے اوپر سے بڑھا کر بلند آواز میں دودھ والے کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

"دودھ والے' چابی کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں' اس وقت گیٹ نہیں کھل سکتا۔ یہ پتیلی پکڑ لو۔"

شارق کھڑکی کے قریب کھڑا گہری نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پتیلی گیٹ کے اوپر سے دوسری طرف غائب ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد گیٹ کے اوپر پتیلی دوبارہ نمودار ہوئی۔ ثمینہ نے

بڑی احتیاط سے پتیلی پکڑ لی اور کمرے میں آ گئی۔ شارق نے دروازہ بند کر دیا۔

ثمینہ کچن میں تھی۔ شارق موقع سے فائدہ اٹھا کر باتھ روم میں گھس گیا۔ اس نے باتھ روم کا دروازہ کھلا رکھا اور جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ثمینہ چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے ایک کپ شارق کے ہاتھ میں تھما دیا اور دوسرا کپ لے کر کمرے میں آ گئی۔

شارق کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ لیکن دل ہی دل میں اسے افسوس بھی ہو رہا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ اس کی وجہ سے ثمینہ شدید کرب میں مبتلا تھی۔ لیکن اس میں خود شارق کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ پولیس سے بچنے کے لئے جس گھر میں داخل ہوا تھا وہ ثمینہ کا گھر تھا' وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا کہ قسمت دوبارہ اسے ثمینہ کے سامنے لے آئی تھی۔

بس میں ایک ہی سیٹ پر تین گھنٹے کے سفر کے بعد ثمینہ جب اس سے کوئی بات کئے بغیر تانگے پر بیٹھ کر چلی گئی تھی تو وہ دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ اس نے عورت کو ہمیشہ ماں اور بہن کے روپ میں دیکھا تھا۔ بارہ سال کی عمر تک وہ ماں کی ممتا سے بہرا مند ہوتا رہا تھا۔ جیل سے آنے کے بعد اس نے مریم اور رضیہ کو دیکھا تھا۔ مریم نے اسے ماں کی ممتا دی تھی اور رضیہ نے بہن کا پیار۔ لیکن ثمینہ سے ملاقات کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ مرد اور عورت کے درمیان کوئی اور رشتہ بھی ہوتا ہے۔ وہ اتنے دنوں تک ثمینہ کے لئے سینے میں ایک کسک سی محسوس کرتا رہا تھا اور اب قسمت اسے ثمینہ کے سامنے لائی بھی تھی تو اس روپ میں کہ ثمینہ اس سے نفرت کرنے میں حق بجانب تھی لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ ثمینہ کے دل میں اس کے لئے یہ نفرت برقرار رہے۔

ساڑھے سات بجے کے لگ بھگ ثمینہ نے ناشتہ بنا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"تم ناشتہ نہیں کرو گی؟" شارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "تم جو کچھ بھی کر رہے ہو وہ اچھا نہیں کر رہے۔ مان لیا کہ تم بہت شریف آدمی ہو لیکن شاید تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ عورت کی طرف ایک مرتبہ انگلی اٹھ جائے تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔"

"لیکن..... میں نے تو کچھ نہیں کیا تمہارے ساتھ؟" شارق نے جواب دیا۔

"اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے ہو۔" ثمینہ بولی۔ "تم ایک قتل کر کے بھاگے ہو۔ پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ اور تم میرے گھر میں موجود ہو۔ اگر کسی کو یہ پتہ چل جائے کہ میں نے ایک قاتل کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے تو کیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہوں گی۔ کیا

پولیس مجھے بھی سلاخوں کے پیچھے نہیں پہنچا دے گی؟"

"پناہ دینے اور یرغمال بنائے جانے میں بڑا فرق ہوتا ہے مس ثمینہ۔" شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں گن پوائنٹ پر خاموش رہنے پر مجبور کر رکھا ہے اور تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ تم میرا حکم ماننے پر مجبور ہو۔"

"لیکن تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے۔" ثمینہ بولی۔

"چلا جاؤں گا۔" شارق نے کہا۔ "دن کی روشنی میں محلے کا کوئی آدمی مجھے تمہارے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھے گا تو کیا سوچے گا؟"

"دن نکل آیا ہے۔" ثمینہ نے کہا۔ "پڑوس والوں سے میرا ملنا ملانا ہے۔ ان کو جب پتہ چلے گا کہ میں آج کالج نہیں گئی تو کسی نہ کسی گھر کی کوئی عورت یہاں ضرور آئے گی اور تم....."

"تم کسی کو اندر نہیں بلاؤ گی۔" شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جو بھی آئے گا اسے باہر ہی سے ٹرخا دو گی۔"

شارق نے اٹھ کر تمام کھڑکیوں کی پردے برابر کر دیئے تاکہ باہر سے کسی کو پتہ نہ چل سکے کہ گھر کے اندر کوئی موجود ہے یا نہیں۔ ثمینہ کرسی پر خاموش بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ رات بھر جاگتے رہنے سے اسکی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ شارق بھی رات بھر جاگتا رہا تھا اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ لیکن اس کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ساڑھے دس بجے کے قریب کال بیل کی آواز سن کر وہ دونوں اچھل پڑے۔ شارق ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آ گیا اور پردے کا کونا سرکا کر باہر دیکھنے لگا۔ گیٹ کے سامنے ایک باریش ادھیڑ عمر آدمی کھڑا تھا۔ اس کے سر پر پرانی سی جناح کیپ تھی۔ اس کے قریب ہی ایک سائیکل بھی کھڑی تھی۔ شارق نے ثمینہ کو اشارہ کیا۔ وہ چھوٹی چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

"یہ آدمی کون ہے؟" شارق نے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"یہ ہمارے کالج کا چپراسی ہے۔" ثمینہ نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

"اس سے جا کر پوچھو وہ کیوں آیا ہے' گیٹ کھولنے یا اسے اندر بلانے کی ضرورت نہیں ورنہ....." شارق نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس ورنہ میں جو دھمکی چھپی ہوئی تھی اسے ثمینہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔

ثمینہ دروازہ کھول کر باہر کے گیٹ کے قریب آ گئی۔ اس نے چپراسی سے ایک منٹ

کوئی بات کی اور پھر اندر آ گئی۔ اس نے میز پر کتابوں کے نیچے رکھا ہوا ایک رجسٹر اٹھایا اسے کھول کر دیکھا اور شارق کی طرف دیکھتے ہوئے پھر باہر نکل گئی اسے واپس آنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ شارق نے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے چپراسی کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

ثمینہ اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گر گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اس دوران اس نے ایک دو مرتبہ شارق کی طرف دیکھا تھا۔ شارق بدستور کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر اب تھکن کے آثار نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ کبھی اونگھنے لگتا اور کبھی سنبھل کر سر کو ہلکے ہلکے جھٹکے دینے لگتا۔ ثمینہ کے اعصاب بھی اب جواب دینے لگے تھے اس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔ نیند کا غلبہ بڑھ رہا تھا۔ اس کی پلکیں بار بار جھک رہی تھیں۔ اسے بڑی شدت سے نیند آ رہی تھی مگر وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے شارق کی طرف دیکھا۔ وہ سر کو کرسی کی پشت پر ٹکائے اونگھ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا۔ دوسرا ہاتھ گود میں تھا' پستول بھی گود میں رکھا ہوا تھا۔ ثمینہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ نہایت دبے قدموں چلتی ہوئی شارق کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ شارق بدستور اونگھ رہا تھا۔ ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ثمینہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے بڑی تیزی سے جھپٹ کر شارق کی گود سے پستول اٹھا لیا۔

شارق ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس نے ثمینہ کی طرف دیکھا۔ پستول ثمینہ کے ہاتھ میں دیکھ کر اس کی چہرے پر خوف کے ہلکے سے سائے ابھر آئے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ثمینہ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"لاؤ.....یہ پستول مجھے دے دو۔ چل جائے گا۔"

"میرے قریب مت آنا.....گولی مار دوں گی۔" ثمینہ کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پستول تھام رکھا تھا اور انگلی ٹرائیگر پر تھی۔

"دیکھو.....غصے میں آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ پستول مجھے دے دو۔" شارق نے کہا اس کا ہاتھ بدستور آگے بڑھا ہوا تھا۔

"اگر تم نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میں ٹرائیگر دبا دوں گی۔" ثمینہ غرائی۔ "تم نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اس شرافت کے بدلے میں تمہارے ساتھ یہ رعایت کر سکتی ہوں کہ

تمہیں یہاں سے زندہ نکل جانے دوں۔ جاؤ.... چلے جاؤں یہاں سے۔"

"ٹھیک ہے۔" شارق کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ "ٹھیک ہے۔ میں چلا ہ ہوں۔"

"چلو.... دروازے کی طرف بڑھو۔" ثمینہ غرائی۔

شارق دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی نظریں ثمینہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ثمینہ دو قدم کے فاصلے پر آگے بڑھ رہی تھی۔ شارق نے دروازے کے قریب پہنچ کر ایک ہاتھ اوپر وا چٹخنی کی طرف بڑھا دیا۔ ثمینہ اس سے دو قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ وہ مطمئن ہو گئی تھی کہ یہ اب اس کے سر سے ٹلنے والی ہے۔ شارق نے چٹخنی پر ہاتھ رکھا۔ لیکن پھر بڑی تیزی سے مڑ اس نے ثمینہ کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستول پر زوردار ٹھوکر ماری۔

ثمینہ کے لئے یہ حملہ اگرچہ بالکل غیر متوقع تھا لیکن پستول پر اس کی گرفت خاصی مضبو تھی۔ پستول تو اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا البتہ وہ لڑکھڑا کر رہ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ا کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی تھی۔ شارق نے برقی سرعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پستول والے ہاتھ پر ہاتھ ڈال لیا اور پستول چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کشمکش میں ٹرائیگر دب گیا۔ گولی چھت میں لگی۔

شارق نے ایک جھٹکے سے ثمینہ کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور اسے دھکا دے کر فرش گرا دیا۔ "گولی کی آواز باہر سنی گئی ہو گی۔ اگر کوئی پوچھنے آیا تو تم یہی بتاؤ گی کہ بلب پھٹ گیا تھا اب میں تمہارا کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔"

شارق نے اسے چھوڑ دیا۔ ثمینہ فرش پر پڑی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نظروں سے چنگاریاں سی پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔ پچھتاؤ گے تم اپنی اس حرکت پر۔" وہ غرائی۔

"میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا جس پر مجھے پچھتانا پڑے۔" شارق نے جواب دیا۔ وہ مزید کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کال بیل کی آواز گونج اٹھی۔ وہ ثمینہ کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم اس دراوزے کی دہلیز سے باہر قدم نہیں رکھو گی۔ دروازے ہی میں کھڑی ہو کر بات کرو۔ کوئی غلط حرکت یا کوئی اشارہ تمہاری موت کا باعث بن سکتا ہے۔"

ثمینہ نے دروازہ کھول دیا اور گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ شارق اس کے قریب ہی دروازے کی آڑ میں پستول لئے کھڑا تھا۔

"کون ہے؟" ثمینہ نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"ثمینہ بہن۔ اس طرف سے کوئی آواز آئی تھی جیسے گولی چلی ہو۔ خیر تو ہے؟" باہر کھڑے ئے آدمی نے پوچھا۔ وہ سامنے والے گھر کا مکین تھا۔ لمبے قد کی وجہ سے اس کا سر گیٹ کے اوپر ے نظر آ رہا تھا۔

"کچھ نہیں بھائی صاحب۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "کچن کا بلب فیوز ہو گیا تھا۔ میں نے دوسرا ب لگا کر سوئچ آن کیا ہی تھا کہ بلب ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔"

"آج آپ کالج نہیں گئیں' طبیعت تو ٹھیک ہے۔" باہر سے اس آدمی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے گھر پر ہی کچھ کام کرنا تھا۔ اس لئے آج کالج نہیں گئی۔" نہ نے جواب دیا۔

باہر کھڑے ہوئی آدمی نے ایک دو اور باتیں پوچھیں اور پھر چلا گیا' شارق نے پستول سے ثمینہ اشارہ کیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"کچن میں چلو.....مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کو دو۔" شارق نے کہا۔

"کھانے کو کچھ نہیں ہے گھر میں۔" ثمینہ نے غراتے ہوئے کہا۔

"تم محض ہوا کھا کر زندہ ہو یا چھڑے مردوں کی طرح کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا کرتی ہو۔ د آگے بڑھو۔" شارق کے لہجے میں غراہٹ تھی۔

ثمینہ کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی کچن میں آ گئی۔ اس نے کنستر میں ے آٹا نکال کر گوندھا اور فرج میں سے کل رات کا بچا ہوا سالن نکال لیا۔ چولہا جلا کر پتیلی اوپر لی اور مڑ کر شارق کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کچن کے دروازے پر کھڑا تھا۔

سالن گرم ہونے کے بعد اس نے پتیلی اتار کر توا چولہے پر رکھ دی اور روٹیاں پکانے لگی۔ رق دروازے میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ تقریباً بیس منٹ بعد ثمینہ نے کھانا نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"تم نہیں کھاؤ گی۔" شارق نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" ثمینہ نے تڑ سے جواب دیا۔

"دیکھو ثمینہ۔" شارق اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارا دشمن نہیں ں۔ مجھے تم سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ مجھے حالات نے ایسا طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کر ہے' جس کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن تم کھانا پینا چھوڑ کر اپنے ساتھ دشمنی کر رہی ہو' بیمار پڑ جاؤ ا۔ چلو بیٹھو۔ کھانا کھاؤ..... تم نے صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا اور جب تک تم کھانا نہیں کھاؤ گی ں بھی نہیں کھاؤں گا۔"

ثمینہ چند لمحے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کے سامنے دوسری

کرسی پر بیٹھ گئی اور کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ شارق کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ گئی۔ اس نے بھی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

تین بج رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد تو شارق کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس جسم سے جان نکلی جا رہی ہو۔ بے پناہ سستی ہو رہی تھی۔ نیند کے بوجھ سے آنکھیں بند ہوا رہی تھیں۔ گندم کا خمار اپنا رنگ دکھانے لگا تھا' وہ آنکھیں کھلی رکھنے کی پوری کوشش کر رہا مگر کسی نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ اس کی بھی آنکھیں بند ہو اور وہ باقاعدہ ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا۔

ثمینہ بھی اپنے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے اونگھ رہی تھی۔ پھر دفعتاً" ایک ہلکی سی آواز سن چونک گئی۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی چیز زمیں پر گری ہو۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا' کرسی پر بیٹھا سو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پہلوؤں میں لٹکے ہوئے تھے اور پستول کرسی قریب فرش پر پڑا تھا۔ ثمینہ نے اس کے ہاتھ سے پستول گرنے کی ہلکی سی آواز سنی تھی۔

وہ اپنی جگہ بیٹھی چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اٹھ کر دبے قدموں چلتی ہوئی کی کرسی کے قریب پہنچ گئی۔ وہ جھک کر پستول اٹھانا ہی چاہتی تھی کہ رک گئی۔ اس کی شارق کے چہرے پر جم گئیں۔ نجانے کیا بات تھی کہ شارق کا چہرہ دیکھ کر اس کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ اسے شارق کے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت نظر آئی تھی۔ یہ قاتل کا چہرہ تھا' نہ ہی اس شخص کا چہرہ تھا جس نے گزشتہ رات سے اس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔

ثمینہ کو بس میں شارق سے پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب نوجوان وہ گزشتہ رات سے اس کی یرغمال بنی ہوئی تھی۔ وہ اگر چاہتا تو اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا لیکن اب تک اس نے بڑی شرافت کا مظاہرہ کیا تھا اور اسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

"کیا ایسا معصوم صورت نوجوان قاتل ہو سکتا ہے؟"

یہ سوال بار بار ثمینہ کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنے بارے میں جو سنائی ہو وہ محض افسانہ ہو۔

ثمینہ یہ سب کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ کال بیل کی آواز سن کر اچھل پڑی۔ اس نے کی طرف دیکھا۔ وہ غالباً گہری نیند میں تھا۔ گھنٹی کی آواز کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا' دوسرے لمحہ ثمینہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے بڑی احتیاط سے دروازہ اور باہر نکل گئی اور پھر گیٹ کے سامنے ایک آدمی کے سر پر پولیس کی ٹوپی دیکھ کر اس کا دل کر حلق میں آ گیا۔

○

شارق نیند میں تھا۔ لیکن وہ شاید اس وقت کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف تھا اور وہ بے تحاشا بھاگے جا رہا تھا۔ خونی بھیڑیئے اس کا تعاقب کر رہے تھے' وہ ان بھیڑیوں سے بچنے کے لئے جان توڑ کر دوڑ رہا تھا۔ دفعتاً" اسے ٹھوکر لگی۔ وہ لڑکھڑایا سنبھلنے کی کوشش کرتا ن دھڑام سے نیچے گرا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ نہ تو ویرانہ تھا اور نہ ہی خونخوار یے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس کے دماغ میں تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی اور جب اسے کا احساس ہوا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ ثمینہ کے مکان میں تھا اور کرسی پر بیٹھے سو گیا تھا اور نیند ہی میں کرسی سے نیچے گر گیا تھا۔

اس نے کمرے کی طرف دیکھا' ثمینہ اپنے بیڈ پر موجود نہیں تھی اور پھر دوسرے ہی لمحہ جب نے بیرونی دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا دیکھا تو کانپ کر رہ گیا اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ثمینہ پا کر فرار ہو گئی تھی۔ اسی لمحہ اسے باہر سے باتوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے ادھر ادھر اس کا پستول قریب ہی فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے پستول اٹھا لیا اور دبے قدموں چلتا ہوا کے قریب پہنچ گیا اور پردے کا ایک کونا سرکا کر باہر جھانکنے لگا۔ باہر کا منظر دیکھتے ہی اس کے ، کھڑے ہو گئے۔ پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی اور دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی سوس ہونے لگیں۔ پستول کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ دو پولیس والے گیٹ ر تھے اور ثمینہ اندر کھڑی تھی۔ وہ پولیس والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں نے کہا نا کہ بلب پھٹ گیا تھا۔ اس کی آواز سے کسی کو غلط فہمی ہوئی ہو گی۔ جی نہیں' آپ کو اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ میں گرلز کالج کی لیکچرار ہوں۔ ایک قانون پسند ہوں' کوئی بات ہوتی تو میں خاموش نہ بیٹھی رہتی۔ جی شکریہ۔"

ثمینہ کی گفتگو سن کر شارق کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا' اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو تھی' چند سیکنڈ بعد ثمینہ اندر آ گئی۔ اندر داخل ہو کر اس نے جیسے ہی دروازہ بند کیا شارق کو ے کے پیچھے کھڑکی کے قریب کھڑے دیکھ کر چونک گئی۔ شارق نے کچھ کہنا چاہا مگر ثمینہ نے پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کمرے میں آ گئی۔ شارق بھی اس کے ا۔

"پولیس والوں سے تمہاری گفتگو کا کیا مطلب سمجھوں؟" شارق نے اس کے چہرے پر نظریں ، ہوئے کہا۔ "تمہارے لئے بہترین موقع تھا' تم مجھے پولیس کے حوالے کر سکتی تھیں۔"

"ہاں۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر سکتی تھی۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "لیکن.... لیکن نجانے کیوں میں نے ایسا نہیں کیا۔"

"وہ یہاں کیوں آئے تھے؟ کیا انہیں کوئی شبہ ہوا تھا؟" شارق نے پوچھا۔

"گولی کی آواز سن کر کسی نے تھانے فون کر دیا تھا اور یہ پولیس والے تحقیقات کے لئے آئے تھے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

"لیکن وہ تو بارہ بجے کی بات تھی اور اب....." وہ خاموش ہو کر گھڑی کی طرف دیکھنے لگا "تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کا وقت گزر چکا ہے۔"

"پولیس کو تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔" ثمینہ نے کہا۔ "یہ لوگ کبھی بھی وقت پر کسی جگہ نہیں پہنچتے۔"

"لیکن.... لیکن تم نے....."

"کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔" ثمینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میری اب بھی خواہش ہے کہ تم جلد سے جلد یہاں سے چلے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "چلا جاؤں گا۔ لیکن میں تمہیں نہیں سکا۔"

ثمینہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ گھنٹی کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ ثمینہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کھڑکی کے پاس پہنچ گئی اور پردے کا کونا ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔ پھر تیزی سے واپس آ گئی۔

"محلے کی دو تین عورتیں آئی ہیں۔ انہیں میں اندر آنے سے نہیں روک سکتی۔ تم اس کمرے میں چلے جاؤ۔" اس نے ایک کمرے کے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا اور پھر خود آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

اس کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر کھیس بچھا ہوا تھا اور متعدد دھلے کپڑے پڑے تھے۔

"تم یہاں بیٹھ جاؤ.... میں کوشش کروں گی کہ ان عورتوں کو جلد سے جلد رخصت دوں۔" ثمینہ نے کہا اور باہر نکل کر دراوزہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

شارق چند لمحے کھڑا رہا پھر چارپائی پر بکھرے ہوئے کپڑے سمیٹ کر ایک طرف ڈال دیے سارے ثمینہ ہی کے کپڑے تھے۔ وہ ان کپڑوں پر تکیے کی طرح سر رکھ کر لیٹ گیا۔ کپڑوں عجیب سحر انگیز سی مہک آ رہی تھی۔ جیسے ثمینہ کے بدن کی خوشبو ان میں رچی بسی ہو۔ ایک سا خیال شارق کے ذہن میں آیا۔ اس کے دماغ پر سحر سا طاری ہونے لگا اس کی آنکھیں

گئیں اور کچھ ہی دیر بعد وہ خوابوں کی حسین وادی میں پہنچ چکا تھا۔

شارق کی آنکھ کھلی تو اپنے چاروں طرف اندھیرا دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملنے لگا۔ اسے شبہ ہو رہا تھا کہ اس کی بینائی تو زائل نہیں ہو گئی۔ پھر وہ اپنے آس پاس ٹٹولنے لگا۔ چارپائی پر بکھرے ہوئے کپڑے اور پھر اس کا ہاتھ پستول سے ٹکرا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ دماغ کی سنسناہٹ کچھ کم ہونے لگی۔ وہ ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک طرف روشنی کی بہت باریک سی لکیر نظر آئی اوپر سے نیچے' جیسے سیاہ چادر پر سونے کے تار سے لکیر کھینچ دی گئی ہو۔

وہ دروازہ تھا اور اس کی جھری سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر دروازے کے قریب آ گیا۔ یہ ڈبل پٹ والا دراوزہ تھا۔ اس نے ایک پٹ پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولنا چاہا مگر باہر سے کنڈا لگا ہوا تھا۔ اس نے دستک دے کر ثمینہ کو متوجہ کرنا چاہا مگر پھر ہاتھ روک لیا اسے یاد آ گیا کہ محلے کی کچھ عورتیں ثمینہ کے ہاں آئی تھیں اور ثمینہ نے اسے چھپانے کے لئے اس کمرے میں بند کر دیا تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کمرے میں بند ہوئے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ عورتیں اب بھی موجود ہوں۔ وہ دروازے سے کان لگا کر کسی قسم کی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر گھر پر سناٹا طاری تھا۔ نہ باتوں کی آواز آ رہی تھی اور نہ ہی کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک دروازے کے قریب کھڑا رہا پھر دوبارہ چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھیں تاریکی سے کسی حد تک مانوس ہو چکی تھیں لیکن کوئی چیز واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھا صورت حال کے بارے میں غور کرنے لگا۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ ثمینہ اسے دھوکے سے اس کمرے میں بند کر کے پولیس کو اطلاع دینے تو نہیں گئی تھی۔ لیکن نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد جب وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا تو وہ ثمینہ کے لئے بہترین موقع تھا اور پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے وہ خوفناک منظر دیکھا تھا جس سے وہ کانپ کر رہ گیا تھا۔ اس وقت ثمینہ باہر گیٹ پر کھڑی پولیس والوں سے باتیں کر رہی تھی اور انہیں یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس گھر میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اگر ثمینہ چاہتی تو اسے اس وقت پولیس کے حوالے کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

لیکن کیوں؟ گزشتہ رات اور آج دن میں ثمینہ نے اسے دھوکا دے کر گھر سے نکلنے کی کوشش کی تھی اور بار بار اسے گھر سے چلے جانے کو کہتی رہی تھی لیکن جب اسے موقع ملا تو اس نے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کسی نے فائر کی آواز سن کر پولیس کو اطلاع دی تھی اور پولیس

اس کے دروازے پر آ گئی تھی۔ وہ چاہتی تو اسی وقت اسے پولیس کے حوالے کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا بلکہ اس کا دفاع کیا تھا۔ اور کچھ دیر بعد جب محلے کی عورتیں ملنے آئی تھیں تو ثمینہ نے اسے کمرے میں بند کر دیا تھا تاکہ ان عورتوں کو بھی اس کی موجودگی کا شبہ نہ ہو سکے۔ اور وہ اس کمرے میں چارپائی پر لیٹتے ہی سو گیا تھا۔

اب شارق سوچ رہا تھا کہ ثمینہ میں یہ تبدیلی کیوں آئی تھی۔ کیا بات تھی کہ وہ اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے اس کا دفاع کرنے پر تل گئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر بعد میں بھی کسی وقت پولیس کو پتہ چل گیا کہ شارق نے یہاں پناہ لی تھی تو اسے بھی شریک جرم سمجھ کر گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو بچانے کے بجائے خطرات میں چھلانگ لگا دی تھی' لیکن کیوں؟

اس کیوں کے آگے بہت بڑا سوالیہ نشان تھا اور اس کا جواب شارق کے پاس نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کر دروازے کی جھری سے باہر جھانکنے لگا۔ سامنے ہال نما کمرے کے دوسری طرف کچن کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ مکان کے باہر گلی میں تو لوگوں کی آمد و رفت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن مکان کے اندر خاموشی تھی۔ کیا ثمینہ گھر میں موجود نہیں تھی؟ دفعتاً" اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ ثمینہ نے بھی اس کی طرح رات جاگ کر گزاری تھی۔ ممکن ہے محلے کی ان عورتوں کے جانے کے بعد وہ بھی سو گئی ہو۔

آدھا گھنٹہ مزید گزر گیا۔ شارق ایک بار پھر چارپائی سے اٹھ کر دروازے کے قریب آ گیا اور اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ کمرے کی تاریکی میں اب اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ دروازے کے دونوں طرف دیوار ٹٹولنے لگا۔ بائیں طرف سوئچ بورڈ مل گیا۔ اس نے ٹٹول کر ایک سوئچ آن کر دیا کچھ نہیں ہوا اس نے دوسرا سوئچ دبایا۔ اس مرتبہ چٹ کی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔

وہ کمرے کا جائزہ لینے لگا' یہ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ غالباً اسٹور روم کے طور پر بنایا گیا تھا۔ ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی جس پر وہ سویا تھا۔ سوئچ بورڈ والی دیوار کے ساتھ استری اسٹینڈ رکھا ہوا تھا جس پر استری بھی پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری دیوار پر کھونٹیوں پر کچھ دھلے ہوئے اور استری شدہ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے یہ ثمینہ ہی کے کپڑے ہو سکتے تھے۔

شارق کمرے میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ باہر کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی یوں لگا تھا جیسے وہ سلیپر گھسیٹ کر چل رہا ہو۔ وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگا قدموں کی آواز رک گئی اور پھر

دروازے کا کنڈا کھول دیا گیا۔ شارق دروازے کے سامنے آ گیا۔

سامنے ثمینہ کھڑی تھی۔ اس کے بال الجھے ہوئے اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں' صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سو کر اٹھی تھی۔

"تھینک گاڈ۔" شارق کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ شاید تم مجھے بھول گئی ہو یا مجھے اس کمرے میں بند کر کے گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہو۔"

"میں سو گئی تھی۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں اب بھی نیند کا خمار تھا۔

شارق نے ہال نما کمرے میں آ کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ خود بھی تین چار گھنٹے سویا تھا اور ثمینہ بھی کافی دیر سوتی رہی تھی۔ شارق غسل خانے میں گھس گیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور باہر آ گیا۔

"آٹھ بج رہے ہیں۔ تم کھانا کھاؤ گے یا چائے پیو گے۔" ثمینہ نے پوچھا۔

"کھانے کو اس وقت دل نہیں چاہ رہا۔ چائے پیوں گا۔" شارق نے جواب دیا۔ ثمینہ نے بھی پہلے غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور پھر کچن میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے ایک کپ شارق کے ہاتھ میں تھما دیا اور دوسرا خود لے کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا میں تمہاری اس تبدیلی کی وجہ جان سکتا ہوں۔" شارق نے اس کی طرف دیکھا۔

"دوپہر کو تم گہری نیند میں تھے۔ تمہارا پستول بھی ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا ہوا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھی تو میں یہی سوچ کر تھی کہ خاموشی سے باہر نکل کر شور مچا دوں کہ ایک قاتل میرے گھر میں چھپا ہوا ہے یا پستول اٹھا کر تمہیں مار دوں۔ لیکن نجانے کیوں تمہاری صورت دیکھ کر مجھے تم پر ترس آ گیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ تم پیشہ ور جرائم کرنے والے نہیں ہو۔ اس دوران دروازے کی گھنٹی بجی۔ تم گھنٹی کی آواز سن کر بھی نہیں اٹھے۔ میں اس وقت تک تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ لیکن دروازے پر پھر پولیس کو دیکھ میں نے تمہیں بچانے کا فیصلہ کر لیا۔"

"اور یہ فیصلہ تم نے دل کی آواز پر کیا تھا۔" شارق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" ثمینہ نے اسے گھورا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ میں نے تمہیں بچانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا لیکن بہتر ہو گا کہ آج رات تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میں یہ ذہنی اذیت زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی۔"

"مس ثمینہ۔" شارق نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ اس شہر میں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ میں جس دوست کے ہاں ٹھہرا تھا وہ بھی گزشتہ

رات میرے ساتھ تھا۔ اب مجھے پتہ نہیں کہ وہ پکڑا گیا ہے' مارا گیا ہے یا فرار ہو گیا تھا۔ صورتحال کچھ بھی ہو۔ اس کا گھر اب میرے لئے محفوظ نہیں ہے۔ اب تم نے مجھ پر اعتماد کر ہی لیا ہے تو مجھے ایک دو دن اور....."

"لیکن تم اس طرح یہاں نہیں رہ سکتے۔" ثمینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کسی کو پتہ چل گیا تو میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔"

"میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" شارق نے کہا۔ "میں محسن کش نہیں ہوں۔ اپنی جان تو دے سکتا ہوں مگر تم پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا۔"

"تم اپنے دوست کے پاس کہاں ٹھہرے ہوئے تھے؟" ثمینہ نے پوچھا۔ "کالو نامی اس شخص کے پاس جس کے مکان پر پولیس نے ریڈ کیا تھا؟"

"نہیں۔ میں سینما کے قریب ٹھہرا ہوا تھا۔ لیکن تم کالو کو کیسے جانتی ہوں؟" شارق نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کالو کو میں نہیں جانتی۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "وہ اس علاقے کا بدنام آدمی ہے۔ عرصہ سے یہاں منشیات کا کاروبار کر رہا ہے' اس علاقے کے لوگ کئی مرتبہ اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ کر چکے ہیں۔ آج محلے کی جو عورتیں آئی تھیں ان سے پتہ چلا کہ پولیس نے کل رات اس کے مکان پر چھاپہ مارا تھا۔ کالو فرار ہونے کی کوشش میں پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس کے باقی ساتھی تمہاری طرح بھاگ گئے تھے۔ ایک پولیس والا زخمی ہوا تھا۔ مرا کوئی نہیں۔"

"تھینک گاڈ۔" شارق نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں...."

"لیکن پولیس کو اب بھی تمہاری تلاش ہے۔" ثمینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دیکھو ثمینہ میں فطرتاً برا آدمی نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ کوئی من گھڑت افسانہ نہیں تھا۔ مجھے بچپن ہی سے ماں باپ کے پیار سے محروم کر دیا گیا۔ میرے گھر کو جلا کر راکھ کر ڈالا گیا۔ میں نے شریفانہ زندگی گزارنے کی کوشش کی لیکن یہ پولیس والے مجھے جرائم کی دلدل کی طرف دھکیلتے رہے۔ آج اگر میں جرائم پیشہ لوگوں کے زمرے میں شمار ہوتا ہوں تو یہ پولیس کی مہربانی ہے۔ میں فطرتاً بدکردار نہیں ہوں' میری ماں ہے' ایک پیاری سی بہن ہے لیکن مجھے ان کے پیار سے بھی محروم رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں کبھی ان سے ملنے جاتا ہوں تو چھپ کر.....چوروں کی طرح۔"

"لیکن ابھی تم نے بتایا تھا کہ تمہارے ماں باپ کو قتل کر دیا گیا تھا اور تم ہی کو ان کا قاتل قرار دے کر عمر قید کی سزا دلوائی گئی تھی۔" ثمینہ نے اسے گھورا۔

"ہاں.....یہ درست ہے۔" شارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "شیطانوں کی اس دنیا میں کچھ فرشتہ صفت لوگ بھی بستے ہیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر مریم اور رضیہ کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "مریم نے مجھے ماں کی ممتا دی اور رضیہ سے مجھے بہن کا پیار ملا۔ اگر مجھے ان کا سہارا نہ ملتا تو شاید میں خودکشی کر چکا ہوتا۔"

ثمینہ جواب دینے کے بجائے اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ کچھ کہے بغیر خالی کپ اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ شارق کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر اس میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا جہاں ثمینہ بیٹھ کر اسٹڈی کیا کرتی تھی۔ میز پر کچھ کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ میز کے ساتھ دیوار پر تین شیلف بنے ہوئے تھے۔ ان میں بھی کچھ کتابیں آراستہ تھیں۔ سب سے اوپر والے شیلف میں خواتین کے لکھے ہوئے کچھ ناول رکھے ہوئے تھے۔ شارق نے ایک ناول اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ثمینہ کچن میں مصروف تھی۔ اب صورت حال مختلف تھی۔ ثمینہ کے ذہن سے بھی بڑی حد تک خوف زائل ہو گیا تھا اور شارق بھی مطمئن تھا کہ ثمینہ اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرے گی۔

دس بجے کے قریب ثمینہ نے کھانا میز پر لگا دیا۔ ان دونوں نے اکٹھا بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ثمینہ نے برتن وغیرہ سمیٹ لئے۔ شارق پھر وہی ناول لے کر بیٹھ گیا تھا۔ ثمینہ ایک کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

"کل رات سے اب تک میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں ثمینہ۔" شارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں پریشانی اٹھانا پڑی۔ تم اگر چاہو تو اپنے بستر پر جا کر سو جاؤ۔ میں یہیں دری پر سو رہوں گا۔"

"گویا آج تمہارا یہاں سے جانے کا پروگرام نہیں ہے۔" ثمینہ نے اسے گھورا۔

"نہیں۔" شارق نے نفی میں سر ہلایا۔

ثمینہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے بیڈ پر دو تکیے تھے۔ اس نے ایک تکیہ اٹھا کر شارق کی کرسی کے قریب دری پر پھینک دیا اور کمرے کا دروازہ بھیڑ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

ثمینہ بستر پر لیٹے دیر تک شارق کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کی سمجھ میں خود بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس نے شارق کو پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا تھا اور وہ اس پر اعتماد کیوں کرنے لگی تھی۔ گزشتہ رات اور آج دن میں شارق نے اگر کسی اخلاقی رویئے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ واقعی شریف آدمی ہے۔ وہ دیر تک شارق کے بارے میں

سوچتی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ وہ عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھی۔ کبھی اس کے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑ جاتیں اور کبھی وہ گدگداہٹ سی محسوس کرنے لگتی۔ اس نے سامنے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا' ایک بجنے والا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز اس کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ وہ پلنگ سے اٹھ کر دبے قدموں دروازے کے قریب آ گئی۔ اس نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا۔ شارق دری پر سو رہا تھا۔ اس نے دونوں ٹانگیں اس طرح سمیٹ رکھی تھیں جیسے سردی لگ رہی ہو۔ اس نے مڑ کر اپنے بستر پر رکھی ہوئی چادر اٹھائی اور دبے قدموں کمرے سے نکل کر شارق کے قریب آ گئی۔ اس نے چادر شارق پر ڈال دی اور دوبارہ کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ شارق کا خیال اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ شارق کا چہرہ بار بار اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا۔ کبھی اس کا چہرہ بہت بھیانک ہو جاتا اور کبھی اس قدر معصومیت آ جاتی کہ فرشتے بھی رشک کرنے لگیں۔

ثمینہ بار بار سر جھٹک رہی تھی۔ وہ شارق کے بارے میں کیوں سوچ رہی تھی۔ اس کا شارق سے کیا تعلق ہے۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے بالآخر اس کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے جھکنے لگیں اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

○

ثمینہ کے کمرے میں جانے کے بعد شارق کافی دیر تک کرسی پر بیٹھا وہ ناول پڑھتا رہا۔ دو محبت کرنے والے دلوں کی کہانی تھی اور بڑے دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی تھی۔ بعض جملے بڑے خوبصورت تھے اور انہیں انڈر لائین کیا ہوا تھا ان جملوں کو پڑھ کر دل میں عجیب گدگداہٹ سی ہوتی تھی۔

وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو دری پر لیٹ کر پڑھنے لگا۔ ثمینہ ایک تکیہ اس کے قریب پھینک گئی تھی جسے اس نے فولڈ کر کے سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ کتاب دلچسپ تھی۔ چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔ اس نے کتاب کا وہ صفحہ موڑ دیا اور کتاب میز پر رکھ کر دری پر لیٹ گیا۔ اسے کچھ خنکی سی محسوس ہو رہی تھی لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

وہ بڑی گہری نیند سویا تھا۔ ناول کے بعض مناظر اور جملے اس قدر خوبصورت تھے کہ اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئے تھے اور نیند میں اسے حسین سپنے دکھاتے رہے تھے۔ وہ ایک وادی میں گھوم رہا تھا۔ یہ وادی فطرت کا حسین ترین شاہکار تھی۔ اس کے چاروں طرف سبزہ تھا۔ رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ دور بہت دور پہاڑ کی برف پوش چوٹی جیسے آسمان کو چھونے کی

کوشش کر رہی تھی۔ گنگناتی ہوئی ندیاں آبشاریں اور چھوٹی چھوٹی چٹانوں میں بہتے ہوئے شفاف پانی کے جھرنے.....خاموش فضا میں پانی گرنے کی آواز بڑا دلفریب تاثر دے رہی تھی۔

پھر اسے یوں لگا جیسے کوئی ان دیکھی قوت اسے ہاتھ سے پکڑ کر گنگناتے ہوئے جھرنے کی طرف لے جا رہی ہو' پتھروں میں چلتے ہوئے اس کا پیر رپٹ گیا۔ وہ لڑکھڑایا اور اس نے گرنے سے بچنے کے لئے ایک جھاڑی کی شاخ کو پکڑ لیا۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کسی جھاڑی کی شاخ نہیں تھی۔ اس نے قریب پڑی ہوئی کرسی کا پایہ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے کروٹ بدل لی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ چونک گیا۔ اس کے اوپر چادر پڑی ہوئی تھی حالانکہ اسے یاد تھا کہ جب وہ سونے کے لئے لیٹا تھا تو اس کے پاس کوئی چادر وغیرہ نہیں تھی۔ اسے ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ کسی جھرنے سے پانی گرنے کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے آنکھیں چمچماتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا کمرے میں تیز روشنی والے بلب کے بجائے نیلگوں روشنی والا نائٹ بلب جل رہا تھا اور کھڑکی سے دن کا ہلکا ہلکا اجالا جھانک رہا تھا۔ پانی گرنے کی آواز دائیں طرف سے آ رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا اس طرف باتھ روم تھا اور غالباً شاور کھلا ہوا تھا جس سے پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے ثمینہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا مگر ثمینہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ثمینہ باتھ روم میں تھی۔

چند منٹ بعد پانی گرنے کی آواز بند ہو گئی۔ شارق بظاہر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا لیکن وہ پلکوں میں معمولی سی جھری پیدا کئے باتھ روم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بڑی آہستگی سے باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ ثمینہ نے باتھ روم کے دروازے کی آڑ سے جھانک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

شارق کو سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ثمینہ ایک بڑا تولیہ جسم پر لپیٹے باتھ روم سے باہر نکلی تھی۔ تولیہ پوری طرح اس کی ستر پوشی نہیں کر پا رہا تھا۔ لمبے سیاہ بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور نیلگوں روشنی میں جسم کے بعض حصوں پر پانی کے قطرے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ شارق نے اپنا سانس روک لیا۔ ثمینہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی ننگے پیر دری پر دبے قدموں چلتی ہوئی تیزی سے اپنے کمرے میں گھس گئی اور اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

شارق کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا وہ دری پر لیٹا بند دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کروٹ بدل لی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دوبارہ سونے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ چشم تصور سے دلفریب منظر دیکھنے لگا۔ پانی ٹپکاتی ہوئی سیاہ زلفیں اور مرمریں بدن

پر موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے پانی کے قطرے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ ثمینہ باہر نکلی۔ اس نے تولیہ پگڑی کی طرح سر پر لپیٹ رکھا تھا۔ پشت پر تولئے کے باقی حصے میں اس کی سیاہ زلفیں لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کچن میں آ گئی۔ اس وقت سات بج رہے تھے۔ باتھ روم میں جانے سے پہلے اس نے دودھ لے لیا تھا۔ کچن میں آ کر اس نے چولہا جلایا اور دودھ کی پتیلی اوپر رکھ دی۔

شارق کچھ دیر تک لیٹا رہا تھا پھر کروٹ بدلتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا' اس نے کچن کی طرف دیکھا۔ ثمینہ وہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ چند منٹ بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا اور کچن کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔

"تولیہ۔" اس نے کہتے ہوئے ثمینہ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"تولیہ۔" ثمینہ گڑبڑا گئی۔ "وہ وہاں کرسی پر رکھا ہے۔"

شارق چند لمحے ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا۔ دوپٹے کے بغیر وہ شارق کو خاصی بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ثمینہ اس کی نظروں کا مرکز تاڑ کر جز بز سی ہو کر رہ گئی۔ اس نے رخ بدل لیا اور کیتلی میں چائے کا پانی رکھنے لگی۔ شارق واپس مڑ گیا اور کرسی کی پشت پر رکھا ہوا تولیہ اٹھا کر منہ پونچھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ثمینہ چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے ایک کپ شارق کے سامنے رکھ دیا اور اپنا کپ میز کے کنارے پر رکھ کر میز پر بکھری ہوئی کتابیں اور کاغذ سمیٹنے لگی۔ اس نے کاغذ ایک رجسٹر میں رکھ دیئے اور دو کتابیں رجسٹر کے اوپر رکھ کر انہیں الگ رکھ دیا۔ پھر وہ دوسری کرسی پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگی۔

"میں آج کالج جاؤں گی۔" اس نے شارق کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "روٹیاں پکا کر رکھ جاؤں گی۔ فرج میں انڈے رکھے ہوئے ہیں۔ آملیٹ بنا کر کھا لینا۔"

شارق جواب دینے کے بجائے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے میز پر سے ایک کاغذ اٹھا کر اپنے سامنے رکھ دیا اور بال پین سے اس پر کچھ لکھنے لگا۔ پھر کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تمہارے کالج کے راستے میں گارمنٹس کی کوئی دکان تو ضرور ہو گی۔ ایک پینٹ اور ایک شرٹ لیتی آنا..... یہ پیسے رکھ لو۔" اس نے جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ "کپڑوں کو ڈبوں سے نکال کر کسی تھیلے میں ڈال لینا۔ یہاں آتے ہوئے ڈبے کسی کی نظروں میں آ گئے تو شبہ ہو گا۔"

ثمینہ نے کاغذ اٹھا کر دیکھا۔ اس پر پینٹ شرٹ کا ناپ لکھا ہوا تھا۔ اس نے وہ کاغذ بھی رجسٹر

میں رکھ لیا۔

"پینٹ شرٹ کس کلر میں؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے شارق کی طرف دیکھا۔

"اپنی پسند سے کسی بھی کلر میں لے آنا۔" شارق نے کہا۔ "تمہارا مطالعہ کا ذوق تو بہت عمدہ ہے۔ اپنے لباس کے معاملے میں بھی تمہارا ذوق بہت اچھا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مردانہ لباس میں تمہارا انتخاب کیا ہے۔ ویسے تمہاری واپسی کتنے بجے ہو گی۔"

"عام طور پر تین بج جاتے ہیں۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

چائے پینے کے بعد وہ ایک بار پھر کچن میں گھس گئی اور ناشتے کے لئے پراٹھے بنانے لگی۔ پونے آٹھ بجے کے قریب ان دونوں نے بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ شارق اس دوران کن انکھیوں سے بار بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سوا آٹھ بجے ثمینہ گھر سے رخصت ہو گئی۔ اس نے مکان کے باہر تالا لگا دیا تھا۔ عام طور پر وہ ساڑھے سات بجے گھر سے نکلتی تھی۔ آٹھ بجے کالج شروع ہوتا تھا۔ لیکن آج اسے اچھی خاصی دیر ہو گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد شارق نے تمام کھڑکیوں کی پردے برابر کر دیئے اور وہی ناول لے کر بیٹھ گیا۔ کہانی خاصی دلچسپ تھی۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک کرسی پر بیٹھا ناول پڑھتا رہا۔ پھر اٹھ کر ثمینہ والے کمرے میں آ گیا اور اس کے پلنگ پر نیم دراز ہو کر پڑھنے لگا۔ ثمینہ کے بستر پر لیٹے ہوئے اسے عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ وہ کتاب پڑھتے پڑھتے سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو دو بج رہے تھے۔ بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور کچن میں آ گیا۔ فرج میں سے دو انڈے نکالے اور ایک پیالے میں توڑ کر پھینٹنے لگا۔ نمک مرچ ملا کر اس نے توا چولہے پر رکھا اور آملیٹ بنانے لگا۔ اس توے پر اس نے روٹیاں بھی گرم کر لی تھیں۔

وہ روٹی کھا رہا تھا کہ باہر رکشہ رکنے کی آواز سنائی دی۔ صبح سے اب تک کئی رکشے گلی میں آئے تھے لیکن یہ رکشہ دروازے کے بالکل سامنے آ کر رکا تھا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا' اس کا خیال درست نکلا وہ ثمینہ ہی تھی۔ جب وہ باہر کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں کتابوں اور رجسٹر کے علاوہ دو پھولے ہوئے شاپنگ بیگ بھی تھے۔ کندھے پر پرس بھی ٹنگا ہوا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے باہر کا گیٹ بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ دروازے کے قریب پہنچی تو شارک نے لاک والی ناب ہٹا کر آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔

"اوہ۔" ثمینہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "تو تم یہاں کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔"

"میں ابھی کھانا کھانے بیٹھا تھا' دروازے پر رکشہ رکنے کی آواز سنی تو اٹھ کر جھانکنے لگا.... آؤ پہلے کھانا کھالو' میں نے ابھی ابھی آملیٹ بنایا ہے' روٹی بھی گرم کرلی ہے۔" شارق نے کہا۔

ثمینہ نے رجسٹر کتابیں اور دونوں شاپنگ بیگ میز پر ایک طرف رکھ دیئے اور اسکے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے پہلا نوالہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔

"یہ آملیٹ بنایا ہے' اور یہ.....یہ تم کھا رہے ہو۔" اس نے شارق کو گھورا۔

"کیوں.....کیا ہوا؟ ذرا سا نمک ہی تو تیز ہوا ہے۔" شارق بولا۔

"ذرا سا۔" ثمینہ بولی۔ "زہر کی طرح کڑوا ہو رہا ہے یہ آملیٹ۔ اسے چھوڑو۔ میں دوسرا بنا کر لاتی ہوں۔" وہ پلیٹ اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ دوسرا آملیٹ بنا کر لے آئی۔

"کھانے کے بعد ثمینہ نے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھ دیئے اور واپس آکر میز پر رکھا ہوا ایک شاپنگ بیگ کھولنے لگی۔ اس نے ایک پینٹ اور شرٹ نکال کر شارق کے سامنے رکھ دی۔

"مجھے تو یہی کلر اچھے لگے تھے۔۔ اب تمہیں پسند آتے ہیں یا نہیں۔"

"قائل ہو گیا تمہارے ذوق کا۔" شارق مسکرا دیا۔ "بہت اچھے کلر ہیں۔"

"شکریہ۔" ثمینہ نے کہتے ہوئے دوسرا تھیلا اٹھا لیا اور کچن میں چلی گئی۔ اس تھیلے میں گوشت اور سبزی وغیرہ تھی۔ اس نے سبزی اور گوشت فرج میں رکھ دیا اور دوبارہ شارق کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میرا خیال ہے آج تمہیں چلے جانا چاہئے۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم پڑھے لکھے ہو۔ تمہیں یہ بھی احساس ہونا چاہئے کہ عزت ہی عورت کا سرمایہ ہوتا ہے۔ ایک بار اس کی عزت پر حرف آجائے تو وہ جیتے جی مرجاتی ہے۔"

"تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں' میں آج ہی چلا جاؤں گا۔ لیکن...."

"لیکن کیا؟" ثمینہ الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہیں یہ وعدہ کرنا ہو گا کہ میں دوبارہ جب بھی یہاں آؤں مجھے یہ دروازہ کھلا ہوا ملے گا۔" شارق نے جواب دیا۔

"کک.....کیا مطلب.....کیا تم....؟" ثمینہ ہکلا کر رہ گئی۔

"یہ دنیا بہت چھوٹی سی ہے۔" شارق نے کہا۔ "انسان بچھڑنے کے بعد دوبارہ کہیں نہ کہیں مل ہی جاتا ہے۔ اب دیکھ لو چند روز پہلے ہم بس میں ملے تھے۔ اس کے بعد یہاں ہماری ملاقات ہو گئی۔ ملاقات پھر بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگلی مرتبہ جب یہاں آؤں گا تو

تمہیں اس طرح مجھے چھپانے یا مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔"

"تم نے عجیب سی الجھن میں مبتلا کر دیا ہے مجھے۔" ثمینہ بولی۔ "سب محلے والے جانتے ہیں کہ میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ میرا کوئی رشتہ دار یہاں نہیں ہے۔ کسی کا یہاں آنا جانا نہیں ہے' میرا چھوٹا بھائی لاہور سے مہینے میں ایک آدھ بار یہاں آجاتا ہے اسے میرے پڑوسی بھی جانتے ہیں۔ لیکن ایک اجنبی....."

"اجنبی میں دوسروں کے لئے ہوں گا تمہارے لئے نہیں۔" شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس معاشرے میں انسان اکیلا نہیں ہے۔ اس کے عزیز و اقارب اور دیگر ملنے ملانے والے بھی ہوتے ہیں۔ اگر تم یہاں اکیلی رہتی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمہیں کوئی ملنے کے لئے بھی یہاں نہیں آسکتا۔"

"تم میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔" ثمینہ بولی۔

"میں تمہاری بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ بہرحال' اب اس موضوع پر مزید بحث نہیں ہو گی۔" شارق نے کہا۔

ثمینہ خاموش ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ یہ اچھی زبردستی تھی کہ وہ اسے یہاں آنے سے منع نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر کے بستر پر لیٹ گئی۔

پانچ بجے وہ کمرے سے نکلی۔ اس نے شارق کو چائے بنا کر دی اور کچن میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ تقریباً سات بجے وہ شارق کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس مرتبہ وہ فرسٹ ایڈ باکس بھی لے آئی تھی۔

"لاؤ۔ میں تمہاری ڈریسنگ کر دوں۔"

شارق نے پتلون کا پائنچہ اوپر اٹھا کر ٹانگ آگے کر دی۔ ثمینہ دری پر بیٹھ گئی تھی اس نے پٹی کھول کر ایک بار پھر زخم کو صاف کیا اور ڈریسنگ کر دی۔

"یہاں سے جانے کے بعد چند روز کہیں آرام سے بیٹھ جانا اور کسی ڈاکٹر کو بھی دکھا دینا۔ زخم خراب ہو گیا تو زندگی بھر کا روگ بن جائے گا۔" ثمینہ نے کہا اور فرسٹ ایڈ باکس سنبھال کر ہاتھ دھونے کے لئے باتھ روم میں چلی گئی۔

"آرام تو مجھے اسی گھر میں مل سکتا ہے اور تم جیسی دیکھ بھال کرنے والی ہو تو ٹانگ تو کیا دل کے زخم بھی بھر جائیں گے۔" شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شارق۔" ثمینہ نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے اپنے بارے

میں جو کچھ بتایا ہے وہ سچ ہے؟"

"مجھے افسانے گھڑنے نہیں آتے۔" شارق نے جواب دیا۔

ثمینہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے جو سوچ کر شارق سے یہ بات پوچھی تھی' اسے زبان پر نہیں لا سکی۔ وہ کچھ دیر تک وہاں بیٹھی رہی اور پھر باورچی خانے میں آ گئی۔

"تم کالج میں لیکچرار ہو' تنخواہ بھی معقول ہو گی۔ گھر کے کام کاج کے لئے کوئی ملازمہ کیوں نہیں رکھ لیتیں۔" شارق نے پوچھا وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر کچن کے دروازے پر آ گیا تھا۔

"ملازمہ..... رکھی تھی ایک مرتبہ۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "آدھا راشن وہ چرا کر اپنے گھر لے جاتی تھی اور گھر کا آدھے سے زیادہ کام مجھے ہی کرنا پڑتا تھا۔"

"ہاں' آج کل یہی سب کچھ تو ہو رہا ہے۔" شارق بولا۔ وہ دروازے میں کھڑا گہری نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نو بجے کے لگ بھگ ثمینہ نے کھانا تیار کر کے میز پر لگا دیا۔ وہ دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے' کھانے کے بعد دس بجے کے لگ بھگ شارق نے باتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کیا۔ میلی قمیض اور پینٹ باتھ روم ہی میں ٹنگی رہنے دی۔

"وہ کپڑے میں یہیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ انہیں ضائع کر دینا۔ بہتر ہو گا کہ جلا کر ان کی راکھ فلش میں بہا دینا۔" شارق نے کہا۔

"تو تم واقعی جا رہے ہو۔" ثمینہ نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو کیا مجھے نہیں جانا چاہئے۔" شارق بولا۔

"نن..... نہیں' میرا یہ مطلب نہیں ہے۔" ثمینہ جلدی سے بولی۔ "تمہارا چلے جانا ہی بہتر ہے۔"

شارق چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"میری وجہ سے تمہیں جو دکھ پہنچا ہے اس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں۔ اب ذرا دروازے پر جا کر دیکھنا۔ اگر گلی میں راستہ صاف ہو تو میں نکل چلوں۔"

ثمینہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ شارق دروازے کی آڑ میں رک گیا۔ ثمینہ نے آگے بڑھ کر آہستگی سے باہر کا گیٹ کھولا اور گلی میں ادھر ادھر جھانکنے لگی۔ دو آدمی گلی میں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ ان کے علاوہ گلی میں اور کوئی نہیں تھا۔ ابھی ساڑھی دس ہی بجے تھے۔ گلی میں کوئی بھی آ سکتا تھا یا کسی گھر سے کوئی نکل سکتا تھا۔ ثمینہ چند لمحے گلی میں ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر اس نے پیچھے مڑ کر اشارہ کر دیا۔

شارق دروازے سے نکل کر گیٹ کے قریب آ گیا۔ ثمینہ راستے میں کھڑی تھی۔ اس نے ثمینہ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف ہٹایا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت سے ثمینہ کے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ شارق نے ادھر ادھر جھانکا اور گیٹ سے نکل کر اسی طرف چل دیا جس طرف دو آدمی جا رہے تھے۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے مڑ کر دیکھا۔ ثمینہ اب بھی گیٹ میں کھڑی تھی۔ شارق مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگا۔

ثمینہ نے آہستگی سے گیٹ بند کر دیا اور تیزی سے کمرے میں آ کر دروازہ بند کیا اور اس سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دائیں ہاتھ سے بائیں بازو کو اسی جگہ سے سہلا رہی تھی جہاں شارق نے گیٹ سے نکلتے ہوئے ہاتھ رکھا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شارق نے اب بھی اس کے بازو پر گرفت جما رکھی ہو۔ اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ کمرے میں آ کر زمین پر گر گئی۔

ثمینہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ شارق کا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کر رہا تھا۔ وہ اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کرتی۔ شارق سے اس کا کیا تعلق تھا؟ وہ قاتل ہے' پولیس کو مطلوب ہے۔ وہ پولیس سے چھپنے کے لئے بھاگا پھر رہا ہے۔ وہ کسی بھی وقت پولیس کے ہاتھ آ سکتا ہے۔ وہ اس کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہے؟ شریف لوگ تو ایسے لوگوں کے سائے سے بھی بچتے ہیں۔ وہ زبردستی اس کے گھر میں گھس آیا تھا اور دل کی زد پر اسے یرغمال بنائے رکھا تھا ایسے جرائم پیشہ آدمی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ اگر آئندہ وہ یہاں آئے تو اسے گھر میں گھسنے کی اجازت نہ دی جائے۔

لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیتی اور شارق کا چہرہ ایک شریف انسان کی حیثیت سے اس کے سامنے ابھر آتا۔ حالات نے اسے جرائم کی دلدل میں دھکیل دیا تھا ورنہ وہ شریف آدمی تھا۔ اس کی رگوں میں شریف ماں باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔ اگر اس میں انسانی شرافت نہ ہوتی تو وہ ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے ایک جوان عورت کو اس طرح نظر انداز نہ کرتا جبکہ وہ مکمل طور پر بے بس اور اس کے رحم و کرم پر تھی۔

ثمینہ کا دماغ ایسے ہی گنجلک خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور بالآخر یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح گھنٹی کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھولتے ہی اس نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ پونے چھ بجے تھے۔ دودھ والا عام طور پر چھ بجے آتا تھا۔ کبھی وہ چند منٹ آگے پیچھے ہو جاتا تھا۔ وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی اور پتیلی دھونے لگی۔ اس دوران گھنٹی ایک بار پھر بجائی

گئی۔

"آ رہی ہوں بھئی آ رہی ہوں۔" وہ کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے جیسے ہی باہر کا گیٹ کھولا اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے سامنے دودھ والا نہیں دو پولیس والے کھڑے تھے۔

○

شارق کو راستوں کا پتہ نہیں تھا۔ وہ گلیوں ہی گلیوں میں چلتا ہوا تقریباً پندرہ منٹ بعد مین روڈ پر نکل آیا۔ یہاں ایک دو ریسٹورنٹ اور چند دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ بائیں طرف کچھ فاصلے پر ایک سینما ہاؤس نظر آ رہا تھا۔ اس طرف رونق کچھ زیادہ تھی شارق اس سینما کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے جانا کس طرف ہے۔

وہ سڑک پر کھڑا چند لمحے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر ایک ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ کچھ نوجوان بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے' شارق ایک خالی میز پر بیٹھ گیا اس نے ویٹر کو اشارہ کر کے چائے منگوائی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

چائے پینے کے بعد وہ زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھا۔ وہ اٹھ کر کاؤنٹر پر آ گیا جہاں ایک ادھیڑ عمر باریش آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ شارق نے پانچ کا نوٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کونسی جگہ ہے؟" اس نے باریش آدمی سے پوچھا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟" باریش آدمی نے دو روپے لوٹاتے ہوئے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں دراصل لاہور سے پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں۔ رہائش منروا سینما کے قریب ہے۔ ایک دوست کے ساتھ شام کو جناح کالونی آیا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مجھے راستوں کا پتہ نہیں ہے۔" شارق نے جواب دیا۔

"یہ آگے نادر سینما ہے اور اس سے آگے زرعی یونیورسٹی۔" باریش آدمی نے کہا۔ پھر سڑک پر بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اسی طرف آگے نڈوالا اڈہ ہے۔ وہاں سے گھنٹہ گھر چلے جاؤ تو جھنگ بازار سے ہوتے ہوئے سیدھا منروا پہنچ جاؤ گے۔ لیکن فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ کسی تانگے یا رکشے پر بیٹھ جاؤ۔"

"جی شکریہ۔" شارق کہتے ہوئے ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔

وہاں کوئی رکشہ یا تانگہ نہیں تھا۔ وہ سڑک پر رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد سینما کی طرف سے ایک رکشہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ شارق نے اسی رکنے کا اشارہ کیا۔

"منروا سینما۔" وہ رکشہ میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"پندرہ روپے ہوں گے جی۔" ڈرائیور نے کہا۔

"ٹھیک ہے چلو تو۔" شارق بولا۔

رکشہ حرکت میں آ گیا اور نڈوالے اڈے سے گھنٹہ گھر کی طرف جانے کی بجائے دائیں طرف مڑ گیا اور دھوبی گھاٹ کے سامنے ریز ہوٹل کے ساتھ والی سڑک پر واقع پولیس چوکی کے قریب سے ہوتا ہوا نہر کے پل کی طرف مڑ گیا۔ شارق نے پل سے پہلے ہی رکشہ رکوا لیا اور ڈرائیور کو پیسے دینے کے بعد بھی وہیں کھڑا رہا۔ رکشہ نہر کا پل پار کر کے سینما کی طرف مڑ گیا تھا۔ شارق کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ پل کی طرف چلنے لگا۔

پل پر اس وقت بھی خوانچے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پھلوں کے ایک چھابڑے کے پاس رک گیا۔ وہاں سے صادق کے بھتیجے کا کھوکھا نظر آ رہا تھا۔ پان کے کھوکھے یا اس کے قریب ہوٹل میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔

"بتا سکتے ہو صادق کہاں ملے گا؟" شارق نے چھابڑے والی سے پوچھا۔

"ہوٹل میں بیٹھا ہے۔ چلے جاؤ۔" چھابڑے والے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اب شارق کو اطمینان ہو گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا پان کے کھوکھے کے قریب سے گزر کر ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ صادق کونے میں اپنی مخصوص میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ آدمی جیسے ہی رخصت ہوا شارق اس کے قریب پہنچ گیا۔

"اوئے شارق باؤ۔" صادق نے گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ نہ کسی تھانے میں تمہارا پتہ چلا نہ کہیں اور سے' کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"لمبی کہانی ہے۔ اطمینان سے سناؤں گا۔" شارق نے جواب دیا۔ "یہاں کے حالات کیسے ہیں؟ پولیس تم تک تو نہیں پہنچی؟"

"حالات بالکل ٹھیک ہیں۔ پولیس کے ساتھ یہ لکن میٹی تو ہوتی رہتی ہے' چلو گھر چل کر بات کرتے ہیں۔ میں ابھی اٹھنے ہی والا تھا۔" صادق کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ دونوں ہوٹل سے باہر نکلے تو سامنے ایک خالی رکشہ آ کر رکا۔ ڈرائیور رکشے سے اتر کر سڑک سے چلتا ہوا صادق کے قریب آ گیا۔

"استاد ایک...."

"کل آنا پتر۔ مال ختم ہو گیا ہے۔" صادق نے اس کو بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا۔ "یا ایسا کرو بیڑے سے لے لو آج۔"

"اس کے پاس تو ملاوٹ والا مال ہوتا ہے استاد۔ اس لئے تو تمہارے پاس آتے ہیں۔"

"یہاں تو ہر چیز میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ زہر میں ملاوٹ سے کیا فرق پڑتا ہے۔ زہر تو زہر ہی ہوتا ہے۔ آج اسی پر گزارہ کر لو۔ کل میرے پاس آ جانا۔ چل شارق باؤ۔" صادق کہتے ہوئے شارق کے ساتھ چل پڑا۔

"میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔" صادق نے گھر پہنچ کر کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ تم پولیس کے ہاتھ آ گئے ہو یا مارے گئے ہو۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہوئی مجھے تسلی ہوئی لیکن پریشانی اس بات کی تھی کہ تم غائب کہاں ہو گئے تھے؟"

"مرنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔" شارق نے جواب دیا۔ "ٹانگ میں گولی لگی تھی۔" اس نے پینٹ کا پائنچہ اٹھا کر ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹی دکھائی۔ "میں دوڑتا ہوا پتہ نہیں کس طرف نکل گیا تھا۔ وہاں سے بہت دور ایک جھگی میں پناہ مل گئی۔ دو دن میں نے اس جھگی ہی میں گزارے ہیں۔ دوسرے دن مجھے اس جھگی والے سے پتہ چل گیا تھا کہ کالو پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے اور باقی بھاگ گئے ہیں۔"

"کالو کو تو مرنا ہی تھا۔" صادق نے جواب دیا۔ "وہ کئی دنوں سے پولیس کو تنگ کر رہا تھا۔ تم ہی سوچو شارق باؤ۔ ایسے کام پولیس کی مرضی کے بغیر کئے جا سکتے ہیں؟ کالو نے پولیس کو نہ صرف بھتہ دینا بند کر دیا تھا بلکہ انہیں آنکھیں بھی دکھانے لگا تھا۔ اس رات اڑا دیا پولیس نے۔"

"کیا پولیس یہاں بھی پہنچی تھی؟" شارق نے پوچھا۔

"جب ایسی کوئی بات ہوتی ہے تو پولیس پورے شہر میں ہم جیسے لوگوں کے خلاف کارروائی شروع کر دیتی ہے۔ پولیس کی اس کارروائی کا مطلب صفایا نہیں ہوتا بلکہ رقم جمع کرنا ہوتا ہے۔ مجھ سے بھی پانچ ہزار روپے لے گئے تھے۔ بطور چندہ۔"

وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر صادق تو سو گیا مگر شارق کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کا ذہن ثمینہ کے خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ ثمینہ کا خیال ایک لمحہ کو بھی ذہن سے نہیں نکال سکا تھا۔ وہ منظر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا جب اس نے ثمینہ کو باتھ روم سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔

شارق نے پہلی مرتبہ کسی عورت کے بارے میں اس انداز میں سوچا تھا۔ ثمینہ نے اس کے سینے میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ اس کے سینے میں ہلچل تو اسی وقت مچی تھی جب اس نے پہلی مر

ثمینہ کو دیکھا تھا اور ایک ہی سیٹ پر بیٹھ کر بس میں سفر کیا تھا۔ اس سفر کے اختتام پر ان کے راستے مختلف ہو گئے تھے۔ ممکن ہے شارق اسے بھول جاتا لیکن قسمت دوبارہ اسے ثمینہ کے پاس لے گئی تھی۔ اس مرتبہ وہ ایک مفرور کی حیثیت سے ثمینہ کے سامنے آیا تھا۔ ثمینہ نے دو مرتبہ اس سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور جب اسے موقع ملا تھا تو وہ اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے اس کا دفاع کر رہی تھی۔ اس طرح اس نے اپنے آپ کو بھی خطرے میں ڈال لیا تھا۔ ثمینہ نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یہ محض انسانی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس تبدیلی کے پیچھے کوئی اور راز پوشیدہ تھا اور وہ راز کیا تھا؟ کیا ثمینہ بھی اس کی طرح.....

شارق اس سے آگے کچھ نہیں سوچ سکا تھا۔ ثمینہ ایک تعلیم یافتہ عورت تھی کالج میں لیکچرار تھی اور وہ ایک مجرم..... ثمینہ اس کے بارے میں کسی اور رخ پر کیسے سوچ سکتی تھی لیکن شارق ں کے خیال کو ذہن سے نہیں نکال سکا تھا۔ اسے ثمینہ کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس نے اسے بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ چند روز کے لئے کہیں آرام سے بیٹھ جائے تاکہ اس کا زخم نہ بگڑ جائے۔ یہ مشورہ اور دوسری باتیں محض انسانی ہمدردی کی وجہ سے نہیں ہو سکتی تھیں۔ ضرور کوئی اور بات تھی۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے شارق نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

رات کو وہ اگرچہ دو بجے کے لگ بھگ سویا تھا لیکن صبح چھ بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے صحن میں رکھے ہوئے ڈرم سے منہ ہاتھ دھویا اور کمرے میں آ کر لباس تبدیل کرنے کے بعد اپنی چیزیں بریف کیس میں سنبھالنے لگا۔ اسی دوران صادق بھی بیدار ہو گیا۔

"کیا بات ہے شارق باؤ؟ کہیں جا رہے ہو کیا؟" صادق نے پوچھا۔

"ہاں۔" شارق نے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے میں آج واپس آ جاؤں یا چند روز کسی کا مہمان رہوں۔"

"تم دو دن کسی کی جھگی میں رہے تھے نا؟" صادق نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں..... کیوں؟" شارق نے پوچھا۔

"اس جھگی والے کی کوئی جوان بیٹی تو نہیں؟" صادق نے پوچھا۔

"اوہ؟" شارق کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اور اس قسم کی باتوں سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر کہاں جا رہے ہو یار۔ مجھ سے بھی چھپا رہے ہو؟" صادق نے اسے گھورا۔

"میں نے سوچا یہاں بیکار بیٹھے رہنے کے بجائے تھوڑی سیر ہو جائے۔ جھنگ جا رہا ہوں۔

وہاں میرے ایک دو جاننے والے وہاں بھی ہیں۔" شارق نے جواب دیا۔

"تو پھر ناشتہ کر کے جانا۔" صادق چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں بے بے سے کہہ کر ناشتہ بنواتا ہوں۔ صبح سویرے گھر سے خالی پیٹ نکلنا اچھا نہیں ہوتا۔"

ناشتہ وغیرہ کر کے جب شارق گھر سے نکلا تو سات بج رہے تھے۔ نہر کے پل کے قریب ہی اسے زکشہ مل گیا۔ ثمینہ نے بتایا تھا کہ وہ عام طور پر کالج جانے کے لئے ساڑھے سات بجے گھر سے نکلتی ہے اور شارق کا خیال تھا کہ وہ ساڑھے سات بجے سے پہلے اس کے گھر پہنچ جائے گا۔ وہ ثمینہ کا خیال ذہن سے نکال نہیں سکا تھا اور رات ہی کو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مہمان کی حیثیت سے اس کے گھر جائے گا۔

جب وہ جناح کالونی میں ثمینہ کے مکان کے سامنے رکشے سے اترا تو سات بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ لیکن گیٹ پر تالا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ ثمینہ شاید وقت سے پہلے ہی کالج چلی گئی تھی۔ دروازے کے سامنے کھڑا ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ساتھ والے مکان کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی موٹر سائیکل دھکیلتا ہوا باہر نکلا۔ موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑے کرتے ہوئے وہ الجھی ہوئی نگاہوں سے شارق کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ثمینہ کالج کس وقت گئی ہیں اور کالج سے واپس کس وقت آتی ہیں؟" شارق نے اس شخص کے قریب جا کر پوچھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ مسٹر گورایہ تھا۔ جس رات پولیس اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں آئی تھی تو یہ شخص بھی اپنے گھر سے نکل کر ثمینہ کے دروازے پر آیا تھا۔

"آپ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں؟" گورایہ نے اسے گھورا۔

"میں ثمینہ کا کزن ہوں۔ لاہور سے آیا ہوں۔ لاری اڈے سے سیدھا یہاں آ رہا ہوں۔" شارق نے جواب دیا۔ "ثمینہ کالج سے کتنے بجے تک واپس آ جاتی ہے؟"

گورایہ فوری طور پر جواب دینے کے بجائے چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"ثمینہ بی بی کے معاملے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیسی گڑبڑ؟" شارق چونک گیا۔

"دو تین روز پہلے اس علاقے میں پولیس اور منشیات فروشوں میں جھڑپ ہو گئی تھی ایک منشیات فروش مارا گیا تھا اور پولیس کا ایک آدمی زخمی ہوا تھا۔ پولیس ایک آدمی کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آئی تھی۔ وہ آدمی پولیس کی گولی لگنے سے زخمی ہوا تھا۔ خون کے نشانات یہاں تک دیکھے گئے تھے۔ پولیس کو شبہ تھا کہ مفرور نے اس گھر میں پناہ نہ لی ہو۔ پولیس یہاں پہنچی تو

آوازیں سن کر میں بھی باہر آ گیا تھا۔ ثمینہ بی بی کو سوتے میں سے جگایا گیا تھا پولیس مطمئن ہو کر چلی گئی تھی کہ مفرور یہاں نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی پولیس یہاں آئی تھی اور پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ آج صبح چھ بجے دو پولیس والے پھر یہاں آ گئے اور ثمینہ بی بی کو تھانے لے گئے۔ میں تھانے ہی جا رہا ہوں۔ آپ بھی...."

"چلئے.... میں بھی چلتا ہوں۔" شارق نے بریف کیس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

گورایہ نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔ شارق اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ دس منٹ بعد وہ پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ تھانے کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے شارق کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

○

"کیا بات ہے کیا چاہتے ہو؟ کیوں آئے ہو تم لوگ یہاں؟" ثمینہ نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئی کہا۔ اس کی نظریں دونوں پولیس والوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان میں سے ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا اور دوسرا کانسٹیبل۔

"بی بی۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ مفرور اسی گھر میں موجود ہے۔ کل رات اسے یہاں دیکھا گیا ہے۔" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں نے کسی ڈاکو یا قاتل کو اپنی گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔" ثمینہ کے لہجے میں قدرے سختی آ گئی تھی۔ وہ اس لئے بھی کچھ دلیر ہو گئی تھی کہ شارق اب یہاں موجود میں تھا۔ "تم لوگ ایک شریف عورت کو کیوں پریشان کر رہے ہو۔ میں تمہارے ایس پی سے بات کروں گی۔"

"کر لینا ایس پی سے بات۔ پہلے ہم سے تو نمٹ لو۔" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ "ہم تمہارے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

"تمہارے پاس تلاشی کا وارنٹ ہے؟" ثمینہ نے اسے گھورا۔

"ایسے معاملوں میں ہم وارنٹوں کے چکر میں نہیں پڑتے۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"کسی پر شبہ ہو تو ہم چھاپہ مار سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔"

ثمینہ پریشان ہو گئی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اگر یہ پولیس والے زبردستی پر آئے تو وہ انہیں روک نہیں سکے گی۔ ظاہر ہے شارق یہاں موجود نہیں تھا۔ اگر پولیس والے تلاشی لے لیں تو ان کی تسلی ہو جائے گی او وہ آئندہ کی پریشانیوں سے بچ جائے گی۔

"اچھا۔ ایک منٹ ٹھہرو۔" اس نے پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے پڑوسیوں میں سے کسی کو بلا لوں۔ ان کی موجودگی میں تلاشی لے لینا۔" ثمینہ نے باہر آ کر گیٹ بند کر دیا اور گورایہ کے مکان کی گھنٹی بجا دی۔ چند منٹ بعد گورایہ خود باہر آیا تھا۔ ثمینہ نے اسے پولیس والوں کے بارے میں بتایا تو وہ اس کے ساتھ آ گیا۔

"کیوں پریشان کر رہے ہو تم لوگ کیا بات ہے۔" گورایہ نے پولیس والوں کو گھورا۔

"مکان کی تلاشی لینی ہے۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں ایک مفرور مجرم چھپا ہوا ہے۔" ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"ثمینہ بہن..... دروازہ کھول دو۔" گورایہ نے کہا پھر پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "چلو۔ لے لو تلاشی۔"

وہ دونوں پولیس والے ثمینہ اور گورایہ کے ساتھ اندر آ گئے اور اس طرح مکان کی تلاشی لینے لگے جیسے انہیں کسی آدمی کی نہیں سوئی کی تلاش ہو۔ کمروں کی تلاشی لینے کے بعد کانسٹیبل جیسے ہی باتھ روم کی طرف بڑھا۔ ثمینہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے یاد تھا کہ شارق نے میلے کپڑے باتھ روم ہی میں چھوڑ دیئے تھے۔ پتلون کا پائنچہ نہ صرف خون آلود تھا بلکہ اس میں گولی لگنے سے سوراخ بھی بن گیا تھا۔ اگر وہ پتلون پولیس کی نظروں میں آ گئی تو اس کا بچنا مشکل ہو جائے گا۔

پولیس والے نے دروازہ کھول دیا اور باتھ روم میں جھانکنے لگا۔ دائیں طرف دیوار پر لگی ہوئی کھونٹی پر ثمینہ کے پرانے کپڑوں کا ایک جوڑا ٹنگا ہوا تھا۔ دروازے کے پیچھے بھی ایک لمبی کھونٹی لگی ہوئی تھی اور شارق نے اس کھونٹی پر کپڑے ٹانگے تھے۔ پولیس والے نے غسل خانے میں جھانکنے کے بعد دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا اور واپس آ گیا۔ شارق کے کپڑے اس کی نظروں میں نہیں آ سکے تھے۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے سر جی۔" کانسٹیبل نے ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کسی نے جھوٹی اطلاع دی ہو گی۔ واپس چلیں۔"

"تسلی ہو گئی تم لوگوں کی؟" ثمینہ نے باری باری ان دونوں کو گھورا۔

ہیڈ کانسٹیبل دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے رک گیا۔ اس کی نظریں دری پر ایک سرخ دھبے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بیٹھ کر اس دھبے کو غور سے دیکھنے لگا۔

"یہ کیا ہے؟ خون....." اس نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے ثمینہ کی طرف دیکھا۔

ثمینہ کو ایک بار پھر سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں اس رات

شارق اندر داخل ہونے کے بعد کافی دیر تک کھڑا اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کی ٹانگ کے زخم سے بہنے والے خون کے چند قطرے اس جگہ دری پر گرے تھے اور اب تین دن بعد وہ جگہ خشک ہو چکی تھی۔ دھبہ اگرچہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دری بھی سرخ رنگ کی تھی۔ وہ دھبہ ہر شخص کی نظروں میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس روز پڑوس کی تین چار عورتیں بھی آئی تھیں۔ وہ بھی دری پر اسی جگہ سے گزری تھیں مگر کسی کی نظر اس دھبے پر نہیں پڑی تھی لیکن یہ پولیس والے' یہ دھبہ فوراً ہی ان کی نظروں میں آ گیا تھا۔

"یہ.....یہ دھبہ....." وہ ہکلائی۔ "دو تین روز پہلے سرخ روشنائی گر گئی تھی۔"

"یہ دھبہ روشنائی کا نہیں بی بی۔" ہیڈ کانسٹیبل نے اسے گھورا۔ "خون اور روشنائی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس رات جو شخص ہمارے ایک سپاہی کو گولی مار کر فرار ہوا تھا وہ خود بھی زخمی تھا۔ خون کے نشانات آپ کے دروازے تک دیکھے گئے۔ اس رات تم نے پوچھنے پر جواب دیا تھا کہ یہاں کوئی نہیں آیا۔ دوسرے دن یہاں سے گولی کی آواز سن کر کسی نے پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس کے پوچھنے پر تم نے بتایا کہ بلب پھٹ گیا تھا اور آج رات کسی نے پولیس کو اطلاع دی کہ یہاں تمہارے علاوہ کسی اور کو بھی نقل و حرکت کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور دری پر خون کا یہ دھبہ؟ ان سب باتوں کا کیا مطلب ہو سکتا ہے بی بی۔" ہیڈ کانسٹیبل چند لمحے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "وہ شخص اب اگرچہ یہاں نہیں ہے لیکن خون کا یہ دھبہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ یہاں تھا۔ دیکھو بی بی.....اگر تم پولیس سے تعاون کرو تو یہ بڑی اچھی بات ہو گی۔ ہو سکتا ہے اس نے اسلحہ کے زور پر تمہیں یرغمال بنا رکھا ہو اور تم نے جان کے خوف سے اس وقت پولیس کو کچھ نہ بتایا ہو۔ لیکن اب وہ یہاں نہیں ہے۔ تمہیں اس سے کوئی خوف نہیں ہونا چاہئے۔ اگر حلیہ بتا دو تو ہمیں اس کی تلاش میں مدد مل سکتی ہے۔ بصورت دیگر....."

"یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔" ثمینہ نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہاں مجھ سے سرخ روشنائی گر گئی تھی جسے تم خون کا دھبہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم لوگ بلاوجہ مجھے پریشان کر رہے ہو۔ میں اعلیٰ افسران سے تمہاری شکایت کروں گی۔"

"ٹھیک ہے بی بی۔" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ "تمہیں ہمارے ساتھ تھانے چل کر اپنا تحریری بیان دینا ہو گا۔"

"تت..... تھانے....." ثمینہ کانپ کر رہ گئی۔

"جی ہاں۔" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ "جو کچھ ہمیں بتا رہی ہو وہی سب کچھ ایس ایچ او کے

سامنے تحریری بیان میں کہہ دینا۔"

ثمینہ نے بے بسی سے گورایہ کی طرف دیکھا۔

"حوالدار۔" گورایہ حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم لوگ بلاوجہ بات بڑھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہ ایک شریف خاتون ہیں۔ کالج میں لیکچرار ہیں۔ ان کا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ تم لوگوں کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ مک مکا کرو اس قصے کا۔ تم جانتے ہو کسی عورت کا تھانے جانا کس قدر رسوائی کا باعث ہو سکتا ہے۔"

"دیکھئے جی بات کوئی معمولی نہیں ہے۔" حوالدار نے کہا۔ "وہ ایک خطرناک ملزم ہے جو ایک پولیس والے کو گولی مار کر فرار ہوا ہے۔ تمام شہادتیں بتاتی ہیں کہ اس نے یہاں پناہ لی تھی۔ اب ہم تو بات اس طرح ختم نہیں کر سکتے۔ مک مکا بھی کرنا ہو گا تو ایس ایچ او صاحب ہی کریں گے۔ اس بی بی کو ہمارے ساتھ جانا ہی پڑے گا۔"

ثمینہ عجیب صورت حال سے دوچار تھی۔ ایک مرتبہ تو اس کے دل میں آئی کہ شارق کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ لیکن پھر اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ انہیں شارق کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ پولیس اسٹیشن جانے سے اسے اچھی خاصی رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن شارق کو بچانے کے لئے اس نے یہ رسوائی بھی قبول کرنا گوارا کر لیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں پولیس اسٹیشن چلنے کو تیار ہوں۔" بالآخر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تم لوگوں کے ساتھ نہیں۔"

"ہم گلی کے موڑ پر انتظار کرتے ہیں۔ اگر تم نے کہیں ادھر ادھر ہونے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہو گا۔" ہیڈ کانسٹیبل نے کہتے ہوئے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔

وہ دونوں باہر چلے گئے۔

"ثمینہ بی بی یہ سب کیا ہے؟" گورایہ نے کہا۔

"کچھ نہیں بھائی صاحب۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "آپ خود بھی جانتے ہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ ایک عورت کو اکیلا سمجھ کر پریشان کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم چلو۔ میں بھی تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔ تم اکیلی نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس معاملے میں مجھ سے جو ہو سکے گا کروں گا۔ پریشان مت ہونا۔ تم چلو۔ میں بھی آتا ہوں۔" گورایہ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

ثمینہ نے چادر اوڑھی' اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور باہر نکل آئی۔ گلی میں ابھی زیادہ لوگوں کی آمد و

رفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ ثمینہ نے مکان کو تالا لگایا اور ایک طرف چلنے لگی۔ اس نے چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ اس کا چہرہ تقریباً چھپ کر رہ گیا تھا۔ دونوں پولیس والے گلی کے موڑ پر کھڑے تھے۔ ثمینہ وہاں پہنچی تو وہ اس کے ساتھ ہو لئے۔ دوسری گلی کا موڑ گھومتے ہی انہیں ایک خالی تانگہ مل گیا۔ حوالدار نے تانگہ رکوا لیا۔ وہ دونوں آگے بیٹھ گئے اور ثمینہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

تھانے پہنچ کر ثمینہ کو احساس ہوا کہ اس نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ پولیس والوں کو وہ گھر پر ہی بتا دیتی کہ مفرور ملزم نے اسے گن پوائنٹ پر یرغمال بنا رکھا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اسے جان سے مار دے گا۔ لیکن اس نے شارق کو بچانے کے لئے پولیس اسٹیشن آنا قبول کر لیا تھا۔ لیکن یہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ وہ بہت بڑی غلطی کر چکی ہے۔

پولیس کے بارے میں اس کے نظریات بالکل غلط ثابت ہوئے تھے۔ وہ پولیس کو شہریوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کا محافظ سمجھتی تھی۔ لیکن اب پتہ چلا تھا کہ شہر کے چھٹے ہوئے سارے بدمعاش پولیس میں بھرتی ہو گئے تھے۔ ایس ایچ او ابھی گھر سے نہیں آیا تھا۔ ثمینہ کو ایک بنچ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ جو بھی پولیس والا آتا ہوس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کوئی نہ کوئی شرمناک جملہ بھی کس دیتا۔

"کس کے ساتھ پکڑی گئی ہے یہ؟"

"کب سے یہ دھندہ کر رہی ہو؟"

"اب آئی ہو نا قابو میں۔ پتہ چل جائے گا تمہیں۔"

"اسے کمرے میں لے جا کر دروازے پر سپاہیوں کی لائن لگا دو نا۔"

ثمینہ ایک ایک جملے پر کٹی جا رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے لیکن وہ پولیس کے جال میں پھنس چکی تھی اور یہ ایسا جال تھا جس سے نکلنا آسان نہیں تھا۔

سات بجے کے لگ بھگ ایس ایچ او آ گیا۔ وہ لمبا تڑنگا بھاری بھرکم آدمی تھا۔ چہرے پر پھٹکار برس رہی تھی۔ حوالدار ایس ایچ او کے کمرے میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ثمینہ کو بھی بنچ سے اٹھا کر اندر لے گیا۔

"بیٹھ جاؤ بی بی۔" ایس ایچ او نے میز کے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ کالج کی معلمہ ہیں۔ آپ کو تو قانون سے تعاون کرنا چاہئے۔ جو بھی بات ہے آپ ٹھیک ٹھیک بتا دیں۔ ہم آپ کے شکرگزار ہوں گے۔ اگر آپ غلط بیانی سے کام لیں گی تو آپ کے لئے مشکلات پیدا ہوں گی۔"

"بات یہ ہے جی۔" ثمینہ نے کہا۔ "اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے کسی کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ مجھے قتل کر دے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں عورت ذات ہوں۔ اکیلی رہتی ہوں۔ اس لئے میں نے اپنی زبان بند رکھی تھی۔"

"اوہ۔" ایس ایچ او سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "کون تھا وہ..... کیا آپ اسے جانتی ہیں؟" میرا مطلب ہے پہلے کبھی دیکھا تھا؟"

"جی نہیں۔ میں اسے نہیں جانتی۔ نہ پہلے کبھی دیکھا تھا۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ "اس رات میں اگلے دن کے لیکچر کے لئے اسٹڈی کر رہی تھی کہ وہ مکان میں گھس آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے کسی کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ مجھے گولی مار دے گا۔ میں نے جان کے خوف سے اپنی زبان بند رکھی تھی۔"

"آپ کسی اور ذریعے سے بھی پولیس یا کسی اور کو اس کی موجودگی کے بارے میں مطلع کر سکتی تھیں۔" ایس ایچ او نے کہا۔

"میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ پستول لئے میرے سر پر کھڑا رہتا تھا۔" ثمینہ نے بتایا۔

"وہ کب تک آپ کے مکان میں رہا؟" ایس ایچ او نے پوچھا۔

"وہ صبح سویرے ہی چلا گیا تھا۔" ثمینہ نے بتایا۔ "اس نے جاتے ہوئے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے پولیس کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"اس کا حلیہ بتا سکتی ہیں؟"

"حلیہ!" ثمینہ چند لمحے خاموش رہی پھر کہنے لگی۔ "وہ درمیانے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی تھا۔ عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ کشادہ پیشانی' آنکھیں چھوٹی' ناک لمبی اور پیشانی پر دائیں طرف چاند تارہ گدا ہوا تھا۔"

ٹھیک اسی لمحہ ایک کانسٹیبل کمرے میں داخل ہوا اور بتایا کہ اس بی بی کے حوالے سے دو آدمی آئے ہیں۔ تھانیدار نے انہیں اندر بھیج دینے کو کہا۔ کچھ ہی دیر بعد جو دو آدمی اندر داخل ہوئے انہیں دیکھ کر ثمینہ چونکے بغیر نہ رہی۔ ایک تو اس کا پڑوسی گورایہ تھا اور دوسرا شارق۔ وہ دونوں تھانیدار سے ہاتھ ملا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"کہئے کیسے زحمت کی آپ حضرات نے۔" تھانیدار نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

"میرا نام منظور گورایہ ہے۔ میں ان کا پڑوسی ہوں اور کینال آفس میں سب ڈویژنل آفیسر ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جو کچھ بھی ہوا کسی غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے۔"

"اور آپ؟" ایس ایچ او نے سوالیہ نگاہوں سے شارق کی طرف دیکھا۔

"میرا نام شارق علی ہے۔ ان کا کزن ہوں۔ تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے ہی لاہور سے آیا ہوں۔ جب ان کے گھر پہنچا تو گورایہ صاحب سے پتہ چلا کہ ثمینہ کے بارے میں پولیس کو کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔" شارق نے بتایا۔

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟" ایس ایچ او نے پوچھا۔

"لاہور میں میرا صابن کا کاروبار ہے۔ فیصل آباد سے مال لے جاتا ہوں۔ آج بھی کاروباری سلسلے میں آیا تھا۔ ماموں نے کہا تھا کہ ثمینہ کی خیر خیریت بھی معلوم کرتا آؤں۔ پروگرام یہ تھا کہ گھر پر ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد مارکیٹ چلا جاؤں گا۔ لیکن یہاں آتے ہی اس گڑبڑ کا پتہ چلا۔" شارق نے کہا۔

ثمینہ کا چہرے کا زیادہ حصہ اب بھی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے شارق کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے شارق کی دیدہ دلیری پر حیرت بھی ہوئی تھی اور خوشی بھی کہ وہ اپنی جان خطرہ میں ڈال کر یہاں آ گیا تھا۔

"بات یہ ہے جناب۔" ایس ایچ او نے کہا۔ "معاملہ بے حد سنگین ہے۔ آپ جانتے ہیں کسی فرور مجرم کو پناہ دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

"وہ میرا کوئی رشتہ دار نہیں تھا جسے بچانے کے لئے میں نے پناہ دی تھی۔" ثمینہ' شارق یا گورایہ سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ اس نے مجھے گن پوائنٹ پر یرغمال بنا لیا تھا۔ میں اپنی جان کے خوف سے خاموش رہی تھی۔"

گورایہ اور شارق دونوں ہی چونک گئے۔ گورایہ اس لئے چونکا تھا کہ ثمینہ اب تک انکار کرتی رہی تھی لیکن یہاں آ کر شاید اس نے اعتراف کر لیا تھا۔

"تھانیدار صاحب!" گورایہ نے کہا۔ "ڈی ایس پی چودھری اکبر میرے کلاس فیلو رہ چکے ہیں' ان کے یہاں آنے سے پہلے میں نے فون پر ان سے بات کی تھی۔ شاید انہوں نے آپ کو فون کیا ہو۔"

"نہیں' مجھے کسی کا فون نہیں آیا۔" تھانیدار نے کہا۔

ٹھیک اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ایس ایچ او نے ریسیور اٹھا لیا۔ چند منٹ تک یس سر یس سر کہہ کر باتیں کرتا رہا پھر ریسیور رکھ کر گورایہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ڈی ایس پی صاحب کا فون تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ معاملہ سنگین نہ ہو تو....."

"مک مکا کریں جی۔" شارق بیچ میں بول پڑا۔ "آپ کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے اور پھر یہ ایسا سنگین معاملہ بھی نہیں ہے' ایک عورت نے اگر اپنی جان کے خوف سے زبان بند رکھی تو کا یہ مطلب تو نہیں ہے نا کہ وہ بھی اس جرم میں شریک ہے۔" شارق نے بریف کیس گود

میں رکھ کر کھول لیا اور کپڑوں کے نیچے سے پانچ ہزار روپے کے نوٹ نکال کر مٹھی میں دبا لئے اور بریف کیس بند کر کے اپنا ہاتھ میز کے نیچے سے تھانیدار کی طرف بڑھا دیا جب اس کا ہاتھ واپس آیا تو اس کی مٹھی خالی تھی۔

"ٹھیک ہے جناب۔" تھانیدار نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ڈی ایس پی صاحب اور قائد اعظم کی سفارش تو میں رد نہیں کر سکتا اور بی بی۔" وہ ثمینہ کی طرف دیکھنے لگا۔ "اور بی بی۔ آئندہ آپ محتاط رہا کریں۔ دروازہ کھولنے سے پہلے تسلی کر لیا کریں کہ باہر کون ہے۔ ورنہ کسی دن کسی مصیبت میں پھنس جائیں گی۔ ٹھیک ہے۔ اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔"

"شکریہ جی۔" ثمینہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

شارق اور گورایہ بھی اٹھ گئے۔ ان دونوں نے تھانیدار سے ہاتھ ملایا اور پھر وہ تینوں تھانے سے باہر آ گئے۔

"بہت شکریہ گورایہ صاحب۔" شارق نے باہر آ کر کہا۔ "آپ نے حق ہمسائیگی ادا کر دیا۔ اگر آپ مدد نہ کرتے تو شاید واقعی کوئی بڑی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ آپ موٹر سائیکل پر چلئے ہم تانگے پر آ جاتے ہیں۔"

گورایہ موٹر سائیکل پر چلا گیا اور وہ دونوں ایک تانگے پر سوار ہو گئے راستے میں خاموشی رہی۔ ان دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن گھر پہنچتے ہی ثمینہ پھٹ پڑی۔

"دیکھا..... دیکھ لیا تم نے۔ یہ سب ذلت و رسوائی مجھے تمہاری وجہ سے اٹھانا پڑی ہے۔ اگر میرے کالج میں اس بات کا پتہ چل جائے تو مجھے کھڑے کھڑے برطرف کر دیا جائے۔ میرے گھر والوں کو اطلاع ہو جائے تو مجھے زندہ زمین میں گاڑھ دیں۔ اگر گورایہ صاحب مدد نہ کرتے تو مجھے سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جاتا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ میں یہ سب کچھ ہونے دیتا۔" شارق نے کہا۔

"تم کیا کر لیتے؟" ثمینہ نے اسے گھورا۔ "تم تو خود پولیس کو مطلوب ہو۔"

"اس کے باوجود میں تھانے پہنچ گیا تھا۔ اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ پولیس مجھے ہی سلاخوں کے پیچھے بند کر دے گی۔ لیکن میں تمہیں ان پولیس والوں کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم نے پولیس کو میرے بارے میں کیوں نہیں بتا دیا۔ مجھے اسی وقت پولیس کے حوالے کیوں نہیں کر دیا؟" شارق بولا۔

"یہی تو میں نہیں کر سکی۔" ثمینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اور شاید آئندہ بھی ایسا نہ کر سکوں۔"

"کیوں؟" شارق نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"اس کیوں کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔ ویسے وہ شارق کی شرافت کی پہلے سے زیادہ قائل ہو گئی تھی جو اسے بچانے کے لئے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر تھانے پہنچ گیا تھا۔ اگر پولیس کو اس پر شبہ ہو جاتا تو وہ یقیناً پکڑا جاتا۔ "لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں....."

"کل کی رات میں نے بڑی اذیت میں گزاری ہے۔" شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں رات بھر سوچتا رہا کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس لئے صبح ہوتے ہی یہاں آ گیا تھا کہ تم سے معافی مانگ سکوں۔ لیکن یہاں کی صورت حال ہی بدلی ہوئی تھی۔ اتفاق سے گورایہ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہیں میں نے بتایا کہ تمہارا کزن ہوں اور ابھی ابھی لاہور سے آیا ہوں۔ مجھے صورت حال کا پتہ چلا تو میں ان کے ساتھ ہی تھانے پہنچ گیا۔"

"اگر تم پکڑے جاتے تو؟" ثمینہ نے کہا۔

"تمہیں بچانے کے لئے میں پکڑا جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔" شارق نے جواب دیا۔

ثمینہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ ثمینہ باہر آ گئی۔ وہ گورایہ صاحب کی بیوی تھی جو دودھ کی پتیلی لئے کھڑی تھی۔

"تمہارے بعد دودھ والا آیا تھا۔ میں نے دودھ لے لیا۔" مسز گورایہ نے کہا۔

"آیئے۔ اندر آ جایئے۔" ثمینہ نے اس سے پتیلی لیتے ہوئے کہا۔ وہ اندر آ گئی۔ "یہ میرے کزن ہیں۔ آج ہی لاہور سے آئے ہیں۔"

"گورایہ صاحب نے مجھے بتایا تھا۔" مسز گورایہ نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دیر وہاں بیٹھی اور پھر واپس چلی گئی۔

"میں نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا۔ صبح ہی صبح ان منحوسوں کی شکل دیکھنی پڑی۔ ویسے تھانہ بڑی جگہ ہے۔ لگتا ہے تہذیب و شرافت تو ان پولیس والوں کو چھو کر نہیں گزری' ایسی ایسی حرکتیں کر رہے تھے کہ سر شرم سے جھکا جا رہا تھا۔" ثمینہ نے کہا۔

"اب تمہیں یہ احساس بھی ہو گیا ہو گا کہ کسی شریف آدمی کو جرائم کی دلدل میں دھکیلنے میں ہاتھ پولیس ہی کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ ایک شریف آدمی ان کا کار بن کر جرائم پیشہ زندگی' اپنانے پر مجبور ہو جاتا ہے' میں ایک زندہ مثال کی صورت میں تمہارے سامنے ہوں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" ثمینہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "جنہیں ہم اتنا محافظ سمجھتے

ہیں وہی معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور خرابیوں کی اصل جڑ ہیں۔"

"اس موضوع پر بعد میں باتیں ہوں گی۔ تم ناشتہ بناؤ۔ میں صرف چائے پیوں گا۔" شارق نے کہا۔

ثمینہ باورچی خانے میں جا کر ناشتے کی تیاری کرنے لگی اور شارق دروازے میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

ثمینہ اس روز بھی کالج نہیں گئی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ سبزی گوشت وغیرہ لینے کے لئے چلی گئی۔ شارق وہ ناول لے کر بیٹھ گیا جسے وہ ادھورا چھوڑ گیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ثمینہ واپس آئی تو اخبار بھی لے آئی تھی۔ فیصل آباد سے کوئی ڈھنگ کا اخبار شائع نہیں ہوتا تھا۔ دو تین جو اخبار شائع ہوتے بھی تھے تو ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ تمام بڑے اخبارات لاہور ہی سے آتے تھے اور ثمینہ جو اخبار لے کر آئی تھی وہ بھی لاہور ہی کا تھا۔

شارق نے ناول رکھ دیا اور ثمینہ سے اخبار لے کر دیکھنے لگا۔ آخری صفحہ پر دو کالمی سرخی دیکھتے ہی اچھل پڑا۔

"ڈی ایس پی کے قاتل کا سراغ مل گیا۔"

شارق وہ خبر پڑھنے لگا۔ یہ خبر پولیس کے ایک ترجمان کے حوالے سے شائع ہوئی تھی، جس میں بتایا گیا تھا کہ لاہور کے ایک ڈی ایس پی کو ذاتی دشمنی کی بنا پر پہلے اغوا کیا گیا اور کئی روز بعد اسے مردہ سمجھ کر سڑک پر پھینک دیا گیا۔ لیکن ڈی ایس پی زندہ تھا جسے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ اسی رات ملزم نے ڈاکٹر کا بھیس بدل کر بے ہوش ڈی ایس پی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پولیس ترجمان نے یہ بھی بتایا تھا کہ ملزم ہسپتال سے فرار ہونے کے بعد کافی ہاؤس کے سامنے ایک رکشہ پر بیٹھ کر چوبرجی گیا تھا۔ رکشہ ڈرائیور کے بتائے ہوئے حلئے کے مطابق پولیس نے ایک ایسے شخص کا پتہ چلا لیا ہے جس کا تعلق منشیات فروشوں کے ایک گروہ سے ہے۔ پولیس اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کر رہی ہے۔ توقع ہے کہ ملزم کو ایک آدھ دن میں گرفتار کر لیا جائے گا۔"

شارق یہ خبر پڑھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ پولیس کی تفتیش اس حد تک درست تھی کہ وہ ہسپتال سے فرار ہونے کے بعد کافی ہاؤس کے سامنے سے ایک رکشے پر بیٹھ کر چوبرجی گیا تھا۔ رکشے والے نے جو حلیہ بتایا تھا وہ کسی حد تک مختلف تھا۔ لیکن پولیس کو یقین ہو گیا تھا کہ قاتل چوبرجی کے آس پاس ہی کا رہنے والا تھا اور ہو سکتا ہے پولیس اس حلئے کے مطابق اس علاقے میں اسے تلاش کر رہی ہو۔ لیکن شارق مطمئن تھا کہ اس علاقے میں کوئی شخص اسے نہیں جانتا تھا کیونکہ عام طور پر رات ہی کو اس مکان میں آیا جایا کرتا تھا اور وہاں رہنے والے بہت کم لوگوں سے ا

آمنا سامنا ہوتا تھا۔ اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ رکشہ ڈرائیور کے بتائے ہوئے حلئے کے مطابق والے اسے شناخت نہیں کر سکتے تھے۔

پولیس کی یہ تحقیق بھی درست تھی کہ ڈی ایس پی کے قاتل کا تعلق منشیات فروشوں کے گروہ سے تھا۔ پولیس تفتیش یقیناً اسی رخ پر کر رہی تھی۔ ایسے منشیات فروشوں کے بارے تحقیقات کی جا رہی ہوں گی جنہیں ماضی میں اس ڈی ایس پی کے ہاتھوں کوئی نقصان پہنچا ہو شارق کے لئے یہ بات بہرحال باعث تشویش ضرور تھی کہ اگر پولیس چھانگا تک پہنچ گئی تو گڑ بڑ ہو سکتا تھا۔ لیکن چھانگا کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اس کے بارے میں زبان کھولے گا۔

اس روز شام کو شارق پیپلز کالونی پہنچ گیا۔ رحمانیہ مسجد کے قریب اسے سلمان ایڈووکیٹ کے کا مکان تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ تقریباً دو گھنٹے مکان کی نگرانی کرتا آٹھ بجے کے قریب ایک آدمی کو مکان سے نکلتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی ہٹ آ گئی۔ وہ سلمان ایڈووکیٹ تھا۔ اس نے حلیہ بدلنے کے لئے اگرچہ داڑھی رکھ لی تھی شارق کو اسے شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

سلمان ایڈووکیٹ گھر سے نکل کر مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا ڈی گراؤنڈ کی طرف آ گیا۔ یہ ں حرف ڈی کی طرح ایک وسیع و عریض پارک تھا۔ اس کے ایک طرف خط مستقیم کی طرح یدھی سڑک تھی جو زیادہ تر ویران رہتی تھی۔ نصف دائرے کی شکل کی دوسری سڑک کے ھ رہائشی اور کمرشل عمارتیں تھیں۔ ان عمارتوں میں سڑک کے رخ پر دکانوں کی وجہ سے رونق شاپنگ سینٹر بن گیا تھا۔ شام سے لے کر رات دس گیارہ بجے تک یہاں اچھی خاصی رہتی تھی۔ یہاں دو تین اچھے ریسٹورنٹ بھی تھے۔ ریسٹورنٹ والوں نے اپنے سامنے ت لان بنا رکھے تھے یہاں شام ہوتے ہی میزیں اور کرسیاں ڈال دی جاتیں۔

سلمان ایڈووکیٹ بھی ایک ایسے ہی ریسٹورنٹ کے سامنے لان میں آ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا ے کسی کی تلاش ہو۔ پھر وہ ایک میز کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک اور یاں آ گیا۔ ان دونوں نے ہاتھ ملایا اور وہ آدمی بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی بھی سلمان کی نالیس اور پچاس کے درمیان رہا ہو گا۔ سلمان نے ویٹر کو بلا کر چائے کے لئے کہا۔

رق کچھ دیر تک لان کے باہر کھڑا رہا پھر وہ بھی آگے آ کر ان کے قریب ہی ایک میز کے کرسی پر بیٹھ گیا اور ویٹر کو اشارے سے چائے کے لئے کہہ دیا۔

ئے کے دوران سلمان ایڈووکیٹ اور دوسرا آدمی باتیں کرتے رہے۔ شارق کو سمجھنے میں دیر

نہیں لگی کہ سلمان روزانہ شام کے بعد یہاں آکر بیٹھا کرتا تھا اور اس آدمی سے غالباً یہیں پر اس کی دوستی ہوئی تھی وہ توجہ سے ان کی باتیں سننے لگا۔

"جھگڑا تو سارا جائیداد کا ہے۔" وہ آدمی کہہ رہا تھا۔ "لڑکی کی چونکہ شادی ہو چکی ہے اور اس کے بھائی اسے جائداد میں سے حصہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" سلمان نے کہا۔ "لڑکی شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ وہ اپنے باپ کی وراثت میں حقدار ہے' ہاں اگر وہ بھائیوں کے حق میں اپنے حصے سے دست بردار ہو جائے تو الگ بات ہے۔ بصورت دیگر وہ قانونی طور پر بھی اپنا حصہ وصول کر سکتی ہے۔ شرعی اور ملکی قانون نے ہر معاملے میں عورت کو پورا تحفظ دیا ہے۔"

"کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ کل میں اس کے شوہر کو تمہارے پاس بھیج دوں۔ تم اس سے بات کر لینا۔" دوسرے آدمی نے کہا۔

"تم کل اسے اپنے ساتھ ہی لے آنا۔" سلمان بولا۔

"کل میں دفتر کے کام سے لاہور جا رہا ہوں۔ میری واپسی پرسوں شام تک ہو گی۔ کل اسی وقت لڑکی کا شوہر یہاں آ جائے گا۔ وہ تمہیں جانتا ہے۔ مناسب سمجھو تو اس کے ساتھ چلے جانا۔ اس کا گھر دربار غوثیہ کے قریب ہے۔ لڑکی سے بھی بات کر لینا۔ تفصیل سے سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل اس کا انتظار کروں گا۔" سلمان نے کہا اور پھر وہ دوسرے موضوعات پر باتیں کرنے لگے۔

شارق اٹھ گیا۔ اب اسے وہاں بیٹھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی باتیں سننے کے بعد شارق نے منصوبہ بنا لیا تھا اور اس منصوبے پر عمل درآمد کے لئے اسے چوبیس گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ سلمان ایڈووکیٹ نے شارق کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کی پشت کی طرف بیٹھا ہوا تھا اور اگر وہ اسے دیکھ بھی لیتا تو داڑھی کی وجہ سے اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ داڑھی سے شارق کی صورت بڑی حد تک تبدیل ہو گئی تھی۔ اور پھر سلمان تو شاید یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں شارق سے اس کا آمنا سامنا ہو جائے گا۔

شارق جب ثمینہ کے گھر واپس پہنچا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ ثمینہ نے اس کے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ شارق ایک جرائم پیشہ آدمی ہے۔ اس کی وجہ سے اسے ذلت و رسوائی بھی اٹھانا پڑی تھی۔ وہ شارق کی طرف جھکتی چلی جا رہی تھی۔ دل کے معاملات شاید ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جذبات غالب آ جاتے ہیں' ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔ سوچنے

سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور انسان دل کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد وہ دیر تک باتیں کرتے رہے اور بالآخر شارق اصل مطلب پر آ گیا۔ وہ ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میری بربادی کی اصل وجہ ایک وکیل ہے۔ اس نے میرے ماں باپ کو قتل کروا دیا تھا۔ پولیس سے ساز باز کر کے مجھے ایک لمبے عرصے کے لئے جیل بھجوا دیا تھا۔ بعد میں اس نے میرے مکان کو جلا کر راکھ کر ڈالا تھا اور مجھے ہی آتشزنی کے الزام میں گرفتار کروانے کی کوشش کی تھی۔"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے۔" ثمینہ نے سر ہلایا۔

"میری رہائی کے بعد اپنے ان مذموم مقاصد میں ناکام ہو کر مجھے دیکھ لینے کے بعد وہ وکیل جان کے خوف سے روپوش ہو گیا تھا۔ تھوڑا ہی عرصہ پہلے مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ فیصل آباد میں ہے۔ آج میں نے اسے تلاش کر لیا ہے۔" شارق نے بتایا۔

"کیا مطلب؟" ثمینہ نے اسے گھورا۔ "کیا تم نے....."

"ہاں ثمینہ۔" شارق نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں نے عہد کر رکھا ہے کہ جب تک ماں باپ کے قاتلوں اور اپنا گھر برباد کرنے والوں سے انتقام نہیں لوں گا اس وقت تک مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"شارق۔" ثمینہ نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ "کیا تم ان خیالات کو ذہن سے نہیں نکال سکتے۔ ابھی تو ساری زندگی تمہارے سامنے پڑی ہے۔ کیا تم زندگی بھر یونہی بھٹکتے رہو گے۔ کیا نہیں ہو سکتا کہ تم یہ سب کچھ بھول جاؤ اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرو..... صاف ستھری زندگی جس میں خلوص ہو اور چاہتیں ہوں۔"

"میں چاہوں بھی تو اپنا راستہ نہیں بدل سکتا ثمینہ۔" شارق نے جواب دیا۔ "میں جہاں بھی جاؤں یہ برائیاں میرا پیچھا کرتی رہیں گی اور پھر میں وہ رات کیسے بھول سکتا ہوں جب میرے ماں باپ میری نظروں کے سامنے خنجروں سے وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میں ایک لمحہ کے لئے اس خوفناک طوفانی رات کو نہیں بھولا ہوں۔ میں جب تک ان لوگوں کو جہنم میں نہیں پہنچا لیتا میرے انتقام کی آگ نہیں بجھے گی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم جان بوجھ کر اس دلدل میں آگے بڑھتے جاؤ گے۔" ثمینہ بولی۔

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔" شارق نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "اس وکیل کے معاملے میں تمہیں میری کچھ مدد کرنی پڑے گی۔"

"کیا مطلب؟" ثمینہ چونک گئی۔ "کیا تم مجھے بھی اس آگ میں گھسیٹنا چاہتے ہو؟"

"تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔" شارق نے کہا اور پھر ثمینہ کو سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہو گا۔

"کیا تم اسے یہاں لے کر آؤ گے؟" ثمینہ نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا ہلکا سا تاثر ابھر آیا تھا۔

"نہیں۔" شارق نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کے لئے میں کوئی اور جگہ تلاش کر لوں گا۔"

وہ دیر تک اس موضوع پر بحث کرتے رہے۔ ثمینہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی لیکن شارق کسی طرح بھی جھکنے کو تیار نہیں تھا۔

ثمینہ صبح ساڑھے سات بجے کالج چلی گئی۔ اس نے گھر کی ایک چابی شارق کو دے دی تھی تا کہ بعد میں اسے کہیں آنا جانا ہو تو پریشانی نہ ہو۔

شارق نو بجے گھر سے نکلا۔ گلیوں میں ہوتا ہوا دھوبی گھاٹ پہنچ گیا۔ نشیب میں واقع اس میدان میں دھوبی گھاٹ ہوا کرتا تھا لیکن اب یہاں کھیل کا میدان بنا دیا گیا تھا۔ پورے میدان میں سبز مخملی گھاس بچھی ہوئی تھی۔ وہ دوسری طرف سیڑھیاں چڑھ کر سڑک پر آ گیا۔ سڑک کی دوسری طرف ریز ہوٹل تھا۔ وہ ہوٹل کے سامنے ایک رکشے پر بیٹھ کر پیپلز کالونی کی طرف روانہ ہو گیا۔

پیپلز کالونی میں ڈی گراؤنڈ سے ہوتے ہوئے غوثیہ دربار کے قریب رکشہ سے اتر کر وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پیدل چلنے لگا۔ اس طرف ذرا آگے ایک ٹیکسٹائل مل کی اونچی دیوار کا عقبی حصہ تھا۔ کچھ زمین ویران پڑی تھی اور کچھ پلاٹوں پر مکان زیر تعمیر تھے لیکن کسی جگہ کام نہیں ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کسی وجہ سے ان مکانوں کی تعمیر ادھوری چھوڑ دی گئی تھی۔

شارق گھوم پھر کر ان ادھورے مکانوں کو دیکھتا رہا' مل کی دیوار کے قریب اندر کی طرف سے ایک مکان پسند آ گیا۔ اس مکان کے تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے چوکھٹ بھی لگائے گئے ہوں گے مگر لوگ انہیں اکھاڑ کر لے جا چکے تھے۔

شارق نے ان راستوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور واپس ڈی گراؤنڈ کی طرف چلنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے ایک رکشہ مل گیا۔ وہ گھر جانے کے بجائے کچہری بازار کے موڑ پر اتر گیا اور گھنٹہ گھر کی طرف چلنے لگا۔

گھنٹہ گھر کے چوک پر ایک بک اسٹال کے سامنے وہ رک گیا۔ اخبارات سامنے ٹنگے ہوئے تھے۔ اس نے ایک اخبار خرید لیا اور جیسے ہی اخبار کو سیدھا کیا پہلے صفحہ پر قدرے نیچے ایک تصویر دیکھ کر چونک گیا۔ یہ چہرہ اسے کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ تصویر کے ساتھ ہی ایک دو کالمی سرخی

تھی۔

"لاہور کے ڈی ایس پی کے قاتل کو گرفتار کر لیا گیا۔"

شارق وہیں کھڑے کھڑے وہ خبر پڑھنے لگا' اس کے خیال میں بڑی دلچسپ خبر تھی۔ اشفاق نامی جس شخص کو گرفتار کیا گیا تھا اس کا تعلق ہیرا منڈی میں منشیات فروخت کرنے والے ایک گروہ سے تھا۔ چند سال پہلے ڈی ایس پی نے (جب وہ انسپکٹر تھا) اشفاق نامی اس شخص کو منشیات فروشی اور ایک شخص کو چاقو مار کر شدید زخمی کرنے کے الزام میں گرفتار کیا تھا اور عدالت سے اسے چار سال کے لئے جیل بھجوا دیا تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد اشفاق نامی وہ شخص کچھ عرصہ غائب رہا اور منظر عام پر آنے کے بعد اس نے ایک بار پھر منشیات کا دھندہ شروع کر دیا اس کے ساتھ ہی وہ ڈی ایس پی سے انتقام لینے کے لئے موقع کی تاک میں رہا اور پھر موقع ملتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ڈی ایس پی کو اغواء کیا اور کئی روز تک تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد اسے مردہ سمجھ کر سڑک پر پھینک دیا۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ڈی ایس پی زندہ ہے تو اس نے ڈاکٹر کا بھیس بدل کر ہسپتال میں ڈی ایس پی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

بقیہ واقعات جاننے کے لئے "دولت کے پجاری" کے دوسرے حصے کا مطالعہ کریں۔

ہر قسم کے ناول، ماہانہ ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران سیریز
آئیڈیل پبلشنگ لائبریری
0301-7263206
0334-9639911 نزد گھنٹہ گھر کمالیہ ★ عظیم احمد طارق